پاکستانی اردو ناول میں حب الوطنی کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار:

قیصر آفتاب احمد

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اکتوبر ۲۰۲۰ء

پاکستانی اردو ناول میں حب الوطنی کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

قیصر آفتاب احمد

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اردو زبان وادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اکتوبر ۲۰۲۰ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: پاکستانی اردو ناول میں حب الوطنی کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: قیصر آفتاب احمد رجسٹریشن نمبر: PD-URD-ES14-1D005

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نعیم مظہر _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری) _____

ریکٹر

_____

تاریخ

اقرارنامہ

میں، قیصر آفتاب احمد حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

قیصر آفتاب احمد

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اکتوبر، ۲۰۲۰ء

فہرست ابواب

مقالہ کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	ix
اظہارِ تشکر	x
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔تمہید	۱
i۔موضوع کا تعارف	
بیان مسئلہ	۱
مقاصد تحقیق	۲
تحقیقی سوالات	۲
نظری دائرہ کار	۲
تحقیقی طریقہ کار	۳
مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۳
تحدید	۳
تحقیق کی اہمیت	۴
ب۔حب الوطنی کی مبادیات	۴
قوم	۴
قومیت	۷

	قوم پرستی	۹
	وطن	۱۱
	وطنیت	۱۲
	وطن پرستی	۱۲
	علاقہ	۱۳
	علاقائیت	۱۴
	پاکستانی	۱۴
	پاکستانیت	۱۵
	حب الوطنی	۱۶
	ج۔حب الوطنی اورادب	۲۴
	د۔قیام پاکستان سے قبل اُردو ناول میں حب الوطنی کی روایت	۳۱
	ر۔پاکستانی اُردو ناول میں حب الوطنی (اجمالی جائزہ)	۴۳
	حوالہ جات	۵۷
باب دوم:	پہلا دور (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۰ء) کے ناول میں حب الوطنی کے عناصر	۶۱
	الف۔قیام پاکستان کے بعد کا سیاسی سماجی اورادبی منظرنامہ	۶۱
	ب۔متعین عہد میں پاکستانی اُردو ناولوں میں حب الوطنی کا عمومی جائزہ	۶۷
	ج۔متعین عہد میں پاکستانی اُردو ناولوں میں حب الوطنی کا خصوصی جائزہ	۷۹
	رقص ابلیس (۱۹۵۷)	۷۹
	خدا کی بستی (۱۹۹۷ء)	۸۷
	آنگن (۱۹۶۲ء)	۹۵
	آبلہ پا (۱۹۶۴ء)	۱۰۵
	خونِ مسلم (۱۹۶۹ء)	۱۰۹

	حوالہ جات	۱۱۹
باب سوم:	دوسرا دور (۱۹۷۱ء تا ۲۰۰۰ء) کے منتخب ناول میں حب الوطنی کے عناصر	۱۲۲
	اُلف۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں کا سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامہ	۱۲۲
	ب۔ متعین عہد میں پاکستانی اردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا عمومی جائزہ	۱۲۶
	ج: متعین عہد میں پاکستانی اردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا خصوصی جائزہ	۱۴۳
	تنہا (۱۹۷۸ء)	۱۴۳
	زمین (۱۹۸۰ء)	۱۶۰
	چلتا مسافر (۱۹۸۱ء)	۱۶۵
	پریشر ککر (۱۹۸۳ء)	۱۶۹
	وادی لہورنگ (۱۹۸۴ء)	۱۷۳
	اللہ میگھ دے (۱۹۸۶ء)	۱۷۶
	صدیوں کی زنجیر (۱۹۸۸ء)	۱۸۷
	نادار لوگ (۱۹۹۶ء)	۱۹۱
	حوالہ جات	۲۰۲
باب چہارم	تیسرا دور (۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۵ء) کے منتخب ناول میں حب الوطنی کے عناصر	۲۰۷
	الف اکیسویں صدی کے آغاز کا سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامہ	۲۰۷
	ب۔ تیسرے دور کے پاکستانی اُردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا عمومی جائزہ	۲۱۰
	ج: تیسرے دور کے پاکستانی اُردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا خصوصی جائزہ	۲۱۳
	کاغذی گھاٹ (۲۰۰۲ء)	۲۱۳
	حاصل گھاٹ (۲۰۰۳ء)	۲۲۶
	خس وخاشاک زمانے (۲۰۱۳ء)	۲۳۵
	اے غزالِ شب (۲۰۱۳ء)	۲۳۸

	حوالہ جات	۲۴۶
باب پنجم:	ماحصل	۲۴۹
	الف۔ مجموعی جائزہ	۲۴۹
	ب۔ تحقیقی نتائج	۲۵۳
	ج۔ سفارشات	۲۵۳
	کتابیات	۲۵۴

Abstract

Novel consists of many components ,such as history,culture, civilization and patriotism .The main objective of this reserch is the study of patriotic element in urdu novel . This reserch consists of five chapters.

A)First chapter reveals that what patriotism means.Components of patriotism.

(II) what are the fundamentals of nation and the aspects of nationality.

(III)The history of patriotism in urdu novel before the birth of pakistan.

B)The Second chapter is included the study of Urd Novel from 1947 to 1970.

(II)It presents the history of Pakistan when it came into being and shows all the political , social and literary scenes of the time. In this regard there are two main novels including ``Khak aur Khoon`` and,`` Ali pur ka Ailee could be quoted as refrence. where these elements are promenentely seen.

(III) Raqs e Iblees, Aabla Pa, Khoon e muslim, Khuda ki Basti and Aangan offer visible indicators through wich the elements of creation of Pakistan can be studied.

(C) The third chapter tells us about patriotism in last three decades of the 20th century.

(II)There are various references of patriotism in Pakistani novels such as Jannat ki Talash, Raja Gidh and Jangloos.

(III) Specific study of the element of the partiotism like Chalta Musafir,

Preshar Cooker, Wadi e Lahoo Rang,Sadioon Ki Zanjeer and Nadar Log generaly supports to the main ideas of the novels and the characteristics are found driven by the spirit of patriotism.

(E) The fourth chapter enlights the patriotism in first two decades of 21th Century.In chapter four of Its first part a clear picture of the state has been presented by the political , social and literary activities.

II) whereas its 2nd part shows general analysis about patriotism through the novel ``Sipher sy Aik`` .

III) The 3rd part in this chapter is a special reference of study of Pakistan through Urdu novels such as Hasil Ghat, Khas o Khashak Zamany and Aey Ghazal e Shab. The review and recommendations are also enclosed in this research document.

As a whole this research document not only reveals the kinds of patriotism but also it shows the changes that occurs in the absence of patriotism due to same external changes such as division of common lands and formation of new countries. The famous Urdu novels included in this research are arranged on the basis of their time of publishing, so that revolutionary changes took place can be studied.

اظہارِ تشکر

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں جس ذات نے قلم کے ذریعے ہمیں لکھنا اور پڑھنا سکھایا۔ سب سے پہلے میں اپنے خالق و مالک کا بے حد شکر گزار ہوں جس نے اپنے خاص فضل و کرم سے اس فانی دنیا میں کامیاب و کامران کیا اور اس کے فضل و کرم کا آخرت میں بھی طلب گار ہوں ''اگر تم شکر کرو گے تو میں اپنی نعمتیں زیادہ کروں گا''۔

جب میں نے تحقیقی سفر کا آغاز کیا تو اس دوران میں یہ احساس ہوا کہ خارزارِ تحقیق میں قدم رکھنا تو شاید آسان ہو لیکن اس کو کامیابی سے عبور کرنا گویا

ع اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

بہت سے ایسے مراحل آئے جب پائے استقلال میں لغزش آئی، دل جمعی کو ٹھیس لگی اور منزل تک پہنچنا مشکل لگا لیکن مایوسیوں کے ان تمام لمحات میں نگران مقالہ ڈاکٹر نعیم مظہر اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر روبینہ شہناز نے جس طرح ولولہ تازہ بخشا اس سے اندازہ ہوا کے ایک سچا اور مخلص راہنما زندگی کی تیرہ و تاریک راہوں میں کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ میرا مقالہ ڈاکٹر نعیم مظہر کی پر خلوص راہنمائی کی ایک مکمل داستان ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ نگران مقالہ ڈاکٹر نعیم مظہر میرے لیے محض نگران مقالہ ہی نہیں تھے بل کہ ایک ایسے ماہر نفسیات بھی تھے کہ جن کی گفتگو کسی تحلیلِ نفسی سے کم نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک ایسے Motivational speaker رہے جو خوب سے خوب تر کی تلاش کا حوصلہ بخشتے رہے۔

میں پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان (ڈین آف لینگوئجز) کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہوں گا جن کی راہنمائی سے میرے مقالے کی بہت ساری تحقیقی اور تکنیکی گتھیاں سنوریں جو میری نظر سے اوجھل تھیں۔ اور دعا گو ہوں کہ اللہ ان کی عمر دراز کرے اور ان کے علم میں مزید اضافہ فرمائے۔ آمین!

میرے والدین نے اپنے زخمی ہاتھوں سے مجھے بہت اونچا تعمیر کیا۔ مشکلات کا منہ زور اور بے قابو سیلابِ بلا جب جب بھی میری جانب بڑھا میرے والدین کی دعاوں کے طفیل میرے اللہ نے مجھے محفوظ رکھا۔ مقالے کی تکمیل کے ہر لمحے میں ان کی دعائیں میرے راستے آسان کرتی رہیں۔

میں ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری اور پروفیسر نذیر احمد بٹ کا بھی بے حد مشکور ہوں جنھوں نے میری

استدعا پر نہ صرف اس تحقیقی کام میں میری رہنمائی فرمائی بل کہ اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس کام کی تکمیل میں میرا ہر ممکن ساتھ دیا اور مقالہ کو تکمیل تک پہنچانے میں ذاتی دلچسپی لیتے رہے اللہ ان کی عمر دراز کرے اور ان کے علم میں اضافہ فرمائے آمین!

اس تحقیق کے سفر پر میرے مددگار اور محسنین کی فہرست طویل ہے۔جن لوگوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں اُن میں اپنے اساتذہ ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر محمود الحسن اور دوستوں پروفیسر باقر وسیم قاضی، ملک نعیم حیدر (پرنسپل)، ڈاکٹر احمد حسین ہادی، ڈاکٹر ارشد اویسی، عبدالجبار خان، ڈاکٹر مشتاق عادل، پروفیسر وحید اللہ، بادشاہ خان، ڈاکٹر بلال بھٹہ، ڈاکٹر ماجد ممتاز، اور ڈاکٹر عون ساجد شامل ہیں۔

میں اپنی اہلیہ اور بچوں فرخ آفتاب، بیٹیوں فائقہ اور طیبہ آفتاب کا مشکور ہوں جنہوں نے میرے آرام کا خیال رکھا۔اور دوران تحقیق میرے مددگار اور معاون رہے۔اللہ ان کو اپنے فرائض اچھے طریقہ سے نبھانے کے صلہ پر اجرے عظیم عطا کرے آمین!

اس تحقیق کو میں بڑی عاجزی اور حقیقت پسندی سے کوئی بڑا معرکہ قرار نہیں دیتا۔مگر ایک بات کہنے کی جسارت رکھتا ہوں کہ میں نے کسی بھی مقام پر تحقیقی بددیانتی سے کام نہیں لیا اور جو مواد حاصل ہوا اس کی بنیاد پر اپنی دانست کے مطابق تجزیاتی و تحقیقی سلسلہ رواں رکھا ہے۔اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو منظور فرمائے، آمین!۔

قیصر آفتاب احمد

باب اوّل:
موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔تمہید:

i۔موضوع کا تعارف:

بیسویں صدی میں فکشن کے ذیل میں ناول کی صنف نے خاص طور پر ترقی کی ہے اور بیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے اردو ناول کا ارتقائی سفر اپنے موضوعات اور اسالیب کے حوالے سے نمایاں رجحانات کا حامل ہے۔ موضوعات کی ہمہ جہتی اور اسالیب کے تنوع نے ناول کو اردو ادب کی مقبول صنف بنا دیا ہے۔ لہٰذا اردو ناول کی سَوا سو سال سے زائد عرصے کو محیط تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس میں فکر و فن کے کئی دائرے نظر آتے ہیں۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی اور نفسیاتی حوالے سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ پہلو ناول کی صنف میں سمائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھی میں سے ایک دائرہ حب الوطنی کے موضوع کا بھی ہے۔ سیاسی پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں خاص طور پر اور دیگر ناولوں میں عام طور پر اس موضوع کے مختلف پہلو پیش ہوئے ہیں۔ حب الوطنی کے حوالہ ناولوں میں پیش کیے گئے واقعات کے ساتھ ساتھ کرداروں کی پیش کش میں بھی موجود ہے۔

ناول کے حوالے سے اگرچہ آغاز میں تنقیدی کام کچھ زیادہ نہیں تھا، تاہم قیام پاکستان کے بعد ناول کی تنقید کے ضمن میں پیش رفت ہوئی۔ ناول کی تنقید پر کئی کتابیں سامنے آئیں اور جامعات میں ناول نگاری کے موضوعات اور فن و اسلوب پر متعدد تحقیقی مقالات قلم بند کیے گئے جس سے اردو ناول کے کئی گوشے منوّر ہوئے۔ اردو ناول میں حب الوطنی کے عناصر کی تلاش و جستجو اور ان کا تجزیاتی مطالعہ بھی ناول کا اہم موضوع ہے۔ مجوزہ موضوع پاکستانی اردو ناول کے اسی پہلو کے تحقیقی و تجزیاتی مطالعے پر مبنی ہے۔

ii۔ بیانِ مسئلہ

حب الوطنی جزوِ ایمانی ہے اور ہر شخص شعوری اور لاشعوری طور پر کسی نہ کسی سطح پر ضرور محبّ الوطن ہوتا ہے۔

ناول فکشن کی ایسی صنف ہے جس میں عام حالاتِ زندگی اور زندگی کا انسانی طرزِ فکر سے ربط نہایت وسیع کینوس پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

اردو ناول کے آغاز سے عہدِ حاضر تک کسی نہ کسی صورت میں بیشتر ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر موجود رہے ہیں۔ یہ عناصر افرادِ معاشرہ کی قومی و ملّی امنگوں کے ترجمان ہیں اور اردو ناول میں حب الوطنی متنوع فکری جہات کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی ناول کے فکری دائرے کی تشکیل اور سیاسی و سماجی نقطۂ نظر کی پیش کش میں حب الوطنی کے عناصر کی کارفرمائی کس طرح سے موجود رہی ہے اور اس کے محرکات اور مضمرات کیا رہے ہیں۔ اپنے موضوع اور فکر کے لحاظ سے یہ تحقیق اردو ادب میں گراں قدر اضافے کی حامل ہے۔

iii۔ مقاصدِ تحقیق

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیشِ نظر ہوں گے:

۱۔ پاکستانی اردو ناول میں حب الوطنی کے عناصر کی تلاش و جستجو کرنا

۲۔ پاکستانی اردو ناول میں حب الوطنی کے عناصر کے محرکات اور مضمرات کا جائزہ لینا

۳۔ پاکستانی اردو ناول کے مختلف ادوار میں حب الوطنی کے تصورات میں تبدیلیوں کا جائزہ لینا

iv۔ تحقیقی سوالات

مجوزہ تحقیق کے دوران درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے جائیں گے:

۱۔ حب الوطنی کا مفہوم کیا ہے اور ناول میں اس کے اظہار کے پیرائے کیا ہیں؟

۲۔ پاکستانی اردو ناول میں حب الوطنی کے عناصر کی پیش کش کی مختلف صورتیں کیا ہیں؟

۳۔ زیرِ نظر زاویہ پاکستانی اردو ناول کی تفہیم میں کیوں کر معاون ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار

انسانی زندگی اور انسانی معاشرے کا بغور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ حب الوطنی جتنی اعلیٰ طبقات کے

ضمیر میں ہے اتنی ہی عام طبقے کے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے۔اسی تناظر کے پیش نظر حب الوطنی اور ناول دونوں ہی انسانی زندگی کے عام حالات سے جڑے ہوئے ہیں۔اس لیے ان دونوں کا تعلق ادبی سطح پر تحقیق کا متقاضی ہے۔

حب الوطنی کا تصور بنیادی طور پر سیاسی فکر سے متعلق ہے تاہم دوسری سطح پر یہ کسی قوم کے فرد کی نفسیاتی اور جذباتی وابستگی کا معاملہ بھی ہے۔اس لیے اس کا تعلق فرد سے بھی ہے اور معاشرے سے بھی۔اردو ناول میں بھی یہ دونوں صورتیں موجود ہیں اور زیرِ نظر مقالے میں انھی کا تجزیہ کرنے کی سعی کی گئی۔

vi۔تحقیقی طریقہ کار

تحقیق کا موضوع چوں کہ پاکستانی اُردو ناول میں حب الوطنی کے عناصر کے تجزیے پر مشتمل ہے۔اس لیے اس موضوع کی تکمیل،اس حوالے سے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مواد کی جمع آوری اور ترتیب، نیز ناول کی فکریات کے ناقدانہ جائزے کی متقاضی ہے۔اس امر کے لیے دستاویزی تحقیق اور تاریخی تحقیق زیادہ معاون طریقہ ہائے کار رہے۔اس کے علاوہ بھی ضرورت کے تحت تحقیقی طریقہ کار کو اختیار کیا گیا۔ بنیادی مآخذات کے ضمن میں زیادہ انحصار ناول اور اس کے تنقیدی مواد، تقسیم برصغیر کے بعد کے رسائل و جرائد پر کیا گیا۔

vii۔مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

مجوزہ موضوع پر اب تک کوئی مربوط کام کسی بھی تعلیمی سطح پر نہیں ہوا تھا۔تاہم اس موضوع پر مختلف مقالات، کتب اور رسائل میں ضمنی طور پر مواد منتشر شکل میں موجود ہے۔ناول کی فکری تفہیم و تنقید اور سیاسی و سماجی پس منظر کے حوالے سے شائع ہونے والی کتابیں اس حوالے سے قابلِ ذکر ہیں۔

viii۔تحدید

اس مقالے کا دائرہ کار قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے اردو ناووں تک محدود ہے۔قیام پاکستان سے ۲۰۱۵ء تک کے منتخب اردو ناولوں کا مطالعہ کیا گیا اور ان میں قومی اور ملّی حوالے سے حب الوطنی کے عناصر کی تلاش و جستجو کی گئی۔

Xi۔تحقیق کی اہمیت

تحقیق ایک نامیاتی عمل ہے جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور رہتی دنیا تک یہ عمل چلتا رہے گا دوسرے الفاظ میں تحقیقی عمل انسانی زندگی کے لیے نئے رجحان آسانیاں، وسائل، وسعتیں اور وسیع مواقع پیدا کرتا ہے۔جس کی وجہ سے دنیا پر دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں سائنسی میدانوں میں ہونے والی تحقیقات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ روئے زمین پر رہتے ہوئے تسخیر کائنات ممکن ہے اور یہ تسخیر جستجو کے ذریعہ ہی ممکن بنائی جاسکتی ہے تحقیق ایک باقاعدہ اور منظّم انداز ہے جس کو اختیار کر کے ایک محقق رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے اور سوالوں کے جواب مدلل انداز میں دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طریقہ سے تحقیق کے نتائج کو مطالعاتی میدان میں مستند اور قابل توثیق اضافہ سمجھا جاتا ہے۔

ب۔: حب الوطنی کی مبادیات:

مبادیات کے ضمن میں حب الوطنی کی درج ذیل ابتدائی اصطلاحات کی وضاحت علمی اور ادبی حوالے کی گی ہے۔تاکہ حب الونی کے موضوع کو آسانی سے سمجھا جاسکے۔

i۔قوم:

عربی زبان کا لفظ ہے جس کی جمع اقوام ہے۔قوم سے عمومی طور پر ایسے افراد مراد ہیں جو کسی ایک خطے میں مقیم ہوں یا اُن میں فکری، مذہبی، سیاسی، جغرافیائی یا تاریخی ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔قوم کا لفظ ملک سلطنت اور مذہب وغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔تاریخی عالم کا مطالعہ عموماً اقوام عالم کے رہن سہن، تہذیب وتمدن اور بودوباش کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

نوراللغات کے مطابق قوم کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں۔

قوم عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں

''ا۔گروہ عورتوں یا مردوں کا

۲۔اقوام کی جمع،فرقہ خاندان،ذات یا نسل''(۱)

لفظ قوم کے معنی کے مطابق قوم کا تعلق گروہ، فرقہ، خاندان، ذات یا نسل سے ہے۔ اس حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی علاقے میں ایک ذات، یا پھر ایک فرقہ کے لوگ قوم ہیں۔ کسی ایک ذات یا پھر ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد چاہے ایک جگہ پر رہتے ہوں یا پھر مختلف جگہوں پر ایک قوم کہلاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے لفظ Nation استعمال ہوتا ہے۔ جو پیدائش کے معانی میں آتا ہے۔ اس سے دو طرح کے خیال ذہن میں آتے ہیں۔ ایک ہی خاندان یا نسل میں پیدا ہونے والے یا ایک علاقہ میں پیدا ہونے والے افراد ایک قوم کہلاتے ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں قوم بنانے میں مشترکہ نسل کا کردار ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ جب کہ قوم کی تعریف کے لیے دیگر عوامل استعمال میں لائے جا رہے ہیں یا پھر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مشترکہ نسل کی جگہ دوسرے عوامل نے لے لی ہے۔

عام آبادی کا ایک ایسا گروہ جس کی زبان اور روایات ایک جیسی ہوں۔ اور ایک ہی طرح کے سیاسی اداروں کے تحت زندگی بسر کر رہے ہوں اور ملک کے اداروں میں اتفاق ہو۔ ان کے لیے اکثر ملکی ریاست کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ایک آزاد حکومت کے تحت ایک مقرر کردہ علاقہ میں آباد رہنے والے افراد کی ایک کیمونٹی، ایک خود مختار سیاسی ریاست میں بسنے والے ایک قوم کہلاتے ہیں۔

اردو انسائکلو پیڈیا کے مطابق:

> ''قوم (NATION) اس سے مراد کسی خطّے میں افراد کا وہ گروہ ہے جس کا تعلق ایک ہی نسل سے ہو۔ جس کی تاریخی اور تہذیبی روایات مشترک ہوں۔ جس کے درمیان لسانی وحدت ہو اور جو انتظامی طور پر متحد ہو''۔ (۲)

قوم کے بارے میں ایک نسل سے تعلق ہونا اور تاریخی و تہذیبی اشتراک رکھنا، بھی اگرچہ قوم کی واضح علامات ہیں مگر کئی دیگر پہلو بھی اس سلسلے میں شمار ہوتے ہیں۔

کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات میں قوم سے متعلق درج ہے:

> ''مِلّت، قوم، معاشرتی گروہ کا نام جو ثقافتی لحاظ سے ہم رنگ ہو۔ جسے اپنی نفسی زندگی اور اس کے اظہار کی وحدت کا پورا پورا شعور ہوتا ہے۔ اس کے

افراد کے کچھ رشتے قدرتی طور پر اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ وہ اکٹھے خوش کن
زندگی بسر کر سکتے ہیں''(۳)

قوم کی مختلف لوگوں نے مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ سٹالن اپنی ایک کتاب ''قوم اور قومیت'' میں قوم کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

''قوم انسانوں کے ایسے پائیدار گروہ کا نام ہے۔جس کی ارتقاء وعروج میں تاریخ نے ہاتھ
بٹایا ہو اور جس کے اندر اشتراک زبان، اشتراک ارض، اور اشتراک معاش پایہ جاتا ہو
اور ساتھ ہی اس کی نفسیاتی ساخت بھی ایک ہی ہو''(۴)

مغرب میں قوم کو زبان، علاقہ، طرز معاش اور نفسیاتی تقاضوں میں باندھا جاتا ہے۔جب کہ اسلام میں قوم کا تصور ان چیزوں سے بالاتر ہے۔اور یہی تصور برصغیر میں دوقومی نظریہ کی بنیاد بنا۔اس ضمن میں سرسید احمد خان اپنے مضمون'' قومی تعلیم قومی ہمدردی اور باہمی اتفاق'' میں یوں رقم طراز ہیں۔

''قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے۔جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنا لازمی ہے۔زمانہ دراز
سے جس کی ابتداء تاریخ زمانہ سے بھی بالاتر ہے۔قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل
میں ہونے یا کسی ملک کے باشندے ہونے سے ہوتا ہے۔محمد الرسول ﷺ نے (بابی
انتا وامی یارسول اللہ) اس تفرقہ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا مٹا دیا اور ایک
روحانی رشتہ کے سامنے نیست ونابود ہو گئے۔اور دنیا روحانی بل کہ خدائی رشتہ قائم ہو
گیا۔'' (۵)

سرسید احمد خاں کے ان افکار کے علاوہ قوم کی توضیح افکار قائد سے بھی ہوتی ہے۔

محمود عاصم اپنی کتاب افکارِ قائداعظم میں لکھتے ہیں کہ:

''لفظ قوم کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔اور اس لحاظ سے
ان کا اپنا علیحدہ وطن، اپنا علاقہ اور اپنی مملکت ہونی چاہیے''(۶)

قائداعظم کے ان افکار سے معلوم ہوا کے قوم کے لیے وطن کی موجودگی لازمی امر ہے۔

قومیت:

قومیت سے مراد افراد کا ایسا گروہ ہے۔ جو رنگ، نسل، زبان، اور ایک ہی علاقہ میں ایک طرح کی آب وہوا میں رہ رہے ہوں۔قومیت انسانوں کو مختلف علاقائی ، رنگ اور نسل کی بنا پر تقسیم کرتی ہے۔جس سے معاشرہ کے افراد تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔اور ان کی علیحدگی سے بلاوجہ تنازعات کی بنا پڑتی ہے۔جو بعض اوقات انسانی جانوں کے اتلاف اور تباہی کا موجب بنتی ہے۔

قومیت کے معانی سعیدی ڈکشنری کے مطابق یوں بیان کیے گے ہیں۔

''نسل ،اصل ۔ '' (۷)

قومیت کسی فرد اور ریاست کے درمیان ایک قانونی تعلق ہے۔قومیت اس شخص پر ریاستی حکمرانی پر زور دیتی ہے۔اور اس شخص کی ریاست حفاظت کرتی ہے۔یہ حقوق اور فرائض ایک ریاست کے دوسری ریاست سے مختلف ہوتے ہیں۔اردو انسائکلو پیڈیا کے مطابق:

> ''بالعموم اس سے مراد فردِ واحد یا فروے کی ذات ہوتی ہے۔مثلا فلاں شخص کی ذات سیّد یا مغل ہے۔
>
> قومیت کا مفہوم، وسیع پیمانے پر ملک اور مِلّت کا بھی ہوتا ہے۔اس صورت میں اس کے لئے انگریزی مترادف nationality ہے۔مثلا فلاں کی قومیت کیا ہے اور جواب ہوتا ہے ''پاکستانی''
>
> سوشلسٹ اصطلاح میں قومیت یا nationality سے مراد وہ چھوٹی قوم ہے جو کسی بڑی قوم کی جغرافیائی حدود میں آباد ہو، مثلا سویت یونین.....'' (۸)

کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات میں قومیت کے متعلق درج ہے:

> ''قومیت، nationality، مِلّت، جذبہ قومیت، مِلیّت، روحانی جذبہ جو ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں نسل کا اشتراق ہو۔وہ ایک ہی علاقہ پر آباد ہوں۔ان مین زبان، مذہب، تاریخ، روایات، مفادات،

سیاسی روابت اور سیاسی وحدت کا اشتراق ہو۔قومیت کی اصطلاح
ان لوگوں پر بھی ہوسکتی ہے جو قومیت کا احساس رکھتے ہوں۔قومیت
محسوس کرنے، سوچنے اور جینے کا مسئلہ ہے۔''(۹)

جیسا کہ مغرب میں قومیت کی بنیاد سیاسی تصور کے مدنظر رنگ نسل، علاقہ، اور زبان پر کی جاتی ہے ۔اس طرح پوری دنیا کے لوگوں کو علاقائی مناسبت کے لحاظ سے مختلف گرہوں میں تقسیم کردیا ہے ۔ جیسے پاکستانی ، ہندوستانی، کشمیری ، بنگالی، ترکی، ایرانی، عربی، عراقی، یورپی، امریکی وغیرہ اور پھر ان ملکوں کے اندر مزید تقسیم نسلوں اور زبانوں کے لحاظ سے کی گئی ہے۔اور اس طرح انسان مختلف گروہوں میں تقسیم ہوکر رہ گیا ہے۔ جب کہ اسلامی تصور قومیت مغرب سے جدا نظر آتا ہے۔قومیت دراصل اپنائیت کے ایک ایسے احساس اور جذبہ کا نام ہے۔ جو افراد کے مابین مشترکہ نسل، رنگ، مشترکہ مذہب، مشترکہ علاقے، مشترکہ زبان، اور مشترکہ روایات ومقاصد کی بناء پر پیدا ہوتا ہے۔اس جذبہ کی بناء پر لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے الگ اور خود کو ایک رشتے میں منسلک سمجھتے ہیں۔ افراد میں قومیت کی خصوصیات اس وقت جنم لیتی ہیں جب اُن میں بعض رشتوں میں منسلک ہونے کا شعور پیدا ہوجاتا ہے۔اور اسی شعور کی بنا پر وہ خود کو ایک الگ معاشرتی واحدت تصور کرتے ہیں۔قومیت کے بارے میں علامہ اقبال اپنے ایک مقالے ''ملت بیضا پر عمرانی نظر'' میں لکھتے ہیں۔

''قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نا اشتراک زبان ہے۔نا اشتراک وطن، نا اشتراک اغراض اقتصادی اور اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے۔جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمن کو جرمنوں سے ہے۔ وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔'' (۱۰)

قومیت کے اسلامی تصور کا مطابق اقبال مغربی تصور قومیت کے بالکل مختلف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں ان کے نزدیک مذہب قومیت کی بنیاد ہے اور ایک مسلمان دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتا ہو وہ قومیت کے لحاظ سے امت مسلمہ کا فرد ہے۔ متعدد مذہبی علما نے اسلامی قومیت کی توضیح کی ہے اس بارے میں مولانا مودودی کی

فکر سے بھی استفادہ کرنا ضروری ہے ۔

مولانا مودودی کے خیال میں اسلامی قومیت کا مطلب ہے کہ:

''قرآن نے جولفظ مسلمانوں کی جماعت کے لئے استعمال کیا ہے وہ ''حزب'' ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔قومیں نسل ونسب کی بنیاد پر اُٹھتی ہیں اور پارٹیاں اصول ومسلک کی بنیاد پر۔اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔کیونکہ ان کو تمام دنیا سے الگ اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں۔اور جن سے ان کا اصول ومسلک میں اشتراک نہیں۔وہ خواہ ان سے قریب ترین مادی رشتئے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ان کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں'' (۱۱)

مولانا مودودی نے اسلامی بنیاد پر قوم کو ایک نسل کے بجائے پارٹی قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک مادی رشتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے

iii۔قوم پرستی:

قوم پرست ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جن میں اپنی نسل،قبیلہ،علاقہ کا درد پایا جائے۔ایسے لوگ نظریہ وطنیت کے قائل ہوتے ہیں۔اوران کی اپنے لوگوں یا علاقے سے غیر معمولی محبت پائی جاتی ہے اور وہ اس محبت کا اظہار مختلف انداز میں کرتے ہیں۔

" Definition of nationalism

loyalty and devotion to a nation

especially : a sense of national consciousness (see CONSCIOUSNESS sense) exalting one nation above all others and placing primary emphasis on promotion of its culture and interests as opposed to those of other nations or supranational groups

Intense nationalism was one of the causes of the war."(12)

ایک قوم کی وفاداری اور عقیدت خاص طور پر قومی شعور کا احساس ہے۔ایک دوسرے کے اوپر قوم کو بڑھانا اور اس کی ثقافت اور مفادات کے فروغ پر زور رکھتا ہے۔جیسے دوسری قوموں یا سپانسر یشنل گروپوں کے شدید قوم پرستی جنگ کے وجوہات میں سے ایک تھا ۔

کمیونزم ایک سیاسی سماجی اور معاشی نظریاتی تحریک ہے۔جس میں خاص ملک کے مفادات کو فروغ دینے کی طرف اشارہ ہے خصوصاً ملکی خودمختاری کو اپنے ملک میں حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کا مقصد قوم پرستی ہے۔قوم پرستی سے مراد ہے کہ اپنے ملک پر خود حکمرانی کی جائے بیرونی مداخلت (خودارادیت) سے آزاد یہ ایک قوم کسی دوسری قومیت کے لیے قدرتی اور مثالی بنیاد ہے ۔

اردو انسائکلو پیڈیا کے مطابق:

''اپنی قوم کو دیگر اقوام کی نسبت برتر سمجھنا اور اس سے بے پایاں وفاداری کا اظہار کرنے کا جذبہ قوم پرستی کہلاتا ہے۔اس جذبے کی بنیاد ان احساسات پر ہوتی ہے۔سرزمینِ وطن سے وابستگی قوم کے ثقافتی اور تاریخی کارناموں پر فخر و مباحات اور قومی ورثے کا اندرونی و بیرونی طور پر تحفظ''(۱۳)

اُردو انسائکلو پیڈیا کے مطابق اپنی قوم کو دوسری اقوام سے افضل اور اعلیٰ سمجھنا قوم پرستی ہے

کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات میں قومیت کے متعلق درج ہے:

''مِلیّت ،احساساتِ مِلّی ،قوم پروری،قوم پرستی یہ ان قوتوں کا نام ہے
جولوگوں کوایک روحانی رشتے میں منسلک کرتا ہے۔ان قوتوں میں نسل،
مشترکہ ادب، زبان، ثقافت، جغرافیائی وحدت، مذہبی اشتراک، مشترکہ سیاسی
خواہشات، مشترکہ تاریخ اور مشترکہ مفادات شامل ہیں۔''(۱۴)

قوم پرستی سے مراد اپنی قوم سے بے پناہ محبت کرنا اور دوسری قوموں سے افضل اور برتر جاننا ہے۔ایک قوم پرست میں اپنی قوم اور قوم کے لوگوں کی محبت کے جذبات نمایاں ہوتے ہیں۔اور وہ اپنے تمام مفادات کو قوم کے لیے قربان کر دیتا ہے اور ضرورت پڑنے پر جان کی بھی پروانہیں کرتا ۔

iv۔وطن:

وطن ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں پر کسی کی پیدائش ہوئی ہو۔یہ قدرتی عمل ہے کہ جس جگہ پر کسی کی پیدائش ہوتی ہے اس سے قدرتی طور پر محبت ہوتی ہے۔اور یہ محبت انسان کے دل سے ختم نہیں ہوتی وہ جہاں بھی چلا جائے اس کو اپنے وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔وطن کے ساتھ محبت کا احساس اس کی روح میں بسا ہوتا ہے۔مختلف ادیبوں اور شاعروں نے اس احساس کو مختلف اصناف ادب میں استعمال کیا ہے۔جس میں نثری اور شعری اصناف ہیں۔جب کہ انگریزی زبان میں اس کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں

"1. Mother land 2. Native Country 3. Home land 4. Patriot " (15)

ملک ایک ایسا علاقہ ہے جو سیاسی جغرافیہ میں ایک مخصوص ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔یہ ایک خود مختار ریاست یا بڑی ریاست کا حصہ ہوسکتا ہے۔غیر حکومتی یا سابقہ خودمختاری سیاسی ڈویژن یا جغرافیائی علاقہ کے طور پر یا مختلف سیاسی خصوصیات کے ساتھ پہلے سے آزاد یا مختلف افراد جو ایک مسلک کے ساتھ منسلک ہوں ان کے ساتھ منسلک جغرافیائی علاقہ کا نام ہے ۔

مغربی وطن پرستی کے نظریات میں انسانوں کو مختلف علاقائی حدود و قیود کا پابند بنایا گیا ہے۔اس کے مطابق وطن جغرافیائی حدود کا نام ہے جب کہ اسلام کی نظریاتی احساس کے مطابق وطن کا تصور علاقائی حدود و قیود

سے مبرا ہے۔ وطن کی تعریف قرآن کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ اسلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو اپنی مقبوضہ سرزمین میں داخل ہونے اور قابض ظالموں سے اپنا وطن آزاد کروانے کا حکم دیتے ہیں۔

ترجمہ:'' اے میری قوم (ملک شام یا بیت المقدس کی) اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ ننے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔اور اپنی پشت پر (پیچھے) نہ پلٹنا ورنہ تم نقصان اٹھانے والے بن کر پلٹو گے'' (۱۶)

v۔ وطنیت:

وطنیت سے مراد ایک ہی علاقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا وطن جو روایتی اور پیدائشی طور پر ایک طرح کی آب وہوا اور معاشرتی ماحول سے تعلق رکھتے ہوں۔ وطنیت کا تصّور وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ میری دانست میں یہ ہمہ گیر اہمیت کا حامل ہے۔ جب ہم کسی مخصوص علاقہ کی بات کرتے ہیں تو یہ مزید تقسیم ہو کر اس علاقہ کو ذیلی اکائیوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔اس کے لیے ایک مثال پیش خدمت ہے۔

جیسے ہر گھر کا ماحول دوسرے گھر سے مختلف ہوتا ہے۔اور بہت سے گھر مل کر گاؤں بناتے ہیں۔اور پھر اس گاؤں کا ماحول بنتا ہے۔اور بہت سارے گاؤں مل کر تحصیل بناتے ہیں اور تحصیلیں مل ایک ضلع بنتا ہے اور پھر اضلاع مل کر ریجن بناتے ہیں، اور ریجن مل کر صوبہ اور صوبے مل کر ملک بناتے ہیں۔اور اس طرح ہر سطح پر رہنے والے کے لیے وہ علاقہ وطنیت کی حثییت رکھتا ہے اور صوبوں کے اندر اضلاع کو وطنیت کا درجہ حاصل ہے، جب کہ ملک کے اندر صوبوں کو اور ملک سے باہر ملک کو وطنیت کا درجہ حاصل ہے اور اس طرح یہ تصور معاشرتی، معاشی، سماجی روایات اور موسمی تبدیلوں کے پیش نظر وسیع تر اہمیت کا حامل ہے۔

vi۔ وطن پرستی:

وطن پرستی سے مراد وہ عمل ہے جو ایک محبّ وطن یا وطن پرست، سرانجام دیتا ہے۔اپنے علاقہ، علاقہ کے لوگوں سے محبت کرنے والے کو محبّ وطن یا وطن پرست کہتے ہیں۔ایک استاد بچوں کو محنت اور لگن سے پڑھاتا ہے۔

مزدور اس نظریہ کے ساتھ محنت کرتا ہے کہ وہ رزق حلال کمائے، ایک ڈاکٹر مریضوں کا علاج کرتا ہے اور ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے۔ پولیس والا ملک کے امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے جان فشانی سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے۔ بنکار اپنے نظام الاوقات میں غفلت سے کام نہیں لیتا۔ طالب علم محنت کے ساتھ پڑھتا ہے۔ اور جج انصاف پر مبنی فیصلے کرتا ہے۔ اس طرح دوسرے پیشوں کے تمام لوگ اپنی اپنی ڈیوٹی ایمانداری، محنت اور لگن سے کرتے ہیں۔ اور ملک ترقی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سب لوگ وطن پرست ہیں اور ان کا اقدام اپنی اپنی جگہ پر وطن پرستی کی مثال ہے ۔

vii۔علاقہ:

علاقائیت کو بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ علاقہ کی وضاحت کر دی جائے عام طور پر علاقہ سے مراد رقبہ یا حد بندی لی جاتی ہے۔ لیکن علاقہ کا لفظ بہت سے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ فیروز اللغات کے مطابق علاقہ کے معنی درج ذیل ہیں۔

''ا۔تعلق، لگاؤ، رابطہ، دوستی، رشت ۲۔سروکار، نسبت، ۳۔نوکری، عہدہ، کام ۴۔ضلع، صوبہ، حاطہ ۵۔ملکیت، قبضہ، زمینداری ۶۔جائداد، ریاس ۷۔حکومت ۸۔حدود، سرحد'' (۱۷)

اُردو انگریزی لغت کے مطابق علاقہ کے معنی:

" 1.Property 2. Estate 3. land " (18)

علاقہ وہ خطہ یا رقبہ ہوتا ہے جسے بڑے یا چھوٹے پیمانے پر مختلف خصوصیات کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا ہو۔ یہ تقسیم اس طرح کی ہوسکتی ہے۔ ظاہری خصوصیات کی بنیاد پر تقسیم: زمین بنجر ہے تو بنجر زمین کا علاقہ، زرخیز ہے تو زرخیز زمین کا علاقہ، پہاڑی علاقہ، بارانی علاقہ، یا پھر موسم کی بنیاد پر تقسیم، ٹھنڈا علاقہ، گرم علاقہ، لوگوں کے قدرتی خواص پر علاقہ کی تقسیم، لمبے لوگوں کا علاقہ، کالے لوگوں کو علاقہ، گورے لوگوں کا علاقہ، امیر لوگوں کا علاقہ، غریب لوگوں کا علاقہ، امن پسند لوگوں کا علاقہ، خطرناک علاقہ المختصر علاقہ کو مختلف اقدار کے لحاظ سے تقسیم کیا جا ہے۔ علاقہ کی نسبت سے

علاقائی ہے۔اور علاقائی اقدار کی حامل حد بندیوں کو علاقائیت کا نام دیا جاتا ہے۔اور جن لوگوں میں یہ اقدار پائی جائیں ان میں اس علاقائی تاثر کا نام دیا جاتا ہے۔اور اس علاقائیت انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنے کا باعث بنتی ہے۔

viii۔علاقائیت:

جیسا کہ اوپر معانی میں بتایا گیا ہے کہ علاقہ، رقبہ اور حد بندی کو بھی کہتے ہیں۔علاقائیت کی بنیاد پر انسان نے اپنے آپ کو تقسیم کر رکھا ہے۔اور ان کی تقسیم بندی جہاں انسانیت کے رشتے کو کمزور کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے وہیں پر ملکی سالمیت کو بھی نقصان پہنچا رہی ہے۔جس سے ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔علاقائیت تعصب کا باعث ہے۔جس سے ملک میں افراتفری بے روزگاری، دہشت گردی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔علاقائیت کی بنیاد پر لوگوں کے تقسیم ہونے سے حکومتیں کمزور اور ملک کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔اگر ممالک کو انتظامی امور کے تحت تقسیم کیا جائے تو یہ ملک میں امن وایمان اور بہتر منصوبہ بندی کی علامت ہے۔اور علاقائی تعصب کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے یہ ملک کی تباہی و بربادی کا باعث بنتی ہے۔المختصر علاقائیت سے مراد کسی ملک کو زبان، رسم ورواج، اور آب وہوا کی بنیاد پر تقسیم کرنا ہے۔

xi۔پاکستانی:

کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات کے مطابق: ''پاکستان کا شہری'' (۱۹)

ہر ملک میں پیدا ہونے والا اور وہاں کا مستقل رہاشی اپنے اپنے ملک کی نسبت سے پکارا جاتا ہے۔جیسے امریکہ کا رہاشی امریکی، مصر کا مصری۔افغانستان کا افغانی، روس کا روسی اور چائینہ کا چائنی کہلاتا ہے۔اسی طرح پاکستان کے رہنے والے پاکستانی کہلاتے ہیں۔جس طرح دوسرے لوگ اپنی اپنی ملکی نسبت کے مطابق اپنے اپنے ملک سے لامحالہ محبت کرتے ہیں۔پاکستانی بھی اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔پاکستان اسلامی نظریہ کے تحت حاصل کیا گیا یہ دنیا کا واحد ملک ہے جو کسی نظریہ یا عقیدہ کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا۔پاکستانی ادیبوں اور شاعروں

نے بھی وطن دوستی کے تقاضے خوب نبھائے ہیں خوشی کے لمحات میں وطن سے محبت کا اظہار اور آزمائش کے وقت میں قوم کے جذبوں کو پرعزم اور مضبوط بنایا ہے۔

x۔ پاکستانیت:

پاکستانیت سے مراد پاکستان سے محبت، پاکستان کے باشندوں اور ہر اس چیز سے محبت کا اظہار کرنا ہے۔ جو پاکستان کے عزت و وقار میں اضافہ کا باعث ہو۔ جن افراد میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ان میں پاکستانیت پائی جاتی ہے ۔ پاکستان سے محبت اور عقیدت کا نام ہی پاکستانیت ہے۔

پاکستانیت کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ یوں رقم طراز ہیں۔

> ''پاکستانیت'' کا مطب وجود پاکستان سے والہانہ محبت عقیدت اور جان نثاری کا نام ہے۔ اور پاکستان کا مطب اسلامی اقدار کے احیا کی محفوظ پناہ گاہ کے ہیں۔ اور اس پناہ کا گلِ گارا عقیدہ توحید اور عقیدہ رسالت سے تشکیل پاتا ہے۔ جو امن سلامتی، اخوت اور یک جہتی کا درس دیتا ہے۔ پاکستانیت کے بارے میں قائداعظم کا فرمان ہے۔ کہ ''پاکستانیت''، محض سیاسی، جغرافیائی اصطلاح نہیں بل کہ اس کے کچھ تہذیبی نظریاتی، معنی بھی ہیں۔ جن کا براہ راست تعلق ہماری مسلم قومیت اور نظریہ پاکستان سے ہے۔'' (۲۰)

میری دانست کے مطابق پاکستانیت سے مراد ایسے ہی ہے جیسے باغ کے اندر مختلف انواع کے پھول کھلے ہوتے ہیں اور پھولوں سے محبت کرنے والا پرندہ بلبل تمام پھولوں پر منڈلاتا ہوا نظر آتا ہے اور ان سے والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ اور دن رات پھولوں کے خواب اس کی آنکھوں میں سجے رہتے ہیں اور جب موسم خزاں کے آنے سے پھول مرجھانا شروع ہوتے ہیں۔ بلبل اداس رہنا شروع ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح پاکستان کے لوگوں سے والہانہ محبت، عقیدت اور ان کی سلامتی چاہنا، بلاتفریق اس کی ہر چیز کی حفاظت کا نام ''پاکستانیت'' ہے۔

پاکستانیت کے بارے میں ڈاکٹر آغا سہیل یوں رقم طراز ہیں:

''کسی ادب سے اس کے ملک کی شناخت ممکن ہے۔ جس طرح فطرت میں مختلف النوع
پھول پیدا کیے مگر ان کی شناخت ان کے رنگوں اور ان کی خوش بو سے رکھی اسی طرح فنون لطیفہ
کے ذریعے جن میں ادب بھی شامل ہے۔ ملک کی شناخت ہوتی ہے۔'' (۲۱)

جس طرح ہر شخص اپنی شکل سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر تحریر اپنے اسلوب سے پہچانی جاتی ہے۔ اور اسلوب ہر کسی کا مختلف ہوتا ہے۔ جس طرح باغ کے پھول رنگ اور خوش بو سے پہچانے جاتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک کا ادب بھی اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ پاکستانی ادب کی پہچان پاکستانیت کی بنا پر کی جاتی ہے۔ جو کہ پاکستانی ادب کی نمایاں اور اہم علامت ہے۔

xi۔ حب الوطنی:

حب سے مراد محبت اور حب الوطنی سے مراد خاص وطن سے محبت ہے۔ وطن سے محبت کا جذبہ انسان کی سرشت میں شامل ہے اور یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ جس دل میں وطن سے محبت کا جذبہ عنقا ہو وہ دل بے حس اور مردہ ہے۔ حب الوطنی کا جذبہ انسان کو اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرنے اور ان کے دکھ درد میں شامل ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ وطن کی عزت کی خاطر اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے۔ انسان تو انسان حیوان بھی جس سرزمین پر پیدا ہوتا ہے۔ اس سے پیار و محبت اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اللہ کی پیدا کردہ تمام مخلوقات جن میں چرند، پرند، سب اپنے مسکن یعنی وطن سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ہر انسان اور جاندار دن کو روزی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور شام کو واپس اپنے مسکن میں آجاتا ہے۔ جو اس کا گھر ہے جس میں اس کے ماں باپ، اولاد اور خاندان ہے۔ اپنے گھر کی در و دیوار سے صرف انسانوں کو ہی نہیں بل کہ حیوانات کو بھی الفت ہوتی ہے۔

حب الوطنی اپنے وطن (مکہ) سے محبت کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث بیان کی جاتی ہے۔

ترجمہ: ''کتنا پاکیزہ شہر ہے اور مجھے کتنا محبوب ہے! اگر میری قوم تجھ سے
نکلنے پر مجھے مجبور نہ کرتی تو میں تیرے سوا کہیں اور سکونت اختیار نہ کرتا۔'' (۲۲)

اس حدیث پاک میں حضور نبی اکرم ﷺ اپنے آبائی وطن مکہ مکرمہ سے محبت کا ذکر فرماتے ہیں۔

حب الوطنی کا معنی و مفہوم

نور اللغات حصہ دوم میں تحریر ہے:

''حب الوطن (ع) مونث وطن کی محبت (ع) '' (۲۳)

فرہنگ آصفیہ جلد دوم میں سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''وطن الوطن (ع) اسم مونث، وطن کی محبت، حب (ع) اسم مونث، محبت، الفت، پریم، انس، پیار، پربت، دوستی، آشنائی، شوق، چاہ، آرزو۔'' (۲۴)

امریکن ہیریٹیج ڈکشنری کے مطابق:

"Patriosim Noun, love and devotion to once country." (25)

انگریزی کی کتاب میں حب الوطنی کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

It is frequently said that patriotism is 'love of one's country'. I am not altogether comfortable with that as a general account, even though patriots frequently do love their countries. Some part of my hesitation stems from the multiple ambiguities of 'love'.13 Even more significant is the critical stance one may often have as part of one's patriotism . . . . for example, bumper stickers that proclaim 'It is patriotic to dissent', or the critical role that may be played by a 'loyal opposition'. Although love may also be critical/tough, the informal or popular focus on love as expressive of devotion and positive emotional support too easily allows for a misleading exploitation of patriotic ideantification when characterized as love of country. Moreover, the loyalty one sometimes

shows to one's country may amount to little more than a decision not to act in ways that would jeopardize its interest rather than a positive commitment to advance them (much as a woman may loyally stick with her no-good husband: she has more feeling for the institution of marriage than for the particular man she married). Even though it often is, loyalty need not be accompanied by a greeat deal of affection."(26)

ترجمہ: حب الوطنی کے اکثر اوقات جو معانی لیے جاتے ہیں وہ یہ نہیں کہ فرد اپنے وطن سے کتنی محبت کرتا ہے۔ کوئی بھی محبّ وطن اپنے وطن کی محبت کے لیے تڑپتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں کہیں کہیں بحث کی گنجائش ہوتی ہے۔ لفظ محبت اپنے اندر کئی پہلو رکھتا ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ وہ پہلو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوں۔ حب الوطنی میں ایک پہلو تنقید کا بھی ہوتا ہے مثال کے طور پر آپ نے اکثر یہ پڑھا ہوگا کہ اختلاف بھی حب الوطنی کی ایک شکل ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوتا کہ ایک وفادار تنقید نگار بھی حب الوطنی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ محبت میں تنقید کتنی سخت کیوں نہ ہو لیکن وہ اندر مثبت پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اگر ہم اس کو ٹھیک سے سمجھ نہ پائیں تو بعض اوقات لوگ اس کے الٹ معنی بھی لے سکتے ہیں۔ بالخصوص جب معاملہ وطن سے محبت کا ہو اکثر اوقات حب الوطنی ہم سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم ایسے اقدام سے بعض رہیں جن سے ملکی مفادات کو خطرہ ہو۔ بلکہ ایسے مثبت ایفائے عہد کا تقاضا کرتی ہے جو ہمیں اکثر ازدواجی تعلقات میں پایا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کی مثال اس عورت جیسی ہے جو ایک ایسے مرد سے وابستہ ہے جو بظاہر ناکارہ ہے لیکن بہ حیثیت بیوی وہ عورت اس کی وفادار ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اکثر اوقات وفادار ہونے کے لیے گرفتارِ محبت ہونا ضروری نہیں۔

الیگرا اور الیگزنڈر کے خیالات کیمطابق حب الوطنی میں موجود لفظ محبت کے کئی پہلو ہیں۔ محبت کے مثبت اور منفی پہلو ہو سکتے ہیں۔ وطن کی محبت سے غداری کرنے سے روکتی ہے۔ حب الوطنی کا ایک پہلو وفاداری بھی ہے جیسے کوئی عورت اپنے خاوند سے محبت نہ کرتی ہو مگر پھر بھی اُس کی وفادر ہو۔ تو اس کی وفاداری بھی محبت کی طرح کا ایک عمل ہے۔ کسی وطن میں رہنے والے وہ لوگ جو بظاہر وطن سے محبت نہیں کرتے مگر اس کے وفادار رہتے ہیں تو ان کا یہ عمل بھی حب الوطنی میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اصطلاحی معنی

اصطلاحی مفہوم میں اپنے وطن یا سرزمین سے محبت کے والہانہ اظہار کے جذبے کو 'حب الوطنی' کہا جاتا ہے۔ حب الوطنی دو لفظوں کا مرکب یعنی ایک ترکیب ہے۔ حب کے معروف معنی محبت اور وطن سے مراد رہنے کی جگہ، مسکن، سرزمین یا علاقہ ہے اور کلی طور پر اس لفظ ''حب الوطنی'' کا مفہوم اپنے وطن یا سرزمین سے محبت کے جذبے کا اظہار ہے اور اس جذبے کا عملی اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ اصطلاحی معنوں میں حب الوطنی کا مطلب یہ ہے کہ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے وہ اپنے مسکن کی ہر ایک چیز سے والہانہ پیار اور محبت کرتا ہے اور اپنے مسکن کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر وہ عارضی طور پر یا مستقل طور پر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں ہجرت کر جائے تب بھی وہ اپنے جنم بھومی سے پیار کرتا رہتا ہے اور ہمیشہ اپنے علاقے کی یادوں میں کھویا رہتا ہے۔ ان پرانی یادوں کو ہمیشہ کے لیے امر کرنے کے لیے وہ ادب کا سہارا لیتا ہے۔ اردو ادب میں اپنے وطن کی محبت کے اظہار کے لیے مختلف اصناف کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مثلاً شاعری، ناول، ڈرامہ اور افسانہ میں اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''مسلمانانِ ہند نے اپنے قومی تشخص کے لئے جو مطالبہ کیا وہ اس بنا پر نہ تھا کہ ہمیں ایک مادی حدود کا پابند ملک درکار ہے، بلکہ اس بنا پر تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی وحدتِ ملّی کو کئی خطرات کا سامنا تھا،.....جب بآسانی ایسا کیا جا سکتا تھا۔ اور ہم نے ان مواقع کو کیوں کھو دیا؟ مجرم سیاست دان تھے؟ سیاسی جماعتیں یا ادیب تھے یا شاعر؟ اردو کے ادیب تھے یا علاقائی زبانوں کے؟ یہ بجائے خود اہم مسائل ہیں۔'' (۲۷)

حب الوطنی کا جذبہ اپنے انداز میں متغیر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حب الوطنی اپنا احساس تبدیل کرتی رہتی ہے۔ کبھی یہ تعمیری صورت اور کبھی تخریب کاری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حب الوطنی ہوتی کیا ہے اور یہ کیسے وجود میں آتی ہے؟ حب الوطنی سے مراد اپنے ملک کی چاہت، اپنے وطن سے پیار، دیس سے محبت کا اظہار کرنا ہے۔ یہ ایک پیدائشی فطرت ہے۔ یہ ایک جذبہ ہے۔ یہ ایک خواہش ہے اور اس کا اظہار تمام ممکنہ طریقوں سے ملک و قوم کی بے لوث خدمت کرنا ہے۔ حب الوطنی کے جذبے کے تحت ہم اپنے ملک کو دوسرے ممالک پر ترجیح دیتے

ہیں۔ یہ ایک ایسی جبلّت ہے، جو ہمارے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ یہ ایک اعلیٰ و برتر احساس ہے جس کے تحت ہم سانس لیتے ہیں، کھاتے، پیتے ہیں۔ حب الوطنی کا جذبہ صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ حیوان بھی اس جذبے سے مبرا نہیں۔ وہ بھی اپنے مسکن سے محبت کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی دوسرا جانور چاہے ان کی نسل سے ہو یا کوئی دوسری نسل ہو، ان کے مسکن کی طرف اس نیت سے بڑھتا ہے کہ اس پر قبضہ کر لے تو پہلا جانور کمزور ہوتے ہوئے بھی اپنی طاقت واستطاعت کے مطابق مزاحمت ضرور کرتا ہے۔ پھر چاہے وہ احتجاج کرتا ہوا وہ مسکن چھوڑے یا جان سے جائے وہ بعد کی بات ہے۔

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے حسن ریاض نے قائدِ اعظم کا ایک فرمان تحریر کیا ہے:

''مجھے اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے اور مجھے پھر کہنے دیجئے کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں ہے اور نہ ایک ملک ہے۔ یہ برّصغیر ہے۔ جس میں بہت سی قومیں ہیں۔ ہندو اور مسلمان ان میں دو بڑی قومیں ہیں'' (۲۸)

ہر انسان کسی نہ کسی طور حب الوطنی کا جذبہ ضرور رکھتا ہے لیکن یہ بات درست ہے بھی اور نہیں بھی۔ بدقسمتی سے تاریخ میں کچھ غدار اور وطن دشمن ایسے بھی گزرے ہیں جو بہت زیادہ بدنام ہوئے۔ ذلت ان کے حصے میں آئی اور اپنے ہم وطنوں کے درمیان آج بھی انتہائی نیچ اور گھٹیا سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں اگر ہم میر جعفر، میر صادق کا نام لیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر اُس کی پینشن لگی تو اس کی اولاد کو پینشن دینے کی خاطر جب بلایا جاتا تو سرکاری ہرکارہ آواز لگاتا تھا کہ میر جعفر غدار کی اولاد حاضر ہو اور وہ شرم کے مارے سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے وطن کی خاطر تکالیف جھیلیں، وطن کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کیا لیکن اپنی زندگی میں وطن پر آنچ نہ آنے دی۔ ان ہی عظیم لوگوں میں میر جعفر و میر صادق کے سپہ سالار ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ جیسے قابلِ فخر سپوت شامل ہیں جنھیں آج بھی دُنیا اچھے الفاظ میں یاد کرتی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے، جنھوں نے مشکلات کو تو قبول کیا لیکن وطن کی خاطر مخمل کے بستروں پر سونا گوارا نہ کیا۔ پاکستانی اردو ناولوں میں حب الوطنی کے بہت سے عناصر سامنے آتے ہیں۔ پروفیسر جیلانی کامران نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''کانگرس مسلمانوں کو ان کا الگ وطن دینے پر تیار نہ تھی۔ اور کانگرس کا رویہ

کچھ اس حد تک سخت ہو چکا تھا کہ پاکستان کا لفظ ان کے اعصاب کے لئے
مفید نہ تھا، اور کانگرس کا خیال تھا کہ جو کوئی بھی اس لفظ (پاکستان) کی تائید
کرے گا وہ لوک پرلوک دونوں جہانوں میں دھتکارا جائے گا۔'' (۲۹)

کانگرس کی اس انتہا پسندی اور مخالفت کے باوصف نہ صرف پاکستان کا لفظ مقبولِ عام ہوا بلکہ قیام پاکستان کی منزل بھی مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔

حب الوطنی قومی اتحاد اور سالمیت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہ وطن سے محبت کا احساس ہی ہوتا ہے جو ہمیں اس بات پر ابھارتا ہے کہ ہم اپنے وطن کی ترقی و خوشحالی کے لیے کام کریں۔ یہ وطن کی محبت ہی ہے جو ہماری زندگی میں وطن کے فائدے کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دینے کے لیے ایک طاقتور جذبے کو بیدار کرتی ہے۔ اگر کسی ملک کے عوام محبّ وطن ہیں تو وہ آپس میں اتحاد سے رہنا پسند کرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اتحاد ان کے وطن کی بہتری کے لیے ہے اور انھیں اس بہتری کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کی مختلف اکائیوں سے، مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایسے کسی بھی نظریے کو قبول نہیں کرتے۔ وہ ان کے ملک کی سالمیت یا قومیت کے خلاف کسی بھی غیر ملک کے پروپیگنڈہ سے کسی بھی طور متاثر نہیں ہوتے۔ درحقیقت حب الوطنی ایک عظیم طاقت ہے جو کہ عوام کو آپس میں ایک قوم کے طور پر متحد رکھتی ہے۔

حب الوطنی ایک محرک بھی ہے۔ حب الوطنی کا جذبہ اپنے ملک و قوم کے لیے محنت پر اکساتا ہے۔ یہ محبّ وطن لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی ترقی کے لیے مل جل کر کام کریں۔ ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں لگن سے کام کریں تو ان کا قومی فرض ادا ہوتا ہے۔ مزدور محنت کش کی مختلف صنعتوں میں مصنوعات تیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ زیادہ محنت کر کے اور زیادہ وقت لگا کر وہ زیادہ مقدار میں مصنوعات تیار کر سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ان کی اپنی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ قومی پیداوار بھی بڑھتی ہے۔ کسان اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اجناس کی پیداوار کو بڑھانے کا ہر ممکنہ جائز طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو کاروبار سے منسلک ہیں وہ ذخیرہ اندوزی یا ناجائز طریقے اختیار کیے بغیر ایماندارانہ طریقے سے اشیاء کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ طلباء محنت و لگن سے علم حاصل کرتے ہیں اور اساتذہ اپنی ممکنہ لیاقت و استعداد کے مطابق درس و تدریس کے کام

میں مصروف رہتے ہیں۔ المختصر مختلف پیشوں اور تجارت سے منسلکہ لوگ معاشرے کے دوسرے افراد اور ملک کے فائدے کے لیے اتنی ہی محنت سے کام کرتے ہیں جتنا کہ اپنے فائدے کے لیے۔ حب الوطنی کا جذبہ انھیں بڑی حد تک انھیں اپنے کام کے ساتھ بے لوث و بے غرض کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ رقم اور پیسہ کمانے کے لیے کام کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ملک کو خوشحال اور مضبوط بناتے ہیں۔

حب الوطنی کا جذبہ ایک قوم کو متحد رہ کر اور بہادری سے بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔ یہ جذبہ ملک کو درپیش خطرات کی موجودگی میں اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار کرتا ہے۔ نوجوان مسلح افواج یا رضا کاروں کی جماعت میں شمولیت اختیار کرتے ہیں اور یہ کام بڑی تعداد میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ہوتا ہے۔ اچھا کمانے والے اور امیر لوگ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق قومی یا دفاعی فنڈ میں امدادی رقوم جمع کراتے ہیں۔ اگر حکومت جنگ کے خطرے کے پیش نظر عوام پر کچھ نئے ٹیکس لاگو کرتی ہے تو عوام ان کی ادائیگی کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ جب حقیقتاً جنگ شروع ہو جاتی ہے تو تمام مسلح عوام مسلح افواج کی جنگ کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ ہر قسم کا تعاون کرتے ہیں۔ یہی عوام ان کی ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکات وسکنات میں، خوراک اور جنگ سے متعلقہ سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہچانے میں تمام ممکنہ سہولیات مہیا کرتے ہیں۔

وطن سے محبت، اپنے ایک ملک وسرزمین سے قلبی لگاؤ اور دیرینہ تعلق فطری امر ہے۔ جس طرح ماں باپ، بھائی بہن اور اولاد کی محبت فطری اور طبعی ہوتی ہے، اسی طرح وطن کی محبت بلا تکلف ہوا کرتی ہے۔ جس سرزمین پر انسان اپنی آنکھیں کھولتا ہے، نشونما پاتا ہے، عنفوان شباب کو پہنچتا ہے، شادی بیاہ کرتا ہے، ملازمت وتجارت کرتا ہے، اس کی یادیں کچھ ایسی ہوتی ہیں، جن کو وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ وہ کیسے بھول سکتا ہے اس سرزمین کو، جس میں وہ اپنے آباد واجداد، ماں باپ، بھائی بہن اور دوست احباب کے ساتھ رہائش پذیر رہا ہو۔

وطن پرستی یہ ہے کہ وطن کے لیے اپنی دانست میں جو صحیح ہو، وہ کیا جائے چاہے وہ حرام اور اللہ کے قوانین کے خلاف ہو۔ یہ سوچ دراصل قوم پرستی یا وطن پرستی ہے، حب الوطنی نہیں۔ اس لیے اپنی محبت کا معیار صرف اور صرف اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کو مدنظر رکھ کر ہونا چاہیے۔ وطن عزیز کو اللہ کے نام اور اس کے احکام کے نفاذ کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ اس لیے اس سے محبت اور اس کی حفاظت ہمارا اولین فرض ہے مگر تصور کو بھی ہمیشہ ذہن میں رکھنا

چاہیے کہ معیار حق اللہ رب العالمین کا حکم ہے۔علامہ محمد اقبال وطن پرستی کے بجائے مسلم قومیت کے حامی تھے۔ان کا تصور قومیت اسلامی معتقدات پر مشتمل ہے۔

وطنیت کے بارے میں علامہ اقبال بہت واضح مفہوم کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے تھے۔انہوں نے اس سلسلے میں جب آفاقیت کا تصور پیش کیا تو ان دنوں ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔وہ اپنی نظم وطنیت کے ایک بند میں کہتے ہیں۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی　　رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہر ترکِ وطن صورتِ محبوب الٰہی　　دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے　　ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے　(۳۰)

یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی دلی اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں نیرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب ہوگئی۔اگر بعض علماء مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن اس تصور کے ساتھ یکجا رہ سکتے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال وطنیت کے مغربی تصور کے مخالف ہیں اور یہ مخالفت اس وجہ سے ہے کہ نظریہ براہ راست اسلامی عقائد و تصورات سے متصادم ہوتا ہے۔علامہ اقبال کا تصورِ قومیت ہی اصل میں پاکستان کی بنیاد ہے۔وہ ایسے خطہ کے حامی تھے جس میں مسلمان اکثریتی علاقے مل کر ایک ملک بنائیں۔اس حوالے سے مولانا حسین احمد مدنی سے ان کا مکالمہ اور اشعار تو مشہور زمانہ ہیں۔اس تمہید کا مقصد یہ تھا کہ ہم نئی نسل کے ذہن میں اس ملک کے حصول کا اصل مقصد بیان کریں اور اسے وطن پرستی سے نکال کر امت مسلمہ کے تصور کی طرف لائیں اور بتائیں کہ حب الوطنی فطرت ہے مگر کسی ایسی بنیاد پر اپنے ملک یا قوم کے حق اور محبت میں مبتلا ہونا کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام سے ٹکرائے، وہ غلط ہے۔یہ ملک لاکھوں لوگوں کی قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہوا۔وہ قربانیاں ہمارے آباؤ اجداد نے صرف اور صرف پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر دی تھیں۔

یہ نعرہ انھیں اس بات کا یقین دلاتا تھا کہ اگر اس راہ میں کٹ گئے تو یہ قربانی اللہ کے ہاں مقبول ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی اور بنیاد پر آزادی کی بات کی جاتی تو شاید اتنی بڑی تعداد میں لوگ قربانیاں دیتے نہ خطے کے مسلمان یکجا ہوتے۔ اقوام عالم میں پاکستان کی انفرادیت اسی بنیاد پر ہے کہ اس کا قیام خالصتاً نظریاتی بنیاد اور اسلامی قومیت کی بنیاد پر عمل میں آیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے تحریک پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ کو بڑے سادہ مگر تاریخی حقیقت پر مبنی انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ پاکستان کس بنیاد پر وجود میں آیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے تحریک پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ کو بڑے سادہ مگر تاریخی حقیقت پر مبنی انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ پاکستان کی بنیاد اسی روز پڑ گئی تھی جس دن برصغیر کی سرزمین پر پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ آج ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ کیا اس ملک کا حصول اس لیے تھا کہ نوجوان نسل بھارتی گانوں کی دھن پر گلیوں بازاروں میں رقص کرتی پھرے؟ ایوان سیاست میں بیٹھے سیاست دان اسلامی نظام کے نفاذ کی کوشش نہ کریں، یہاں کرپشن، کمیشن، چوری، رشوت ستانی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو؟ وہ مائیں جن کی عزتیں نیلام ہوئیں، وہ بہنیں جن کی عصمتیں پامال ہوئیں، وہ بھائی جو سولی پر لٹکے، وہ شیر خوار بچے جن کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ کیا ان سب نے اس لیے قربانیاں دیں؟ نہیں ہرگز نہیں، یہ سب قربانیاں صرف اور صرف اس لیے تھیں کہ ایک ایسا ملک وجود میں آئے جہاں امن ہو، خوشحالی ہو، جہاں نیکی کرنا آسان اور برائی کرنا مشکل ہو، جہاں عدل ہو، انصاف ہو، جہاں اخوت و بھائی چارہ ہو، جہاں انسان انسان کا دشمن نہیں خیر خواہ ہو، جہاں امیر غریب سب برابر ہوں۔ ایک ایسے پاکستان اور ایک ایسے آئیڈیل خطے کے لیے لوگوں نے قربانیاں دیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم آگے بڑھ کر اپنے ملک کی تعمیر میں کردار ادا کریں۔ اس کا حقیقی مقصد نئی نسل کو بتائیں، جو صرف چند جھنڈیاں لگانے اور بائیک کا سائلنسر نکال کر خوشی کا اظہار کرنے کو ہی آزادی سمجھتی ہے۔ اس نسل کو مثبت سمت میں لگانا اور مقصد وجود سے آگاہ کرنا میرا اور آپ کا فرض ہے۔ سب مل کر وطن عزیز کی تعمیر میں حصہ لیں اور ہر میدان میں اس کے نام کو روشن کریں۔ اپنے ووٹ کی طاقت سے ان افراد کو اس ملک کی قیادت سونپیں جو اس ملک کو حقیقی معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست بنائیں اور قیام پاکستان کے مقصد کو پورا کریں۔

ج۔ حب الوطنی اور اَدب

شاعر اور ادیب چونکہ معاشرے کا حساس ترین طبقہ ہوتے ہیں اس لیے وہ زمان و مکان اور سرزمین و علاقہ

سے زیادہ منسلک ہوتے ہیں۔ ادیب اور شاعر اپنے وطن کے مظاہر سے اثر حاصل کرتے ہیں اور اس کا اظہار ادب پاروں میں کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ادیب کیفیات جذب کرنے کے حوالے سے بھی ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں اور ان کو ان کیفیات کے اظہار کے لیے الفاظ و تراکیب اور زبان کے ذرائع بھی میسر ہوتے ہیں۔ حب الوطنی کے اظہار کے لیے کون سی اصناف ادب بہتر ہیں یہ بات وثوق اور یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ کیوں کہ تمام اصناف ادب یعنی اصناف سخن اور اصناف شعر میں حب الوطنی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سخن کی اصناف مثلاً حمد، نعت، مثنوی اور نظم وغیرہ میں بھی حب الوطنی کے عناصر بکثرت پائے جاتے ہیں۔

اصناف نثر میں حب الوطنی کے اظہار کے لیے اجمال کی بجائے تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا کالم، مضمون، خط، روئیداد اور ڈرامے کی نسبت سفرنامے اور ناول میں حب الوطنی کا اظہار بکثرت کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔ اس تحقیق کا موضوع چونکہ پاکستانی اردو ناول ہے اس لیے ناول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہی حب الوطنی کے عناصر پر بحث ہوگی۔ ناول میں حب الوطنی کے اظہار کا جائزہ لینے کے لیے ناول کے ماحول اسلوب، زبان، واقعات اور کرداروں کے مکالموں کا مشاہدہ ضروری ہے۔

ادب کی علاقے، زمین اور انسان کی بود و باش سے جُڑت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب دراصل انسانی احساسات و جذبات کا ہی مظہر ہے۔ انسان کے زمین سے رشتے نے ہی آسمان کے تصور کو واضح کیا ہے۔ ادب کسی بھی علاقے کا ہو یا کسی زبان کا ہو، زمین کے تذکرے کے بغیر بات نہیں بنتی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ادب میں استعمال ہونے والے تمام استعارے، تشبیہات اور علامات عموماً مادی ہیں جن کی توضیح اور تشریح ہی ادب کا مطمع نظر ہے۔

وطن کے بارے میں ایک بات سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ مختلف اوقات وطن کی حدود قیود بدلتی رہتی ہیں اس کی وجوہات مختلف ہوسکتی ہیں۔ نئے ملکوں اور انتظامی اکائیوں کی تشکیل اور ہجرت کے علاوہ دیگر کئی محرکات وطن کی مخصوص اکائیوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ وطن کی تشکیل اور تفہیم انسان کے عقائد پر بھی منحصر ہوتی ہے۔

حب الوطنی اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دنیا کے کسی بھی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں حب الوطنی کے عناصر موجود ہیں اور چونکہ ادیب معاشرے کا بہت ہی حساس طبقہ ہوتا ہے لہٰذا وہ وطن سے

محبت کا اظہار مختلف ادبی اصناف میں کرتے ہیں۔ آیئے اب عالمی ادب میں سے حب الوطنی کی چند مثالیں دیکھتے ہیں:

فارسی زبان وادب کے مشہور شاعر حداد کاشانی اپنی کتاب شرارہ عشق میں وطن سے محبت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''سر زمنیت گرفتہ روزی بہ دست اجنبی
سرزمین مگذار بستان سرزمین خویش را'' (۳۱)

ترجمہ: تیری زمین پر آج غیروں نے قبضہ کر رکھا ہے اپنی اس سرزمین اور اس وطن کے باغ کو آزاد کرانے کی کوشش کر۔

اب عربی زبان وادب سے حب الوطنی کی ایک مثال دیکھتے ہیں۔ مصر کے مشہور شاعر احمد شوقی وطن سے محبت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''کن الی الموت علی حب الوطن
من یکن او کانہ یوما یخن'' (۳۲)

ترجمہ: مرتے دم تک وطن سے محبت کرتے ہیں جس نے اپنے وطن سے خیانت کی، ایک دن اس سے بھی خیانت کی جائے گی۔

حب الوطنی کے لیے انگریزی زبان میں مترادف لفظ Patriotism ہے جس کے معانی وطن سے محبت کرنا ہے، وطن سے وفا کرنا ہے۔ انگریزی ادب میں حب الوطنی کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

To realize that patriotism is not enough, I must have no hatred or bitteriness towords any one.

ترجمہ: ''حب الوطنی کا مطلب وطن سے محبت کرنا ہے۔ وطن سے محبت ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم وطن میں رہنے والے کسی بھی شخص سے نفرت نہ کریں اور کسی کے بارے میں تلخ انداز میں نہ سوچیں۔'' (۳۳)

دنیا کے کسی بھی ادب کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر ادب میں حب الوطنی کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں۔ وطن سے محبت کا جذبہ ہے جو انسان کی سرشت میں شامل ہوتا ہے۔ اچھے، برے لوگ ہر معاشرے اور ملک میں موجود ہوتے ہیں۔ حب الوطن بھی ہوتے ہیں اور غدار بھی۔ تاہم غداروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور محبّ وطن لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ادب میں حب الوطنی کے اظہار کے لیے مختلف اصناف ادب کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کبھی شاعری کی شکل میں تو کبھی نثر کی صورت میں، کبھی افسانے میں تو کبھی ناول میں۔ غرض کہ ادیب وطن سے محبت کا اظہار ہر صنف ادب میں کرتا ہے۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر پایا جاتا ہے۔

اردو زبان گنگا جمنی تہذیب کی ضمانت دار، اتحاد و اتفاق کی پیامبر، پیار محبت کی علامت اور نشانی ہے۔ پورے ہندوستان کو اردو زبان متحد کرتی ہے، ہر خطہ اور ہر علاقے میں الگ الگ بولیاں بولی جاتی ہیں، مختلف افراد مختلف الفاظ کا تلفظ کرتے ہیں۔ ملیالم، تیلگو، بنگلہ، پشتو، کھڑی بولی کچھ میل کی مسافت طے ہوتے ہی الفاظ نامانوس اور عجیب وغریب معلوم ہوتے ہیں۔ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے کسی پرندہ کی چہچہاہٹ اور کسی درندہ کی غراہٹ ہمارے کانوں میں پڑے مگر مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں آپاتا، یہی حالت ملک کے افراد کی ہوتی ہے جب وہ ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔ اب ان حالات کا جائزہ لیجیے جب ملک میں انگریز کا تسلط قائم ہو چکا تھا، ظلم و جبر، تشدد و استبداد کی تاریخ رقم کی جارہی تھی، حالات و واقعات سے غم واندوہ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، آگ میں جلتے افراد، پھانسی کے پھندوں پر جھولتے انسان گولیوں کا نشانہ بنتے، ملک کے معصوم باشندے ظالم قوم ہندوستانیوں کو شکستہ کر رہی تھی، ان کے حوصلے کو توڑ رہی تھی، ان کے ارادوں کو مستحکم نہیں ہونا دینا چاہتی تھی، ان کے بکھرے وجود کو متحد نہیں ہونے دینا چاہتی تھی، انھیں ذلت اور قید و بند میں رکھنے کا اس سے بہتر وعمدہ ہتھیار کیا ہوسکتا تھا کہ ان میں افتراق و انتشار کے پودے کی آبیاری کی جائے۔ اسی طریقۂ کار پر انگریز آگے بڑھ رہا تھا، اپنوں کی غداری ان کے قافلہ کو رفتار بخش رہی تھی، اب ضرورت آن پڑی تھی ایک ایسے ذریعہ کی جو تمام اہل وطن کو اتحاد کے حسین زیور سے آراستہ کر دے، ان کے قلوب میں سرد پڑے جذبۂ حب الوطنی کو شعلہ جوالہ بنا دے، جو خرمن باطل کو جلا کر خاک کر ڈالے،

انگریزوں کو ندامت وشرمندگی سے دوچار کردے۔ ظاہر ہے کہ اتحاد اسی وقت ممکن ہے جب ہم ایک دوسرے کے جذبات واحساسات اور تاثرات کو سمجھ سکتے ہیں، سن سکتے ہوں، محسوس کر سکتے ہوں، اس کے لیے ضرورت تھی ایک ایسی ہندوستانی زبان کی جس سے ملک کا ہر فرد مانوس ہو، اپنے احساسات کو اس زبان کے الفاظ میں پرو سکتا ہو۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ یہ صلاحیت سنسکرت کے اندر موجود نہیں تھی، وہ چند ہندو مذہبی خانوادوں تک سمٹ کر رہی گئی تھی، فارسی سے بھی یہ کام لیا جانا ناممکن تھا، مغلوں کے زوال نے اس پر مردنی طاری کردی تھی، انگلش کا تو تصور ہی محال تھا۔ جو قوم گوری چمڑی والوں کی مشق ستم بنی ہوئی ہو بھلا کیسے ان کی زبان پر متحد ہو سکتی ہے۔ اب صرف اردو زبان ہی باقی تھی جس نے ریختہ سے اردوئے معلیٰ تک کا سفر مختصر عرصہ میں طے کیا تھا۔ ملک کا ہر باشندہ اس زبان میں اپنے تاثرات پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اسے سمجھ سکتا تھا۔ چنانچہ پنجاب کے مشہور اردو اخبار زمیندار کا حال یہ تھا کہ لوگ اسے ایک پیسے میں خریدتے اور دو پیسے دے کر اس کے مضامین وخبریں سنتے اور ملکی احوال سے باخبر ہوتے تھے۔

چنانچہ دانشوران قوم نے ملکی احوال کو دیکھتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھ لیا اور اخبارات ورسائل کے ذریعہ لوگوں کے جذبات میں زندگی پیدا کرنے اور ان کو جنگ آزادی پر متحد کرنے اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار کرنے کی کامیاب سعی کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بصیرت افروز مضامین نے امت کو نئی زندگی عطا کی اور ''الہلال''، ''البلاغ'' سے لے کر مولانا حسرت موہانی کے ''اردوئے معلیٰ'' ظفر علی خان کے ''زمیندار'' کا تاریخی وکامیاب سفر اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ آزادی میں اردو زبان کا کتنا بڑا کردار ہے۔ اب تمام افراد متحد ہو رہے تھے، انھیں ضرورت تھی ایک نعرہ کی جو ان کے لہو کو گرما دے، جذبات کو مشتعل کردے، وہ نعرہ بھی انھیں اردو زبان نے ''انقلاب زندہ باد'' کی شکل میں عنایت کیا۔ یہ نعرہ باطل کے خلاف ہتھیار بنا، اس نعرہ نے خاص وعام پر یکساں اثر کیا، ہر مذہب کا پیرو اس نعرہ کو لگاتے ہوئے انگریزوں سے بھڑ جاتا اور جام شہادت نوش کر لیتا کیونکہ انسانی مزاج اس کی بات کا عکاس ہے کہ نظم انھیں نثر کے مقابلہ میں زیادہ متاثر کرتی ہے۔ اشعار کا اختصار اور مٹھاس ان کے من کو موہ لیتا ہے کانوں پر بار محسوس نہیں ہوتا، تکلیف میں سکون کے احساسات کا پروردہ ہوتا ہے۔ اس ضرورت اور وقت کے تقاضہ کو بھی اردو شاعری نے پورا کیا اور وطن پر مٹنے اور جان نچھاور کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ ملک سے محبت کو ماحول میں رچا دیا۔ اردو

شاعری نے اعلان کیا کہ جتنی تکالیف اور اذیتیں انگریز ہندوؤں کو دے گا، جتنے ظلم کے پہاڑ ان پر توڑے جائیں گے، جتنی ہولناک اور سخت سزاؤں کا ان پر ارتکاب کیا، اتنی ہی وطن کی محبت ان کے قلوب میں راسخ ہوتی جائے گی۔

یہ جذبہ ہر ہندوستانی کے دل میں پیدا ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھیں سوروں کی کھالوں تک میں بند کر کے نذر آتش کیا گیا، ان کے جسم کا ریشہ ریشہ جل کر بھسم ہو گیا مگر وطن کی محبت ان کے قلب سے جدا نہ ہو سکی، وہ اس انتظار میں نہیں بیٹھے رہے کہ انقلاب آسمان سے اترے گا یا انقلاب کوئی فرشتہ ہوگا، جو سرزمین ہند پر آئے گا بلکہ انھیں اردو شاعری نے یہ حوصلہ اور سلیقہ بخشا کہ انھوں نے وہ انقلاب برپا کیا جسے تاریخ انسانیت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور وہ تاریخ کا سنہرا دور ہے۔

اردو ادب میں حب الوطنی کی جھلک جا بجا دیکھی جا سکتی ہے۔ اردو زبان کی مآخذ سرزمین برصغیر ہے اور اس سرزمین کا موسم، بود و باش، تہذیب و تمدن اور رہن سہن دیگر تمام علاقوں سے مختلف ہے۔ اس کی تاریخ ہر مذہب کے عظیم پیروکاروں، یادریوں، رہنماؤں اور عظیم لوگوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کا اپنے وطن سے دلی لگاؤ رکھنا ایک فطری امر ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے اپنے وطن سے محبت کا بکثرت اظہار کیا ہے۔ برصغیر کے اسی خطے میں وادی جنت نظیر کشمیر بھی واقع ہے۔ جس کے فطری حسن نے ادباء کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ دوچند کر دیا ہے۔ کشمیر اور وطن کی اصطلاحات اس علاقے میں یوں مدغم ہو کر رہ گئی ہیں کہ وطن کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ اپنا وطن ہی کشمیر ہے۔

اردو ادب میں حب الوطنی کی بنیاد رکھنے میں شاعر ہفت زبان امیر خسرو نے بنیادی اور کلیدی کردار ادا کیا۔ دکن میں اردو کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ دکنی مثنویات میں رزمیہ، عشقیہ، اخلاقی، فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین بیان کیے گئے۔ ملا وجہی اپنی ایک مثنوی میں حب الوطنی کا اظہار یوں کرتا ہے:

''دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں　　پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ، انگوٹھی ہے جگ　　انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ'' (۳۴)

اس دور میں بھی ادباء اپنے اشعار میں اپنے وطن سے محبت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ ملا وجہی نے اپنے دیس دکن کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ ہمارے دکن جیسا خوبصورت علاقہ دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ بہت

خوبصورت علاقہ ہے اور یہ سب علاقوں کا بادشاہ ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں بھی وطن سے محبت کا اظہار ملتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کا ملک ہمیشہ آباد اور خوش حال رہے اور وہ اپنے ملک کی ترقی و خوشحالی کی دعائیں مانگتا نظر آتا ہے۔

قلی قطب شاہ اپنے وطن سے محبت کا اظہار کچھ اس طرح کرتا ہے:

''جو کوئی یاد کرتا نئیں اپنا وطن　　　او مردا ہے پیرہن ہے اس کا کفن

اگر کوئی غربت میں شاہی کرے　　　اگر مال ہور ملک لاکھاں دھرے'' (۳۵)

دکنی شعرا اپنے کلام میں اپنے علاقے کی سیاسی صورت حال کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ یہ موضوعات رزم ناموں میں دکن کی سیاسی تاریخ کے چند خاص ادوار بھی بیان کیے گئے ہیں۔ حسن شوقی کا رزم نامہ، فتح نامہ نظام شاہ ہے جو مثنوی کی طرز پر لکھا گیا تھا اور اس کے واقعات مشہور جنگ تالیکوٹ ۱۵۶۴ء کی فتح کے بارے میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ جنگ وجے نگر راجہ رام راج اور ابراہیم قطب شاہ، علی عادل شاہ اول حسین نظام شاہ اور برید شاہ کی متحدہ افواج کے درمیان ہوئی تھی۔ رام راج اس جنگ میں ہار گیا تھا اور وجے نگر کی سلطنت اپنے اختتام کو پہنچی۔ حسن شوقی اپنے مربی حسین نظام شاہ کو تالیکوٹ کا فاتح قرار دیتا ہے۔ پھر وہ مختلف ملکوں کے نام اور افراد کا ذکر کرتا ہے۔ اور ہر ملک کی خاص خاص خوبیاں اور اوصاف بیان کرنے کے بعد اپنے ملک دکن کو سب سے افضل اور خوبصورت قرار دیتا ہے۔

''سو افضل میانا ہے ملک دکن

ہوئے یاں کے شایاں جتے خوش لکھن'' (۳۶)

وطن سے محبت کے ساتھ ساتھ سلاطین دہلی کی تعریف و توصیف اور ان کے آپس میں متحد ہو کر رام راج سے جنگ کرنے کا عہد و بیان بھی نظر آتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف رام راج کے دربار کے مناظر اس کی جنگی تیاریوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس مثنوی کے واقعات تاریخی اعتبار سے اس دور کی مستند تاریخوں کے ساتھ ملتے ہیں۔ اور کچھ ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو تاریخ کی کتب میں موجود نہیں ہیں۔

دکنی دور کا ایک مشہور شاعر جس کا نام ضعیفی تھا۔ اس کی ایک مثنوی میں اورنگ زیب کی مدح کے

ساتھ ساتھ وطن سے محبت کے جذبات بھی روایتی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

''یہ دور جہاں دار اور رنگ زیب کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب

دیا سر پو جو پن شہی کا وہ تاج دلی ہور دکن کا ہوا ایک راج''(۳۷)

اسی دور کا ایک اور شاعر عبدالرحمٰن قادری ہے۔اس نے اپنی ایک مثنوی ''باغ حسینی'' میں بیجاپور شہر کا ایک الم خیز مرثیہ لکھا ہے جس میں حب وطن کے جذبے کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب کی مذمت بھی نظر آتی ہے۔

''جو اس وقت میں تھا بیجاپور شہر سو اس شہر کی تھی جہاں میں خبر

خدا کے فضل سوں وہ معمور تھا اسی کے کرم سوں وہ منصور تھا''(۳۸)

شمالی ہند کا آخری اہم شاعر ولی ہے۔وہ دور انتشار کا تھا۔اس دور کے اکثر شعرا، بحری، آزاد، فراقی، وحدی، نوری، امامی وغیرہ مسلسل سفر میں رہے۔ ولی اپنے دور کا جمال دوست شاعر تھا اس کی زیادہ زندگی سیر و تفریح میں گزری اسی وجہ سے اس کی شاعری میں عشق محبوب اور حسن و محبت کے موضوعات ملتے ہیں۔تاہم ولی بھی اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا دلی کا اصل وطن اورنگ آباد تھا۔اورنگ زیب کے پے در پے حملوں کی وجہ سے ولی کو تحصیل علم کے لیے گجرات کا سفر اختیار کرنا پڑا۔اور یہاں پر ولی نے بہت وقت گزارا۔وہ دور ولی کا عنفوان شباب کا دور تھا۔گجرات کے فراق میں ولی جو غزل لکھی اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

''گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل بے سینے منے آتش بہار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں پھر اس کے دیکھنے کا ہے امید وار دل''(۳۹)

د۔قیام پاکستان سے قبل اردو ناول میں حب الوطنی کی روایت

قیام پاکستان سے قبل مختلف اوقات وادوار میں برصیغر کی سرزمین ہند کے نام سے موسوم تھی۔ ہند کی یہ سرزمین جس کو مختلف اوقات میں برصیغر ہند اور ہندوستان کے ناموں سے پکارا گیا۔تاریخ کے کئی ادوار میں ایک جغرافیائی اور انتظامی وحدت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ہند آریائی زبانوں کے بولے جانے کے باعث اور پھر بعدازاں انہی زبانوں کے خمیر سے اردو زبان کی پیدائش کے باعث یہاں کے رہنے والے کافی حد تک جغرافیائی

وحدت کے علاوہ لسانی وحدت میں بھی منسلک تھے۔

ہندوستان سے محبت کا اظہار اردو ادب کے تمام شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف میں جا بجا نظر آتا ہے۔ چونکہ ہمارا موضوع بالخصوص اردو ناول کے بارے میں ہے۔لہذا اس سلسلے میں قیام پاکستان سے قبل اردو ناول میں حب الوطنی کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔مولوی نذیر احمد اردو کے اوّلین ناول نگار ہیں ان کے ناول ا۔مراۃ العروس (۱۸۶۹)،۲۔بنات النعش (۱۸۷۲)،۳۔توبتہ النصوح (۱۸۷۴)،۴۔ابن الوقت (۱۸۸۸) وجہ شہرت بنے۔

مولوی نذیر احمد نہ صرف سرسید احمد خان کے ہم عصر تھے بلکہ ان کا شمار سرسید احمد خان کے رفقائے کار میں ہوتا تھا۔ان کے لکھے ہوئے تمام ناولوں میں جنگ آزادی انیسویں ،صدی میں برپا ہونے والے سیاسی انقلابات اور واقعات کے زیر اثر حب الوطنی کے عناصر موجود ہیں۔نذیر احمد کی زندگی میں ہی ہندوستان پر برطانوی راج مستحکم ہوا اور برصغیر کے جاگیرداروں نے روایتی اور مقامی طرز زیست کے برعکس انگریزی روایات کو اپنانا شروع کیا۔مگر ان تمام حالات کے اثرات کے باوجود حب الوطنی کا پہلو کم نہ ہوا۔نذیر احمد کے ناول ابن الوقت میں اگرچہ ابن الوقت کا کردار حب الوطنی کے اثرات سے متصادم ہے مگر پھر بھی ابن الوقت کی مجموعی فضا کے علاوہ ناول کا اختتام حب الوطنی پر مبنی نتائج کا حامل ہے۔اس سے پہلے کہ ابن الوقت میں مولوی نذیر احمد کی حب الوطنی کا تذکرہ کیا جائے۔یہ ضروری ہے کہ ابن الوقت کے ان خیالات کا ایک اقتباس بھی پیش کیا جائے۔جو وہ اہل یورپ کی تحسین میں ادا کرتا ہے:

> ''اہل یورپ سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت ان علوم میں ہے۔جو جدید ایجاد ہوئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں اور جن علوم کے ذریعے سے انہوں نے ریل اور تار برقی اور ایٹم اور ہزار ہا قسم کی بکار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں اور بنائے چلے جاتے ہیں.....سلطنت ان کے کمالات کی قیمت نہیں ہے بلکہ ارکھن میں ہے۔اور ان کا حق لازمی ہے۔''(۴۰)

ابن الوقت کے نام سے ہی یہ ظاہر ہے کہ وہ ابن الوقتی سے کام لیتے ہوئے اپنی حب الوطنی کے جذبے کو ایک طرف رکھ کے بدیسی تہذیب وتمدّن کی ترویج کے لیے کوشاں ہے۔اس لیے وہ اہل یورپ کی عظمت سلطنت ان

کے علوم کی جدت، ان کے صنعت وحرفت اوران کے کمالات کے گیت گاتا ہوانظر آتا ہے۔مگر ابن الوقت کے یہ الفاظ مقامی افراد کے خیالات نظریات سے مماثل نہیں ہیں۔انگریز کی شاہانہ عظمت اور سطوت سے مرعوب ہونے کے باوجود بھی مقامی افراد میں حب الوطنی کا ایک عنصر موجود ہے۔نذیر احمد ابن الوقت میں حب الوطنی کے تصورات کا اظہار کرنے کے لیے حجتہ الاسلام کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔حجتہ الاسلام دراصل ابن الوقت کے کردار کا متضاد ہے۔اور دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے۔کہ وہ دین اسلام سے لگاؤ اور حب الوطنی کے اظہار کا نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے انگریز سرکار کے کلچر اور تہذیب تمدّن سے دشمنی ہے۔اپنے ان افکار کا اظہار حجتہ الاسلام یوں کرتا ہے:

''میں اس علاقے کے تمام ڈپٹی کلکٹروں میں ان کو دل سے پسند کرتا ہوں۔اس طرف (بنگال میں) سرکاری محکموں میں جھڑا بنگالی بابو ہیں۔انگریزی پڑھ کر یہ لوگ ایسے زبان دراز اور گستاخ اور بے ادب اور شوخ ہو گئے ہیں کہ سرکاری انتظام پر سختی سے نکتہ چینی کرتے ہیں اگر کہیں ان لوگوں میں ہندوستان کے بلند حصوں کی طرح دلی جرات اور دلیری بھی ہوتی تو انہوں نے انگریزی حکومت کو اپنی گردنوں سے کبھی کا اتار پھینک دیا ہوتا۔'' (۴۱)

نذیر احمد کے ناولوں میں عصری حالات وواقعات کا جس طرح اظہار کیا گیا ہے۔اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک جانب تو انگریز سرکار کے تسلط کے باعث برصغیر کی مقامی تہذیب مغلوب ہوتی دکھائی دے رہی تھی مگر دوسری جانب یہاں کے عوام میں حب الوطنی کی ایک لہر بھی موجود تھی۔جس پر مندرجہ ذیل اثرات غالب تھے۔

ا۔اسلامی اور مذہبی رنگ ب۔مقامیت۔ ج۔اردو اور دیگر علاقائی زبانیں

د۔برصغیر کا علاقائی تمدّن ر۔بدیسی حکومت سے نفرت۔ ز۔وطنیت کا جذبہ

جب حب الوطنی کی بات کی جاتی ہے تو اس سے ظاہری میری طور پر تو یہی مراد لی جاتی ہے کہ اس سے مراد وطن کی محبت کا ایک ایسا جذبہ ہے۔جس کا اظہار ناول کے کسی کردار کے مکالمے یا عمل سے ظاہر ہو۔مگر حقیقت یہ ہے کہ حب الوطنی کا جذبہ بہت سے جزوی اور ذیلی نکات پر مشتمل ہوتا ہے۔حب الوطنی کے جذبے کا ناول میں اظہار

صرف اور صرف کسی کردار کے مکالمے یا عمل سے نہیں ہوتا بلکہ ناول کی مجموعی فضا اس کا ماحول اور بالخصوص ناول کا پلاٹ یعنی واقعات کی کڑیاں حب الوطنی کے اظہار کا مظہر ہوتی ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں میں حب الوطنی کا ایک جذبہ مقامی تاریخ، تہذیب وتمدّن سے محبت کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں حب الوطنی کا ایک پہلو یہ بھی کہ کوئی شخص کسی ایسی تہذیب سے نفرت کرے جس تہذیب نے اس کی قومی وعلاقائی کی تہذیب پر مسلط ہونے کی کوشش کی ہو۔ نذیر احمد کی حب الوطنی کا جذبہ درحقیقت مغرب دشمنی کی ایک صورت بھی لیے ہوئے ہے۔ نذیر احمد کی حب الوطنی کے اس جذبے کے بارے میں ڈاکٹر محمد افضال بٹ لکھتے ہیں:

> ''نذیر احمد نے اپنے ہم وطنوں کو زمانے کے اتار چڑھاؤ سے آگاہ کیا ہے۔ وہ انہیں اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ ماضی کے ساتھ بھی تعلق رکھیں اور حال کی ان چیزوں کو بھی قبول کریں۔ جو ان کے لیے مفید اور بامقصد ہیں۔ نذیر احمد مغربیت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ نئے دور اور نئے نظام کی حامیوں کو بھی جانتے ہیں۔ وہ نئے پرانے نظاموں کا تقابل کرتے ہیں۔'' (۴۲)

نذیر احمد کے بعد اردو ناول نگاری میں رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر اور راشد الخیری کے ناولوں کا حب الوطنی کے اظہار کے سلسلے میں تذکرہ کیا جانا ضروری ہے رتن ناتھ سرشار کے کئی ناول مشہور ہوئے۔ جن میں فسانہ آزاد، سیر کسار، کامنی، جام سرشار، خدائی فوجدار اور کڑ ڈھم وغیرہ شامل ہیں۔ سرشار کا سب سے اہم ناول فسانہ آزاد ہے۔ بعض لوگ اس ناول کو داستان اور ناول کے درمیان کی کڑی خیال کرتے ہیں۔ اور کسی حد تک یہ بات اس لیے بھی صحیح ہے کہ ان کے ناولوں میں داستانوں کی طرز کا پھیلاؤ ہے علاوہ ازیں سرشار کے ناولوں کا بنیادی اور مرکزی نقطہ رومان ہے لیکن ان کی رومانوں تحریروں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان میں حب الوطنی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

مرزا محمد ہادی رسوا کا ناول امراء جان ادحقیقت نگاری کے اسلوب میں قلم بند کیا جانے والا ایک منفرد ناول ہے۔ مرزا احمد ہادی رسوا نے اپنے عہد کے کرداروں کی جس انداز میں نفسیاتی تصویر کشی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مرزا نے خانم کے کوٹھے کو ایک طوائف کی علامت کے طور پر استعمال کر کے اپنی فنی بصیرت کا بخوبی مظاہرہ کیا ہے اس

ناول میں اگر چہ حب الوطنی کے واضح عناصر تو دکھائی نہیں دیتے۔مگر کہیں کہیں مختلف کرداروں کے مکالمے وطن کی محبت کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ناول کی ابتداء ہی میں امراء جان ادا کا مکالمہ حب الوطنی کا عنصر لیے ہوئے ہے۔

''باپ دادا کا نام لے کر اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلّہ میں میرا گھر تھا۔میرا مکان پختہ تھا۔آس پاس کچھ کچے مکان، کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں۔رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔کچھ بہشتی کچھ نائی، دھوبی، کمہار، میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلّہ میں اور بھی تھا۔اس مکان کے مالک کا نام دلاور خاں تھا۔''(۴۳)

درج بالا عبارت میں امراؤ جان ادا نے جس طرح اپنی کہانی بیان کی ہے۔اور خود کو آوارہ وطن اور خانما برباد کہا ہے۔اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کو اپنے وطن سے بھی محبت ہے۔اور فیض آباد شہر کے کنارے جس محلے میں اس کا گھر تھا۔اس کی یادوں کے خزانے بھی اس کے قلب و ذہن میں محفوظ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے وطن اور اس سے متعلق چیزوں کو نا صرف یاد کرتی ہے بلکہ اپنے وطن اور خاندان کا سارا ماحول اس کے اعصاب پر طاری رہتا ہے۔

''آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں۔مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں ہے۔چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے۔اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کر دیں۔مجھے پوچھ رہے ہیں جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں۔اماں باورچی خانے میں ہیں۔اتنے میں ابا کو جو دیکھا دوڑ کے لپٹ گئی۔رو رو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔''(۴۴)

امراؤ جان ادا کو اپنے گھر اور والدین سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ وہ بات بات پر اپنے گھر اور والدین کا ذکر کرتی نظر آتی ہے۔یہاں پر وہ حقیقی واقعات کے برعکس اپنے ایک خواب کا ذکر کرتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں موجود ہے۔اور اس کے ابا مٹھائی کا ڈبا لے کر آتے ہیں۔چھوٹا بھائی کھیل رہا ہے۔اماں کچن میں ہیں۔اور پھر وہ اپنے ابا کو رو رو کر اپنے دل کا حال بیان کرتی ہے۔اور یہ واقعہ بھی حب الوطنی کی حقیقی تصویر ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرؔر بہت بڑے ناول نگار تھے۔آپ ۱۸۶۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام مولوی حکیم تفضّل حسین تھا۔ جو عربی اور فارسی پر مہارت رکھنے کے علاوہ بہت اچھے طبیب بھی تھے۔عبدالحلیم شرر نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد کے علاوہ مولوی سید علی حیدر، مولوی محمد حیدر اور مرزا محمد علی سے حاصل کی۔آپ نے ۱۰۲ کتابیں تصنیف کیں۔جس میں ناول اور ڈرامے بھی شامل ہیں۔مشہور ناول درج ذیل ہیں۔

۱۔ فردوس بریں (۱۸۹۹ء) ۲۔ ایام عرب (حصہ دوم) (۱۹۰۰ء)

۳۔ ڈاکو کی دلہن (ایک انگریزی ناول کا ترجمہ) (۱۹۰۰ء)

۴۔ بدرالنساء مصیبت (۱۹۰۱ء) ۵۔ غیب دان دلہن (۱۹۱۱ء)

یہاں پر ہم صرف فردوس بریں پر مختصر بحث کرتے ہیں۔فردوس بریں ۱۸۹۹ میں شائع ہوا۔ یہ ناول عمومی طور پر عشقیہ ناول ہے۔اور بہت دلچسپ ہے۔اور پڑھتے ہوئے کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ چونکہ میرا موضوع ناول میں حب الوطنی ہے۔تو مجھے ناول مکمل طور پر پڑھنے کے بعد صرف ایک جگہ پر وطن سے محبت کا اشارہ ملتا ہے۔حسین اور زمرد کی منگنی ہو چکی ہے۔اور کچھ عرصہ بعد ان کی شادی ہونے والی ہے۔لیکن زمرد، حسین کو حج پر جانے کے لیے ضد کرتی ہے اور دونوں سفر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔راستہ بہت دشوار ہے جس سے تنگ آ کر وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں اور اپنے وطن سے محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

> ''ناگہاں کسی فوری جذبے سے مغلوب ہو کر نازنین نے ایک سانس لی اور باریک اور دلفریب آواز سے پوچھا'' آج کون دن ہے، نوجوان۔(چپکے ہی چپکے کچھ حساب لگا کر) جمعرات: لڑکی۔(حسرت آمیز لہجے میں) تو ہمیں گھر چھوڑے آج پورے آٹھ دن ہوئے (ذرا تامل کر کے) خدا جانے لوگ کیا کیا باتیں کہتے ہوں گے۔اور کیسی کیسی رائیں قائم کی جاتی ہوں گی۔نوجوان۔یہی کہتے ہوں گے کہ حج کے شوق نے ہم سے وطن چھڑا دیا۔''(۴۵)

زمرد اور حسین کو گھر چھوڑے ہوئے آٹھ دن ہو چکے ہیں راستہ بہت دشوار گزار ہے، اور سوچتے ہیں کہ کاش ہم ایسا نہ کرتے اور اپنے وطن سے دور نہ جاتے۔کیونکہ اپنا وطن اور اپنا علاقہ تو جنت ہوتا ہے۔دوسرے علاقوں میں

جا کر انسان ہمیشہ ذلیل وخوار ہوتا ہے، دونوں کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے، اور یہی جذبہ حب الوطنی ہے اور یہ ناول کے آغاز میں نظر آتا ہے۔

رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۶ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم لکھنؤ سے حاصل کی۔ آپ کچھ عرصہ سکول میں استاد رہے۔ اودھ اخبار اور مرسلہ کشمیری میں مضامین لکھے۔ اور خداداد صلاحیت کی وجہ سے ۱۸۷۸ء میں انہیں اودھ اخبار کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ فسانہ آزاد کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوا۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ میں بطور مترجم بھی کام کیا۔ ۱۸۹۵ میں حیدر آباد چلے آئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے ۲۰۰ روپے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس دور میں اخبار دبدبہ آصفیہ کی ادارت بھی کرتے رہے۔ آخر عمر میں شغل شراب نوشی حد سے بڑھ گیا چنانچہ اس عادت نے صحت پر بُرا اثر ڈالا اور ۱۹۰۳ میں لقمہ اجل بنے۔ آپ کی مشہور تصانیف سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، اور فسانہ آزاد شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے الف لیلیٰ کا فصیح و بلیغ اردو زبان میں ترجمہ کیا۔

ان کا ناول فسانہ آزاد بہت مشہور ہوا۔ جس کی چار جلدیں ہیں۔ فسانہ آزاد میں جہاں لکھنؤ کی تہذیب وتمدن کی عکاسی بخوبی ملتی ہے۔ وہاں حب الوطنی کے عناصر بھی نظر آتے ہیں۔ رتن ناتھ شرشار فسانہ آزاد میں ''چہلم'' کی ذیل میں لکھنؤ کے بارے میں ایک شخص کے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''ایک شخص نے آہ سرد کھینچ کر کہا کہ میاں اب وہ لکھنؤ کہاں وہ لوگ کہاں، وہ دل کہاں لکھنؤ کا محرم، رنگیلے پیا جان عالم کے وقت میں دیکھتا تو ارنی گوئے اوج طور بھی غش کر جاتا۔ بانکوں کی شمشیر دو پیکر جب دیکھو میان سے دو انگل باہر کسی نے ذرا تیکھی چتون کی اور انہوں نے کھٹ سے سر دہی کا یہ تلا ہوا ہاتھ چھوڑا۔ بھنڈارا کھل گیا۔ ایک ایک گھنٹوں میں بیس بیس خانہ جنگیوں کی خبر آتی تھی دکاندار جوتیاں چھوڑ چھوڑ کر ٹک جاتے تھے اور وہ دھکم دھکا بھیڑ بھڑ کا ہوتا تھا۔'' (۴۶)

لکھنؤ کی تہذیب، شیعہ تہذیب کا مرکز ومحور تھی۔ سرشار نے اگرچہ لکھنؤ کے چہلم کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر اس چہلم کی تقریبات کے پس پردہ لکھنؤ کی تہذیب سے پیار اور حب الوطنی کا جذبہ ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ رتن ناتھ

سرشار کی حب الوطنی دراصل سنگ وخشت اور مکان ومقام کی حب الوطنی نہیں ہے۔ بلکہ لکھنؤ کی تہذیب اور رسوم و روایات کی حب الوطنی ہے۔جس کے زیر اثر وہ وہاں کے رسوم ورواج سے پیار کرتے ہیں۔

رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے زمان ومکان سے محبت اور رسوم ورواج سے محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ لکھنؤ کے بانکوں اور سجیلوں کے رزق برق لباسوں اوران کی چال ڈھال سے بھی محبت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔فسانہ آزاد کے کردار آزاد کا ایک مکالمہ ملاحظہ ہو:

''واہ رے لکھنؤ۔ان چونچلوں کو تو دیکھئے سرخا سرخ ارغوانی کاغذ جھلکتا اور چمکتا ہوا اور روشنائی کبھی زرنگار رقعہ تہنیت کیا مرقع اور نگ ہے۔کان جواہر کے ہم نگ ہے۔''(۴۷)

اس کے ساتھ ساتھ رتن ناتھ سرشار اپنے ناول فسانہ آزاد میں جو شاعری استعمال کرتے ہیں اس میں بھی حب الوطنی وطن محبت کے احساس کو دوچند کردیتی ہے تو یہ بے جا نہیں ہوگا۔رتن ناتھ سرشار کے تین ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں حب الوطنی کا احساس موجود ہے۔

''محلّہ جو ہے گولہ گنج اک یہاں　　میاں محترم کا وہاں ہے مکاں
یہ امید ہے آپ بھی آیئے　　کرم ہو قدم رنجا فرمایئے ''(۴۸)

رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کی شناخت کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ رتن ناتھ سرشار کی حب الوطنی کی تین جہات ہیں۔زمان ومکان کی محبت،رسوم ورواج کی محبت اور مکینوں کی محبت۔اس سلسلے میں ایک اور اضافہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی بھی ناول نگار کے ناول میں کسی خاص علاقے میں بولی جانے والی زبان سے محبت کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔مگر یہ عنصر باوجود ناول کے کرداروں کے مکالموں سے اظہار نہیں ہو پاتا۔ بلکہ اس مقامی زبان کے الفاظ وتراکیب کا استعمال ہی ناول نگار کی اس مخصوص زبان سے محبت کا مظہر ہوتا ہے۔رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد اور دوسرے ناولوں میں لکھنؤ کی جو مقامی زبان استعمال کی ہے وہ دراصل اس زبان سے ان کی محبت کی آئینہ دار ہے اور سارا ناول اس امر کی بین مثال ہے۔

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔وہ بنارس کے ایک گاؤں لمہی میں ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔ جب آپ کی عمر آٹھ سال تھی تو والدہ کا انتقال ہوگیا۔اور سولہ سال کی عمر میں والد کے سائے سے بھی محروم ہوگئے۔

والد کی وفات سے ایک سال قبل آپ کی شادی کر دی گئی۔ والد کی وفات کے بعد گھر کی تمام ذمہ داریاں آپ کے کندھوں پر پڑ گئیں۔ پہلی ملازمت پانچ روپے ماہوار ٹیوشن کی تھی۔ کھانا خود پکاتے۔ اور ایک وقت کھاتے تاہم جلد ہی انہیں عیسائی مشنری سکول میں اٹھارہ روپے ماہوار کی نوکری مل گئی۔ انگریزوں کی رعونت کی وجہ سے یہ نوکری جلد ہی چھوڑ دی۔ لیکن جلد ہی انہیں ایک سرکاری سکول میں بطور استاد نوکری مل گئی۔ ۱۹۰۲ء تک ان کے مالی حالات کافی بہتر ہو گئے اور آپ کی توجہ لکھنے لکھانے کی طرف مبذول ہو گئی۔ آپ نے ناول اور افسانے لکھے۔ آپ کے ناولوں کے درج ذیل عنوانات ہیں۔

۱۔ ہم خرما و ہم ثواب ۲۔ اسرار معابد ۳۔ جلوہ ایثار ۴۔ بیوہ ۵۔ بازارِ حسن
۶۔ گوشہ عافیت ۷۔ نرملا ۸۔ غبن ۹۔ چوگان ہستی ۱۰۔ پردہ مجاز۔ میدان عمل ۱۲۔ گئودان

منشی پریم چند کے ناول غبن میں کرداروں کی زمان و مکان سے محبت کا عنصر بکثرت موجود ہے، پریم چند کسی مخصوص ماحول علاقے یا وطن کے موسم ایسا احساس اُجاگر کرتے ہیں کہ بڑھنے والا نہ صرف اس ماحول میں ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حب الوطنی کا وہ احساس جو ناول کے کرداروں میں موجود ہے وہ ناول کی تحریر کو پڑھتے پڑھتے قاری کی روح میں سرایت کر گیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کے ناولوں میں موجود حب الوطنی کا احساس صرف بیانیہ احساس نہیں ہے بلکہ محسوساتی بھی ہے۔

چوں کہ ہم نے اردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا اجمالی جائزہ لینا ہے چنانچہ یہاں ہم صرف پریم چند کے مشہور ناول گئودان سے حب الوطنی کے عناصر پر بحث کریں گے۔ یہ ناول ۱۹۳۷ میں شائع ہوا۔ اور بہت مشہور ہوا۔ اس ناول میں غریب اور استحصالی کسان ہوری کے حالات زندگی اور ان کے ساتھ کیا جانے والا ظلم بیان کیا گیا ہے۔ تاہم اس میں وطن سے محبت کے کچھ اشارے بھی ملتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

> ''اب وہ کھیتوں کے بیچ کی پگڈنڈی چھوڑ کر ایک کھیلٹی میں آ گیا تھا۔ جہاں برسات میں پانی بھر جانے کی وجہ سے تری رہتی تھی۔ اور جھڑ میں کچھ ہریالی نظر آتی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کی گائیں یہاں چرنے آیا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی یہاں کی ہوا میں کچھ تازگی اور ٹھنڈ تھی۔ ہوری نے دو تین سانسیں زور سے لیں اس کے دل میں آیا، کچھ دیر یہاں بیٹھ

جائے۔''(۴۹)

گئودان میں وطن سے محبت کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں:

''سمیری اور بداری دونوں اودھ صوبہ کے گاؤں ہیں ضلع کا نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہوری بلاری میں رہتا ہے۔ رائے صاحب، امر پال سنگھ سمیری ہیں دونوں گاؤں میں صرف پانچ میل کا فرق ہے۔ پچھلے دنوں جنگ آزادی میں رائے صاحب نے خوب نام کمایا تھا..... رائے صاحب محبِ وطن ہونے پر بھی حکام سے میل جول بنائے رکھتے تھے۔ ان کی نذریں، ڈالیاں اور ملازمین کی دستوریاں جیسی کی تیسی چلی آتی تھیں۔ ادب وموسیقی کے رسیا تھے۔''(۵۰)

گئودان کے اس پیراگراف میں پریم چند نے حب الوطنی کی ایک نئی جہت آشکار کی ہے۔ وہ یہ کہ کسی بھی شخص کی حب الوطنی جب نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر اور زیر نگین آجاتی ہے تو اس پر مصلحت اور مفاہمت کا ایک خول چڑھ جاتا ہے۔ گئودان کے کرداروں سیمری اور بلاری کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا تعلق کونسل کے ممبر رائے صاحب کے ساتھ کتنا گہرا تھا۔ اور رائے صاحب بھی اپنی تمام تر حب الوطنی کے باوجود انگریز سرکار کی قربت حاصل کرنے کی کاوش میں رہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ رائے صاحب نے اپنی حب الوطنی پر انگریز سرکار کی غلامی کا ایک لیپ چڑھا لیا تھا۔ وہ وطن کی محبت کو ایک جانب رکھ کر ضرورت اور مصلحت کی آڑ میں انگریز حکمرانوں سے اپنے تعلقات بحال رکھنے کی فکر میں رہتے تھے۔ وہ مقامی موسیقی اور ادب کے رسیا تھے۔ مگر یہ مقامیت اور ادبیت یورپ کی جدیدیت سے مغلوب ہوکر رہ گئی تھی۔

پریم چند نے اپنے ناول میں حب الوطنی کی جو تصویر پیش کی ہے۔ یہ تصویر صرف اور صرف سیمری بلاری اور رائے صاحب کا ہی مسئلہ نہ تھا بلکہ اس دور کے تمام جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور وڈیروں کی یہی حالت تھی کہ وہ اپنی تہذیب وتمدن پر تصنّع اور بناوٹ کا غلاف چڑھا کر انگریز حکومت کے کارپرداز افسران اور آلہ کاروں کی کاسہ لیسی میں مگن تھے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے۔ کہ اس قسم کی حب الوطنی پر نظریہ ضرورت غالب آگیا تھا۔ حب الوطنی پر ضروریات اور مصلحت کا غالب آجانا صرف اور صرف جاگیرداروں اور وڈیروں تک محدود نہ تھا بلکہ اکثر صحافی

اخباری نمائندے اور ایڈیٹر بھی اسی رنگ میں رنگے جا رہے تھے۔ اس صحافی تبدیلی کا عکاسی گئودان کے مندرجہ ذیل پیراگراف سے ہوتی ہے۔

''تو آپ کے اخبار میں بدیسی چیزوں کے اشتہار کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے کسی اور کے اخبار میں اتنے بدیسی اشتہار نہیں دیکھے۔ آپ بنتے تو ہیں بڑے اصول پرست مگر اپنے نفع کے لیے دیس کا دھن بدیس بھیجتے ہوئے آپ کو ذرا بھی رنج نہیں ہوتا۔ آپ کسی دلیل سے اپنے اس طرز کو حق بجانب نہیں قرار دے سکتے۔''(۵۱)

یہ عبارت بھی اسی امر کی مظہر ہے کہ محبّ الوطن افراد خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں ان کی حب الوطنی کا احساس مصلحت اور ضرورت کے زیر اثر اپنا رنگ بدل دیتا ہے وہ صحافی اور اخباری مدیر جو حب الوطنی کا راگ الاد پتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی حب الوطنی بھی متغیر شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے اخباروں میں زیادہ منافع کے حصول کے لیے دیسی اشیاء کی بجائے بدیسی اور ولایتی چیزوں کے اشتہارات بکثرت نظر آنے لگتے ہیں اس امر سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حب الوطنی کا رنگ مصلحت اور ضرورت کے زیر اثر پھیکا پڑ جاتا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل تحریر کیے گئے ناولوں میں حب الوطنی کے تصورات کا جائزہ لینے کے بعد مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اردو ناولوں میں حب الوطنی کے جو پہلو نظر آتے ہیں۔ وہ زمین سے محبت، مکانات سے محبت، انسانوں سے محبت قدرتی مناظر سے محبت اور زبان سے محبت کے عناصر ہیں۔ اردو کے تمام ناول نگاروں نے جہاں اپنے ناولوں میں زمانی و مکانی جڑت کو واضح کیا۔ وہاں ان کے اپنے کرداروں کے مکالموں کو حب الوطنی کا آئینہ دار بنایا۔ مگر اس سارے سلسلے میں ایک عجیب پہلو یہ نظر آتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء قطر تک نوے سالوں کے دورانیے میں اس حب الوطنی کی اس آتش پر مصلحت پسندی کی برف جم جاتی ہے اور یوں دکھائی دیتا ہے کہ جیسے حب الوطنی کے احساس کو نیند آ گئی ہو۔ اور اس طرح یہ حب الوطنی کا احساس وقتی طور پر دب گیا ہو۔

پاکستان سے قبل تحریر کیے گئے ناولوں میں حب الوطنی کی شناخت ایک ملک یا علاقے کے ساتھ ساتھ ایک خطے یعنی برصغیر کی محبت کا احساس ہے جس میں ایک خاص نقطہ یہ نظر آتا ہے کہ یہ حب الوطنی اجتماعیت کا رنگ لیے ہوئے ہے یعنی اس میں ہندوازم اسلام اور سکھ ازم جیسی کوئی تفریق نہیں۔ البتہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ حب الوطنی وقتی طور پر ایک

منافقانہ مصلحت کا شکار ضرور نظر آتی ہے۔

وطن کی محبت اور وطن کی یاد جن کی جھلک اردو ناولوں میں بکثرت نظر آتی ہے، ایک ہی احساس کے دو پہلو ہیں۔ پریم چند کے ناولوں میں حب الوطنی کے احساس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محکوم طبقہ حب الوطنی کے احساس کے زیر اثر حاکم طبقے کے خلاف نفرت کا ایک خاص پہلو اپنے دلوں میں رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکمران اور محکوم طبقے میں ایک انجانا سا تناؤ اور کھچاؤ ہمہ وقت رہتا ہے۔ اس سلسلے میں محکوم طبقے کی حب الوطنی اگر چہ کلی طور پر وطن کی محبت کے احساس پر مشتمل نہیں ہے۔ اور اس کا غالب احساس محرومی ہی ہے۔ مگر وطن کی محبت کی ایک لہر اس میں بہر کیف دکھائی دیتی ہے۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں شہروں کی کیفیات کے بیان سے خاص ماحول کی عکس بندی کی ہے۔ جہاں سے چلتے پھرتے انسانوں کے حالات وواقعات سے صورت حال کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''شہر کی مخلوق اب اس حالت میں نہ تھی کہ اس پر کتنی ہی بے رحمیاں ہوں اور وہ چپ چاپ برداشت کرتی جائے۔ اسے اپنے حقوق کا علم ہو گیا تھا۔ اسے بھی آرام سے رہنے کا اتنا حق ہے' جتنا اہلِ ثروت کو۔ ایک بار منظّم تحریک کی کامیابی دیکھ چکے تھے۔ حکام کی یہ مطلق العنانی' یہ خود غریب کشی اب ان سے برداشت نہ ہوتی تھی۔'' (۵۲)

شہر کی مخلوق سے مراد وہی عوام ہیں جو حاکمِ طبقے کے مظالم کا شکار ہیں۔ اور شام کے وقت ٹھاکر کے دوارے پر اکٹھے ہو کر اگر چہ ایک عمومی چوپال کا حصہ بنتے ہیں، مگر اس کے پس پردہ وہ دو طبقوں کے زیر نگیں ہیں اوّل اُن کے اپنے ہندوستانی وڈیرے جن کے وہ صدیوں سے زیر عتاب ہیں، اور دوم وہ انگریز حاکم جو سارے ہندوستان پر مسلط ہیں۔ ایسی صورت حال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان غریب لوگوں کی حب الوطنی کا احساس مٹی میں دبا پڑا ہے، اور اس مٹی کے اوپر برف کی ایک دبیز تہہ بھی جمی ہوئی ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں طبقاتی کشمکش کے علاوہ سرکار اور جنتا کے تناؤ کی کیفیات بھی نظر آئی ہیں۔ اور یہ کیفیات بعض دفعہ شدید ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کئی مواقع پر ردعمل کی صورت حال سامنے آنا شروع ہو جاتی ہے اس ردعمل کے پس پردہ بھی حب الوطنی کا ایک احساس کارفرما ہوتا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ یہ ردعمل عوام کو وہی حب الوطنی ہے۔ کہ جس نے ایک مخصوص دباؤ کے تحت رہتے رہتے بغاوت اور ہڑتال کی شکل اختیار کر لی

ہے۔اس سلسلے میں پریم چند یوں رقم طراز ہیں:

''ہاں ہڑتال کرنا ہوگی۔دوسرا کوئی علاج نہیں ہے اور وہ ہڑتال ایک دو دن کی نہ ہوگی۔وہ اس وقت تک رہے گی' جب تک ہمارے شہر کے دیوتا ہماری آواز نہ سنیں گے۔ہم غریب ہیں۔ بے کس ہیں۔بے زبان ہیں،لیکن جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں وہ اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ انہیں غریب، بے کس اور بے زبان آدمیوں نے بڑا آدمیوں نے بڑا آدمی بنایا ہے۔یہ بڑے بڑے محل کون جان ہتھیلی پر رکھ کر بناتا ہے۔''(۵۳)

یہ ہڑتال دراصل محکوم طبقے کی طرف سے حاکم طبقے کو احساس دلانے کی ایک کاوش ہے۔جس کے تحت عوام حکام کو یہ بات باور کرانا چاہتے ہیں کہ محکوم طبقے کا بھی اس وطن میں رہنے کا حق ہے۔محکومی اور محرومی کے زیر اثر حب الوطنی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔اس موقع پر کئی ایسے متحرک اور قائد بھی جاگ اٹھتے ہیں کہ جو لوگوں کو حاکمان وقت کے خلاف نکل کھڑے ہونے کے لیے اکساتے ہیں اور ان کی یہ کاوش اپنی آخری صورت میں خواہ کسی انقلاب کی شکل اختیار کرے یا آزادی کا روپ دھار لے ایک بات طے ہے کہ اس کی بنیاد حب الوطنی کا ہی جذبہ ہے۔جو لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چلنے اور بغاوت کرنے پر اکساتا ہے۔

ر۔پاکستانی اُردو ناول میں حب الوطنی (اجمالی جائزہ)

حب کے لغوی معنی چاہت اور محبت کے ہیں۔جب کہ وطن اس خطہ زمین کو کہتے ہیں جہاں انسان زندگی کے شب و روز گزارتا ہے وہاں اس کے ساتھ اس کے والدین، رشتہ دار اور دوست احباب پرامن ماحول میں گزر اوقات کرتے ہیں۔انسان جس سرزمین کی فضاؤں میں پرورش پاتا ہے، اسے وہاں کے گلی کوچوں، بازاروں، دلفریب گلزاروں اور بیابانوں سے ایک عجیب قسم کا لگاؤ ہو جاتا ہے۔اس جذباتی لگاؤ اور وابستگی کو حب الوطنی کہا جاتا ہے۔وطن کی مٹی سے پیار ہونا ایک فطری چیز ہے۔وطن سے محبت کا جذبہ عالمگیر ہے اس جذبے کا اسیر صرف انسان ہی نہیں، اس کی محبت کا دم جانور بھی بھرتے ہیں۔پرندے صبح سویرے تلاش رزق میں اپنے گھونسلوں کو چھوڑتے ہیں

مگر سرِ شام واپس گھر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔

پردیس میں انسان کتنا ہی مطمئن اور خوشحال کیوں نہ ہو پھر بھی اسے وہ لمحات جو اس نے اپنے وطن کی آزاد فضاؤں میں گزارے ہوں یاد آتے ہیں۔ اسے ان گزرے ہوئے لمحات کی یاد رہ رہ کر ستاتی ہے جو اس نے اپنے دوستوں، عزیز و اقارب اور ہم وطنوں کے ساتھ گزارے ہوتے ہیں۔ وطن کی آزاد فضاؤں میں پیش آنے والے واقعات فلم کی طرح اس کے ذہن میں گھومنے لگتے ہیں۔

وطن سے محبت کا جذبہ انسان کی سرشت میں شامل ہے اور یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ جس دل میں وطن سے محبت کا جذبہ عنقا ہو وہ دل بے حس اور مردہ ہے۔ حب الوطنی کا جذبہ انسان کو اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرنے اور ان کے دکھ درد میں شامل ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ وطن کی عزت کی خاطر اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے۔

۱۸۵۷ء میں وطن کا نیا تصور بیدار ہونا شروع ہو گیا تھا، سرسید احمد خان کی تحریک کے زمانے میں قوم کے لفظ کو وطن کے معانی میں تبدیل کر دیا گیا لیکن اقبال کی نظر میں وطن کا خالص تصور پہلی دفعہ سامنے آیا۔ ان کی کتاب بانگ درا میں بعض نظمیں ہندوستان سے محبت کا پیغام دیتی ہیں، بعد میں ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور وطن کے بجائے ملت کا تصور سامنے آیا، یعنی اقبال کی نظر میں وطن کا یہ نظریہ ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں بھی رہتے ہیں وہی ان کا وطن ہے۔ وطن کے لیے جغرافیائی حدود کی پابندی نہیں ہے۔ علامہ محمد اقبال کی حب الوطنی کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''مشرق کی بے چارگی و درماندگی کے احساس نے رفتہ رفتہ اقبال کو نئے سیاسی عقائد کی تشکیل پر آمادہ کیا اور یہ نتیجہ تھا درحقیقت مشرق و مغرب کے افکار کے آزادانہ مقابلہ و موازانہ اور امتزاج و اختلاط کا۔ یہ ایک نیا فلسفۂ سیاست تھا جو اقبال سے مخصوص تھا۔ یہ افلاطون، ارسطو، میکاولی، ہابز، کانٹ اور روسو وغیرہ کے تصورات پر مبنی نہیں تھا بلکہ اس کی تعمیر و تربیت میں قرآن و حدیث، غزالی، رازی، ماوردی، نظام الملک، ابن حزم اور ابن خلدون وغیرہ کے خیالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کی تشکیل و ترتیب میں مشرق کی سیاسی فضا نے بھی متعدبہ حصہ لیا۔''(۵۴)

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مذکورہ مضمون میں اقبال کے ایک مضمون کا تذکرہ کرتے ہیں جس سے اقبال کے وطنیت کے بارے میں افکار وخیالات کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال نے اپنے ایک مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''جب میں نے یہ محسوس کیا کہ قومیت کا تخیل جو نسل وطن کے امتیازات پر مبنی ہے۔ دُنیائے اسلام پر بھی حاوی ہو جاتا ہے اور جب مجھے یہ نظر آیا کہ مسلمان اپنے وطن کی عمومیت اور عالمگیری کو چھوڑ کر وطنیت اور قومیت کے پھندے میں پھنستے جاتے ہیں۔ تو بحیثیت ایک مسلمان اور محبّ نوع انسانی کے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں ارتقا اور نشو ونما میں قبیلے اور قومی نظامات کا وجود بھی ایک عارضی حیثیت رکھتا ہے اور اگر ان کی اتنی ہی کائنات تسلیم کی جائے تو میں ان کا مخالف نہیں۔ لیکن جب انھیں انتہائی منزل قرار دیا جائے تو مجھے ان کے بدترین لعنت قرار دینے میں مطلق تامل نہیں۔''(۵۵)

علامہ اقبال نے اپنے نظریہ وطن کے پہلوؤں کا درج ذیل تین زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔

۱۔ انسانی نقطۂ نظر:

مغرب کا نظریہ وطنیت آفاقی نہیں اس نے نوع انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس نے انسانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ چنانچہ طاقت ور، کمزور کو ختم کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

۲۔ دینی نقطۂ نظر:

دینی نقطہ سے اقبال نے وطنیت کے نظریے کو مشرکانہ اور خالص مادہ پرستانہ نظریہ پایا۔ اس کے برعکس اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات کے، جس کا دنیا میں کوئی نظام بھی مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔

۳۔ ملی نقطہ نظر:

اسلام کا تصور ملت ایک آفاقی تصور کی وحدت اور انسانی اخوت کی اٹل بنیادوں پر قائم ہے۔

اقبال کو اپنے وطن ہندوستان سے بہت محبت تھی اور ان کی ابتدائی شاعری میں ہندوستان سے محبت کا اظہار

نظر آتا ہے۔

جب اقبال انگلستان سے وطن آئے تو ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اقبال کی نظر میں وطن سے مراد جغرافیائی حدود نہیں ہیں بلکہ مسلمان جہاں بھی اور دُنیا کے کسی بھی کونے میں رہتے ہیں۔ ان کا وہی وطن ہے۔ اقبال کی خواہش تھی کہ دُنیائے اسلام کے تمام مسلمان ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور ایرانی، تورانی اور افغانی وغیرہ کی تفریق نہ رہے۔

چوں کہ ہمارا موضوع وطن سے محبت کا ہے۔ اس لیے یہاں پر اقبال کے نظریہ وطنیت پر مختصر بحث ضروری تھی، چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسلمان ایک قوم نہیں بلکہ ایک ملت ہیں اور یہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رہائش پذیر ہوں یہی ان کا وطن ہے اور وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے، لہٰذا ہر انسان کو اپنے علاقے سے محبت ہوتی ہے۔ جہاں وہ پیدا ہوتا ہے، بڑا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے اور اگر وہ اس علاقے کو کسی مجبوری کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے یا ہجرت کر جاتا ہے۔ پھر بھی اسے اس کا وطن ضرور یاد آتا اور اس کا اظہار کبھی اشعار کی شکل میں ہوتا ہے تو کبھی افسانے یا ناول کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب اُردو ناول نگاری کا آغاز ہوا اور یہ صنف قارئین ادب میں مقبول ہوئی تو متعدد اُردو ناول تخلیق ہو کر منظر عام پر آئے۔ ان اُردو ناولوں کی فہرست اگر چہ بہت طویل ہے مگر ان میں سے چیدہ چیدہ اُردو ناول درج ذیل ہیں۔

ایسی بلندی ایسی پستی، (عزیز احمد) نگری نگری پھرا مسافر (نثار عزیز بٹ) خدا کی بستی (شوکت صدیقی) خونِ جگر ہونے تک (فضل کریم فضلی) خاک اور خون (نسیم حجازی) رقصِ ابلیس (ایم اسلم) علی پور کا ایلی (ممتاز مفتی) تلاش بہاراں (جمیلہ ہاشمی) آنگن (خدیجہ مستور) اداس نسلیں (عبداللہ حسین) آبلہ پا (رضیہ فصیح احمد) جھوک سیال (سید شبیر حسین) سیاہ آئینے (فاروق خالد) بستی (انتظار حسین) دیوار کے پیچھے (انیس ناگی) جنت کی تلاش (رحیم گل) راجہ گدھ (بانو قدسیہ) خوشیوں کا باغ (انور سجاد) چلتا مسافر (الطاف فاطمہ) میرا گاؤں (غلام الثقلین نقوی) پریشر ککر (صدیق سالک) زمین (خدیجہ مستور) باگھ (عبداللہ حسین) جانگلوس (شوکت صدیقی) صدیوں کی زنجیر (رضیہ فصیح احمد) بہاؤ (مستنصر حسین تارڑ) آگے سمندر ہے (انتظار حسین) معتوب (اعجاز راہی)

نادارلوگ (عبداللہ حسین) راکھ (مستنصر حسین تارڑ) خس وخاشاک زمانے (مستنصر حسین تارڑ) اے غزال شب (مستنصر حسین تارڑ) حاصل گھاٹ تنہا (سلمیٰ اعوان) کراچی (فہمیدہ ریاض)۔

قبل ازیں قیام پاکستان سے پہلے لکھنے جانے والے اردو ناولوں میں وطن سے محبت کے عناصر کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ یہاں ہم چند پاکستانی اردو ناولوں میں وطن سے محبت کے عناصر کا اجمالی جائزہ لیں گے۔

قرأۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' پہلی بار وتھاوا میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول میں ایک ایسا وطن جو ابھی معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ سے محبت کے جذبات/عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جب تحریکِ پاکستان اپنے عروج پر تھی۔ وطن سے محبت کرنے والے لوگ نئے مُلک سے محبت کرتے نظر آتے ہیں۔ ناول ''آگ کا دریا'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> ''چمپا کے والد سیاست میں ہلکی پھلکی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے ایک چچا مراد آباد سٹی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں جب دھوم دھام کا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو اس میں چمپا کے والد اور چچا دونوں شرکت کے لیے گئے تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد جب بھی بنارس آتے چمپا کے والدان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے تو پاکستان کے مطالبے پر تبادلہ خیال کرتے۔''(۵۶)

ان سطور سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان نئے بننے والے ملک سے کس قدر محبت کرنے لگے جو کہ ابھی بنا ہی نہیں تھا۔ ایک خواب تھا۔ الگ وطن جہاں پر مسلمان اپنی مرضی کے مطابق زندگیاں بسر کر سکیں گے۔ چمپا کے والد اور چچا کی راجہ صاحب اف محمود آباد کے ساتھ دوستی اس بات کا ثبوت ہے کہ یولوگ مطالبہ پاکستان اور نئے بننے والے ملک سے کس قدر محبت کرتے تھے اور یہ لوگ چاہتے تھے پاکستان جلد از جلد بن جائے۔ چمپا کے والد اور چچا کا راجہ صاحب محمود آباد سے اکثر مطالبہ پاکستان پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا اور یہی چیز حُب الوطنی ہے۔

بانو قُدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں پروفیسر سہیل کا کردار پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کرنے والا کردار ہے۔ اس کی محبت کا اپنا ایک انداز ہے۔ کہیں تو وہ اپنے طالب علموں کا نئے طریقے سے گائیڈ کرتا

ہوا نظر آتا ہے کہیں اس کی سوچ وفکر کے انداز میں اور کہیں اس کی گفتگو میں آزاد پاکستان میں رہنے والا یہ پروفیسر وطن سے محبت کے حوالے سے کیا کہتا ہے ملاحظہ کیجیے:

''میں بڑا ہی چھوٹا آدمی ہوں۔ مجھے پاکستان سے ایسی تعصب انگیز محبت ہے کہ میں کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا جب کبھی سوچتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ایسا ملک جغرافیے کے نقشوں میں کسی طرح بڑا ہو جائے۔ جب کبھی ہماری پاکی ٹیم کوئی میچ جیت جاتی ہے تو ایک Folish لڑکی کی طرح میرا تالیاں بجانے کو جی چاہتا ہے۔ یار میرا جی چاہتا ہے کہ میری تھیوری کامیاب ہو۔ مغرب کے لوگ قائل ہوں کہ ایک پاکستانی مسلمان نے اتنا بڑا کام کیا'' (۵۷)

یہ وہ عناصر، یہ وہ جذبے بول رہے ہیں۔ روشن جذبے ہیں۔ جنھوں نے پرانی نسل سے نئی نسل تک کے دل وذہن میں اپنا سفر طے کیا۔ اس نسل کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اسے پاکستان کی جیت کیوں پیاری ہے۔ وہ پاکستان کو دنیا کے نقشے پر کیوں بڑا دیکھنا چاہتی ہے۔ پاکستان کا ہاکی کا میچ جیتنا کوشی دیتا ہے۔ وہ اپنے تجربات کے ذریعے وطن کو اونچا کیوں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سارے جذبوں میں جذبہ شامل ہے۔ اور وہ جذبہ حُب الوطنی ہے۔ وطن سے محبت کا ذریعہ جس نے پاکستان بنایا تھا۔ جو خون میں دوڑتا تھا۔ آنکھوں میں چمکتا تھا اور لوگوں کی زبانوں پر نعرہ بن جاتا تھا، لے کر رہیں گے پاکستان، پروفیسر سہیل کا پاکستان کو دنیا کے نقشے پر بڑا دیکھنا اور ہاکی کے میچ کی جیت پر تالیاں بجانے کو جی چاہنا حُب الوطنی کی بہترین مثالیں ہیں۔

قراۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں وطن سے محبت کا ایک اور اقتباس بھی نظر آتا ہے۔ اس اقتباس میں ایک کردار کمن کا خط ہے۔ اس خط میں اسی کی سوچوں اور وطن سے محبت کے عناصر کا سراغ ملتا ہے۔ اس میں پاکستان کے وجود کے اسرار ملتے ہیں۔ اور پاکستان کو خوشحال اور آزاد رکھنے کی سوچ کے انداز بھی ملتے ہیں۔ درج ذیل اقتباس میں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے آنے والے کمن کے خط کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

''جس ملک میں وہ رہ رہے ہیں اُس کا نام پاکستان ہے۔ اب ماضی پر رونے اور ماضی

کی غلطیوں پر پچھتانا مضحکہ خیز ہے کیوں کہ مستقبل بھی باقی ہے۔ یہ سوچنا حماقت ہے کہ
دونوں ملک پھر متحد ہو جائیں گے۔اس ملک نے مُجھے اپنی حفاظت میں لے لیا
ہے۔مُجھے پناہ دی ہے۔اس کو بنانا بگاڑنا اب میرے ہاتھ میں ہے''(۵۸)

اس اقتباس میں ایک درد بھری آواز ہے ایک پختہ ابھرتی ہوئی سوچ ہے۔ایک احساس تحفظ اور ایک احساس تعمیر جھلکتا ہے۔ ماضی کی یادوں سے اٹھتی راکھ کا دھواں دکھائی دیتا ہے۔لیکن عزت نفس اور ذات کے تحفظ اور احساس پناہ سے ملے سکھ کے سانس سنائی دیتے ہیں۔اور دل و دماغ سے گواہی ملتی ہے۔کہ ہمارا وطن ہے۔ ہماری پناہ گاہ ہے اور اسے اب بنانا ہمارے ہاتھوں کا کام ہے۔ یہ اللہ کی عطا ہے۔اس کا تحفہ ہے۔اسے سنبھال رکھنا اسے سجا رکھنا ہمارا فرض اور ہماری ذمہ داری ہے۔اس خط میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ملک جس میں وہ رہ رہے ہیں اس کا نام پاکستان ہے۔ ماضی پر رونا اور پچھتانا بڑا مضحکہ خیز ہے۔ یہ سوچ بھی غلط ہے کہ پاکستان اور ہندوستان دوبارہ متحد ہو جائیں گے۔جس ملک کی پناہ گاہ میں ہوں اسے بنانا یا بگاڑنا میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ تمام عناصر وطن سے محبت کے عناصر ہیں۔منفی سوچ کہ شاید یو دونوں ملک دوبارہ متحد ہو جائیں گے۔ ماضی کی غلطیوں پر پچھتانا وغیرہ یہ سب وطن سے محبت کے عناصر ہیں۔ یہ دراصل نصائح ہیں کہ اپنے وطن کے لیے کام کرو اور اس سے وفاداری کرو۔

ابدال بیلا کا ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' بہت ضخیم ناول ہے۔اس ناول میں برصغیر پر برطانوی حکومت کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔اور اس کے ساتھ برصغیر کی تقسیم کے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ جب تقسیم کا اعلان ہوا تو پاکستان جانے کے لیے مختلف ذرایع استعمال کیے گئے۔ کچھ لوگ پیدل ہی پاکستان کے لیے روانہ ہوئے اس کے علاوہ ٹرینوں کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔مسلمان پاکستان آنے کے لیے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ان کی ہجرت میں انہی عناصر کی پوٹلی شامل ہے جس میں اُن کا ایمان محفوظ ہے۔وہ اسی ایمان کی پوٹلی کو اس پناہ گاہ میں لے آتے جہاں وہ سکون سے کھول کر دیکھتے اور اس قیمتی عزت کے جواہر سے سکون کے ساتھ اپنی زندگیاں سنواریں۔لیکن اس اطمینان کو پانے کی قیمت انگریز، ہندو اور سکھ نے جو مقرر کی تھی اس کی تفصیل اس اقتباس میں ملاحظہ فرمائیں۔

''وہ سارے خستہ حال لوگ پاکستان کی طرف جانے والی کسی ایک ٹرین کے منتظر

تھے۔پھر اسی میدان کے ساتھ ہی ایک ریلوے لائن تھی۔پھر اسی ریلوے لائن سہمی ہوئی خاموش خون گراتی ہوئی لاشوں سے بھری ٹرینیں گزرنے لگیں۔فضل دین بھی اپنا کتبہ لے کر اس ٹرین کے سب سے پچھلے ڈبے پر چڑھ گیا۔فضل دین سمیت اس بد نصیب ٹرین کے کسی مصافر کے علم میں نہیں تھا کہ چودہ میل آگے اس ٹرین پر کیا بیتے گی۔تمہیں پتا ہے ان دنوں ٹرین پاکستان کا نصیب کیا ہوتا تھا''(۵۹)

اس اقتباس میں ابدال بیلا نے تقسیم کے وقت پیش آنے والے واقعات کا ذکر کیا ہے۔لوگ پاکستان آنے کے لیے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ان لوگوں کے پاس اپنے ایمان کے سوا کچھ نہیں تھا۔یہ لوگ اپنا ایمان اور سجدے اپنے ساتھ لائے تھے۔فضل دین بھی اپنے خاندان کو لے کر ٹرین کے سب سے آخری ڈبے میں بیٹھ گیا۔فضل دین اور دوسرے مسافروں کو یہ پتا نہیں تھا کہ اس ٹرین پر چودہ میل بعد کیا مصیبت آئے گی۔اقتباس کے اخری جملے میں طنزیہ سوال تھا کہ ٹرین تو پاکستان کے نصیب میں لاکھوں کٹے اعضا والی لاشیں ہوتی تھیں۔وہ ایسی ٹرینوں میں اپنے ایمان کا خزانہ سنبھالے، کرپانوں اور سنگینوں کی نذر ہو جایا کرتی تھیں۔جو پاکستان مانگتی تھیں اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے، اپنے قرآن کے لیے، اپنی نماز کے لیے، اپنے سجدوں کے لیے، اپنی اذان کے لیے۔یہ سارے عناصر کیا تھے۔یہ سارے عناصر وطن سے محبت کے تھے۔کہ ہمارا نیا اور الگ ملک بن گیا ہے۔ہم وہاں جائیں گے۔جہاں ہم اپنی عبادات آزادی کے ساتھ کر سکیں گے۔یہ باتیں انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔اس لیے وہ پاکستان جاتی ٹرینوں پر حملہ اور ہوتے تھے اور مسلمانوں کا قتل عام کرتے تھے۔لیکن مسلمانوں کے نزدیک صرف ایک ہی جذبہ تھا اور وہ تھا، جذبہ حُب الوطنی جس کی وجہ سے یہ لوگ تمام تکالیف برداشت کرتے پاکستان پہنچ رہے تھے۔

باگھ عبداللہ حسین کا ناول ہے۔اور یہ پہلی مرتبہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔اس ناول میں بھی وطن سے محبت کے عناصر ملتے ہیں۔یہاں پر ہم صرف ایک اقتباس پر بحث کریں گے۔جس میں وطن پاکستان سے محبت کے عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

اگر ہم ناول کے اندر جھانکیں تو ناول باگھ کی یہ سطور ان کی سوچ سے آگاہ کرتی ہیں۔ وہ سوچ جو ایک بچے کی ہے۔ جو پاکستان کی آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے اور اپنا وقت سکول استاد، امام مسجد اپنے باپ اور پھوپھی کے ساتھ ساتھ اپنے محلے کے بچوں کے ساتھ گزارتا ہے۔ اس کے اندر دنیا میں پاکستان سے یعنی اپنے وطن سے محبت کے عناصر کس رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ عبداللہ حسین یوں رقم طراز ہیں:

> ''اُس کے باپ نے پانی نکالا اور اسد نے بیٹھ کر اپنے بوٹ جرابیں، نیکر قمیض پھر ٹانگیں اور بازو دھوئے۔ کنویں سے واپسی پر اُس کے باپ نے اُس چھوٹے سے ٹیلے پر پڑی ہوئی دھوپ کو دیکھا اور ستانے کے لیے وہاں بیٹھ گیا۔ اسد نے اپنی قمیض اور جرابیں سوکھنے کے لیے ایک جھاڑی پر پھیلا دیں۔ اور کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھا انگلی سے پاکستان کا نقشہ بناتا رہا'' (۶۰)

اس اقتباس میں اسد کا یہ انداز جو زمین پر بیٹھے ہوئے انگلی سے پاکستان کا نقشہ بناتا ہے۔ اس کے اس عمل سے ہم بہت حیران ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ اسد کے باپ نے کبھی اسد سے پاکستان کے بارے میں بات نہیں کی اور نا ہی اسد کبھی کسی جلسے سے ہو کر آیا ہے کہ اس کے تحت وہ زمین پر بیٹھ کر پاکستان کا نقشہ بنانے میں مصروف ہو۔ اسد کا باپ شکاری تھا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے مرغابی کا شکار کیا تھا۔ اسد اسے زخمی دیکھ کر بہت غمگین ہو گیا تھا۔ اور اس نے باپ کو مرغابی کو ذبح کرنے سے منع بھی کیا تھا۔ لیکن باپ نے اُسے کہا بیٹا شکار کے بھی کچھ اُصول ہیں جو ہمارے مذہب نے سکھائے ہیں۔ تاہم یہ باتیں سن کر وہ زمین پر بیٹھ کر اپنے ہاتھ پاؤں دھونے کے بعد پاکستان کا نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ ان سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچے بہت حساس ہوتے ہیں۔ وہ ہر بات کا گہرا اثر لیتے ہیں۔ اسد نے بھی فسادات کے حوالے سے کچھ نہ کچھ نصابی کتب سے حاصل کیا ہوگا۔ جس کے باعث اُسے ظلم، زیادتی اور سختی اور جبر کے معانی کا علم ہوا ہوگا اور اس کے نتیجے کے طور پر آزادی کی کوشش اور آزاد دنیا کا تصور پاکستان کے نقشے کی صورت میں اُس نے جانا ہوگا۔ اسی لیے چھوٹے اور معصوم ذہن میں پاکستان کی محبت اور اس کے نقشے کا تصور ابھرنا دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ان ناولوں میں موجود حب الوطنی کے عناصر کے بارے میں اختصار سے یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ حب الوطنی قیام پاکستان سے قبل کے معانی، قیامِ پاکستان کے بعد کے معانی سے قدرے مختلف ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کے ناولوں میں جو حب الوطنی پائیجاتی ہے اس میں مخصوص پرچم، سرزمین، خطے اور نقشے کے بنیادی تصورات موجود ہیں۔ اس حب الوطنی کے خدوخال واضح ہیں۔ ناول نگاروں نے ان عناصر کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی خیالات و تصورات کی جھلک بھی پیش کی ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے چوں کہ ان تمام ناولوں کا تحقیقی جائزہ نہیں لیا جا سکتا لہذا اس تحقیق کے سلسلہ میں پاکستانی اُردو ناولوں کی تحدید کر کے درج ذیل ناول برائے تحقیق و جائزہ منتخب کیے گئے ہیں۔ پاکستانی اُردو ناول سے مراد وہ ناول ہیں جو قیام پاکستان کے بعد تخلیق کیے گے ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ رقص ابلیس، خاک اور خون، خدا کی بستی، علی پور کا ایلی، آنگن، آبلہ پا، خونِ مسلم، زمین، جنت کی تلاش، راجہ گدھ، چلتا مسافر، پریشر ککر، وادی لہو رنگ، باگھ، جانگلوس، صدیوں کی زنجیر، نادار لوگ، حاصل گھاٹ، صفر سے ایک، خس وخا شاک زمانے، اے غزال شب

بحیثیت مجموعی اس باب میں حب الوطنی کی کئی جہات زیرِ بحث آئی ہیں۔ حب الوطنی بظاہر تو وطن کی محبت کا ایک عمومی عنصر نظر آتا ہے مگر جب اس کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ حب الوطنی دراصل کئی ذیلی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ جن میں اپنے وطن کی زمین سے محبت، وطن کے لوگوں سے پیار، وطن کے ماحول، موسم، ثقافت، رسوم و رواج اور تاریخ سے پیار کی جہتیں شامل ہیں۔ حب الوطنی کے پیمانے مختلف افراد کے لئے جدا جدا ہوتے ہیں۔ مثلاً زمیندار، تاجر، سیّاح، مزدور، ملازمت پیشہ افراد اور ان جیسے دیگر لوگوں کی حب الوطنی بھی مختلف خانوں میں بٹی ہوسکتی ہے۔ حب الوطنی کی درجِ بالا جہات کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام اقسام کی حب الوطنی مل کر کسی بھی قوم کی مجموعی حب الوطنی کا ایسا گلدستہ سجا دیتی ہے جس کی حیثیت اجتماعی خوبصورتی سے ظاہر ہوتی ہے۔

تعارف اور اصولی مباحث کے زیرِعنوان باب اوّل میں حُب الوطنی کے معنی اور مفہوم کے علاوہ لغوی اور اصطلاحی توضیح بھی کی گئی ہے۔اس باب میں حُب الوطنی اور ادب کے رشتے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بالخصوص حُب الوطنی اور اردو ادب کا نسبتاً تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔قیام پاکستان سے قبل اردو ناول میں حُب الوطنی کے کون کون سے عناصر تھے۔اور اُن کی کیا نوعیت تھی اس بارے میں بھی ایک مشاہداتی اور تحقیقی تجزیہ موجود ہے۔

حُب الوطنی کے معنی و مفاہیم کی تلاش کے لیے مختلف لغات کی توضیحات کا مجموعی خلاصہ یہی ہے کہ حب الوطنی عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی اپنے وطن کی محبت، دیس سے پیار اور سرزمین سے لگاؤ وغیرہ ہے۔حُب الوطنی کی ترکیب گرامر کے اعتبار سے مرکب اضافی ہے۔جو وطن سے محبت، الفت، پریم، اُنس، پیار اور چاہ کی جانب اشارہ کناں ہے۔

ادب میں حُب الوطنی مختلف اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ہمارے موضوع میں چونکہ اردو ناول میں میں حب الوطنی کے بارے میں تحقیقاتی تجزیہ شامل ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم حب الوطنی کے اظہاری پہلو کی جانب توجہ دیں اور یہ دیکھیں کہ ناول نگار نے اپنے الفاظ میں یا کرداروں کے مکالمات کی صورت میں حُب الوطنی کا اظہار کیا۔باب اوّل میں حُب الوطنی کی تشریح اور توضیح کے ساتھ ساتھ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ حُب الوطنی کا جذبہ انسان میں اگرچہ مادی اشیاء مثلاً زمین، جمادات، اشجار اور مکانات وغیرہ کے زیرِاثر پیدا ہوتا ہے۔مگر یہ جذبہ اپنی اصلیت میں غیر مادی ہے جو دلی کیفیات سوچ، عقل، شعور اور یاد سے عبارت ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی نوعیت اور شدت میں کمی بیشی ہوسکتی ہے وقت حب الوطنی کے جذبے کو بڑھا بھی سکتا ہے اور یہ جذبہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کم اور موقوف بھی ہوجانا ممکن ہے۔اسی لیے یہ بیان کیا گیا ہے کہ حُب الوطنی کا جذبہ متغیر ہے۔

وطن کا نظریہ خواہ انسانی ہو، دینی ہو، ملی ہو یا جغرافیائی اور علاقائی۔ان جملہ صورتوں میں وطن کی محبت کا جذبہ ایک ایسا مُحرک ہے جو لوگوں کو اجتماعیت، قوت عمل اور باہمی تعاون پر اُکساتا ہے۔اس سلسلے میں ایک امر یہ بھی سامنے آیا ہے کہ دنیا کی عظیم ترین عوام کا وہ جذبہ جس کے تحت انہوں نے ترقی کے بالا خانوں تک رسائی حاصل کی وہ دراصل جذبہ تعمیر ہے اور وہ اس جذبہ تعمیر کا اگر بنظر غائر مشاہدہ کیا جائے تو وہ دراصل حُب الوطنی کا جذبہ ہی ہے۔

اپنی اصلیت میں متغیر ہے یعنی یہ بدلتا رہتا ہے اور کبھی کبھی یہ جذبہ کسی دوسرے محرک یعنی خوف اور لالچ کے زیر اثر یک سر اور یک لخت مفقود بھی ہو جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں تاریخ سے میر جعفر اور میر صادق وغیرہ کی مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں کہ جنہوں نے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر حُب الوطنی کے تمام جذبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حاکمِ وقت کے خلاف بغاوت کی۔ باب اوّل میں حُب الوطنی اور ادب کے حوالے سے تحقیقاتی طور پر یہ امر عیاں ہوا ہے کہ ادیب اور شاعر چونکہ معاشرے کا حساس ترین طبقہ ہوتا ہے اس لیے اُن میں وطن سے محبت کا احساس عام لوگوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ کسی عام شخص اور ادیب میں حُب الوطنی کا احساس اسی لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ عام شخص حُب الوطنی کے احساسات کا اظہار موثر انداز میں نہیں کر سکتا۔ اور ادیب لوگ حُب الوطنی کا اظہار موثر انداز میں کر سکتے ہیں۔ وطن کی محبت کے تمام گیت شاعروں نے لکھے ہیں۔ اور تمام ناول ادباء اور ناول نگاروں کے تحریر کردہ ہیں۔ حُب الوطنی کے اظہار کے لحاظ سے ادباء عوام پر فائق ہیں۔

ادب میں حُب الوطنی کے اظہار کی دو ممکنہ صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی حُب الوطنی کا اظہار منظوم اور حُب الوطنی کے اظہارِ منظوم کی مثالیں ملی نغمہ، جنگی ترانہ اور نظم وغیرہ ہیں۔ شاعری میں وطن کی محبت کا اظہار تفصیل کی بجائے اجمال کا متقاضی ہوتا ہے۔ یعنی شاعر نہایت اختصار میں چند اشعار کے اندر وطن سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ نثر میں حُب الوطنی کے اظہار کے لیے اختصار کی بجائے تفصیل کا سہارا لیا جاتا ہے لہٰذا مضامین، سفرناموں اور ناولوں میں نثر نگار حُب الوطنی کا اظہار تفصیل سے کرتے ہیں۔

ادب چونکہ انسانی احساسات اور جذبات کا مظہر ہے اس لیے ادب میں زمین اور انسان کے رشتوں کی جدت بہت اہم ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان کے زمین سے رشتے ہی نے آسمان کے تصور کو واضح کیا ہے۔ ادب خواہ دنیا کے کسی زبان یا علاقے کا ہو ادب میں زمین کے تذکرے کے بغیر بات نہیں بنتی۔ اردو ادب میں ذکر زمین اور ذکر انسان جن جہتوں میں مذکور ہیں۔ اُن میں انسان کی تہذیب معاشرت جن میں بود و باش، لباس، رہن سہن، بستیاں، شہر، گاؤں، محلے، مکانات اور احباب وغیرہ شامل ہیں۔ ادب میں حُب الوطنی کے اظہار کی بنیاد ادیب کے ذاتی افکار پر ہے کہ اس نے وطن کی کن کن چیزوں اور جہتوں سے کیفیات جذب کی ہیں اور اثر قبول کیا

ہے۔

حُب الوطنی اور اردو ادب کے باہمی رشتے کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اردو زبان کی گنگا جمنی تہذیب کے پہلو میں ہند آریائی تہذیب، ایرانی، تہذیب اور مقامی حالات و واقعات کے پس منظر میں نوآبادیاتی نظام پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ ان تمام تر تجزیات اور مباحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو زبان کی مآخذ چونکہ سرزمین برصغیر ہے اس لیے اس زبان کے ادیبوں نے حُب الوطنی کا جو رنگ اپنی تحریروں میں دکھایا ہے اُن میں اس سرزمین کے موسم، بود و باش اور رہن سہن کے ساتھ ہر مذہب کے عظیم پیروکاروں، پادریوں، پنڈتوں، سورماؤں، رہنماؤں اور اولیائے کرام کے تذکرے بکثرت ملتے ہیں اردو ادب میں حُب الوطنی کا عنصر اس لحاظ سے نمایاں ہے کہ اس خطے میں سمندر، دریا، ریگستان، پہاڑ، وادیاں، باغات، جنگل اور سبزہ زار بکثرت موجود ہیں۔ برصغیر کی حُب الوطنی میں کشمیر کے فطری حسن کا تذکرہ اس کثرت سے ملتا ہے کہ حسن، حب الوطنی اور کشمیر تینوں الفاظ لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اپنا وطن ہی کشمیر ہے۔

قیام پاکستان سے قبل اردو ناول میں حُب الوطنی کے عناصر باب اوّل کا ایک ایسا موضوع ہے جو اس تحقیق کے لیے صحیح بنیاد فراہم کرتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل لکھے گئے اردو ناولوں میں جس حُب الوطنی کا اظہار ہے۔ وہ خالصتاً برصغیر کی حُب الوطنی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کے ناولوں میں چونکہ ہندوستان اور پاکستان کی تفریق نہ تھی۔ اس لیے یہ حُب الوطنی ایک قسم کی اجتماعیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اردو کے اوّلین ناول نگار مولوی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح اور ابن الوقت وغیرہ میں انیسویں صدی کے نصف دوم کے حالات و واقعات جنگ آزادی کے تذکرے اور اس خطے کے جاگیرداروں کی انگریزی روایات میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ حب الوطنی اور مقامیت کے اثرات موجود ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت کے نام سے ہی یہ بات عیاں ہے کہ کس طرح مقامی لوگوں وقتی مصلحت اور ابن الوقتی سے کام لے کر بدیسی تہذیب کو اپنایا۔

نذیر احمد کے علاوہ اردو ناول نگاری میں رتن ناتھ، سرشار، مرزا ہادی، رسوا، عبدالحلیم شرر اور راشد الخیری جیسے ناول نگار قابل ذکر ہیں۔ ان تمام ناول نگاروں کی فنی خصوصیات کا ذکر اُن کے لکھے ہوئے تمام ناولوں کے حوالے

سے کیا گیا ہے۔ان سب میں وطن سے محبت کے حوالے سے قدر مشترک یہی ہے کہ رسوا کے ناول امراؤ جان ادا فیض آباد کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔عبدالحلیم شرر کے ناول ''فردوس بریں'' میں زمرد اور حسین کو حج کے موقع پر بھی اپنے وطن کی یاد آتی ہے۔سرشار کے ناول فسانہ آزاد نے بھی کردار پرانے لکھنو کی یاد میں آہیں بھرتے ہیں۔ پریم چند کے ناولوں میں وطن کی پگڈنڈیاں،کھیت اور ہریالیاں اپنے تمام فطرے حسن کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہیں۔

اردو کے وہ ناول جو قیام پاکستان سے قبل تحریر کیے گئے اُن ناولوں میں ادیبوں نے زمان ومکان سے محبت، انسانون سے محبت قدرتی مناظر سے محبت اور زبان سے محبت کو واضح کیا ہے۔مگر اس سارے سلسلے میں ایک بات جو نہایت معنی خیز اور دلچسپ نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ سے لے کر ۱۹۴۷ تک کے نوے سالوں میں حُب الوطنی کا احساس وقتی طور پر مصلحت پسندی اور خوف کی تہہ میں دب گیا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ نورالحسن، مولوی نیر، نوراللغات، دوّم، نیشنل بک فانڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص۔ ۶۸۸۷

۲۔ اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۔ ۷۶۳

۳۔ محمد صدیق قریشی، کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص۔ ۴۰۴

۴۔ اسٹالن قوم اور قومیت، مکتبہ فکر و دانش، رائل پارک لاہور، ناشر محمد الیاس، ص۔ ۱۳

۵۔ محمد اکرم چغتائی، مضامین سرسید، سنگ میل پبلی کیشن لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۔ ۲۴۹

۶۔ محمود عاصم، افکارِ قاعد اعظم، مکتبہء عالیہ، ایبک روڈ لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۔ ۱۱۹

۷۔ الحاج مولانا مولوی محمد منیر، اردو سعیدی ڈکشنری، ادب منزل پاکستان چوک کراچی، س۔ن، ص۔ ۸۷۰

۸۔ اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۔ ۷۶۴

۹۔ محمد صدیق قریشی، کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص۔ ۴۰۷

۱۰۔ اقبال تصور قومیت اور پاکستان، مرتبہ تبسم کاشمیری مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء ص۔ ۵۷

۱۱۔ مولانا مودودی، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۔ ۳۳۶

https://www.merriam-webster.com/dictionary/nationalis.12

۱۳۔ اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۔ ۷۶۴

۱۴۔ محمد صدیق قریشی، کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص۔ ۳۰۶

۱۵۔ اوکسفورڈ اُردو انگریزی لغت، اوکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۱۱۲۲

۱۶۔ قرآن مجید، سورہ، المائدہ، ۵:۲۱

۱۷۔ فیروز اللغات، فیروز الدین مولوی، فیروز سنز پرائیویٹ لمٹیڈ، لاہور، س ن، ص۔ ۹۰۱

۱۸۔ اوکسفورڈ اُردو انگریزی لغت اکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۷۸۹

۱۹۔ محمد صدیق قریشی، کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص۔ ۴۳۷

۲۰۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، ادب و فن، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء ص۔ ۲۱۷

۲۱۔ آغا سہیل ڈاکٹر، پاکستانی ادب اور قومی تشخص، مشمولہ سرسیدین، پاکستانی ادب وتنقید، راولپنڈی، مجلّہ فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، ۱۹۹۲ء ص۔۴۱۶

۲۲۔ سنن الترمزی، ۵:۷۲۳، رقم:۳۹۲۶

۲۳۔ مولوی نورالحسن نیر، نوراللغات، مقبول اکیڈمی۔۱۹۹ سرکلر روڈ لاہور۔س۔ن

۲۴۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد دوم، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ اردو بازار لاہور

25 The Americian Heritage Disctionary of English Langvage Fifth Edition, Harcount Publishing Company P.29

26 Igor Primoratz and Alksandar Pavkovic, Patriotism: Philosoplical and Political Perspectives, Ashgate Publising limited gower House croft road tldershot England, 2007, P.43

۲۷۔ ڈاکٹر وحید قریشی، پاکستانی قومیت کی تشکیل نو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء ص۔۹۱

۲۸۔ حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۸۷ء ص۔۲۴۵

۲۹۔ جیلانی کامران، قائداعظم اور آزادی کی تحریک، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء ص ۵۳

۳۰۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال، مکتبہ جمال، اُردو بازار لاہور، ۲۰۱۲ء ص۔۲۸۴

۳۱۔ کاشانی حداد، شرارہ عشق، مکتبہ الذاکرین اہل بیت شاہ بک (ع) ص۔۲۰۸۔۱۳۷۷ء

۳۲۔ احمد شوقی، مشمولہ، حدیقۃ الادب، الجزالثانی، انٹرمیڈیٹ پنجاب ٹیکسٹ بک روڈ لاہور۔۲۰۱۴ء

33 JM and Mojokohen , the Penguin Dictionary of Quotations Penguin group 27 wrights lane W8 Stz 1960 P. 10

۳۴۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، مجلس ترقی ادب لاہور، جون ۲۰۰۸ء، ص۔۲

۳۵۔ ایضاً، ص۔۲۰

۳۶۔ ایضاً، ص۔۲۰

۳۷۔ ص ۲۷

۳۸۔ ص۔۲۷

۳۹۔ ایضاً،ص۔۲۹

۴۰۔ نذیر احمد، ابن الوقت، مشمولہ، مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر سنگ میل، لاہور۔۱۹۹۴ء، ص۔۱۰۵

۴۱۔ ایضاً،ص۔۲۱۹

۴۲۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی اسلام آباد اپریل ۲۰۰۹ء، ص۔۴۲

۴۳۔ مرزا احمد ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳ء، ص۔۲۳

۴۴۔ ایضاً،ص۔۳۷

۴۵۔ مولانا عبدالحلیم شرر، فردوس بریں، مجلس ترقی ادب لاہور جون ۱۹۹۵ء، ص۔۴۰

۴۶۔ رتن ناتھ سرشار، پنڈت، فسانہ آزاد، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۵ء، ص۔۳۳

۴۷۔ ایضاً،ص۔۴۱۲

۴۸۔ ایضاً،ص۔۴۵۹

۴۹۔ ایضاً،ص۔۶۷

۵۰۔ پریم چند، غبن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۳ء، ص۔۳۳۶

۵۱۔ ایضاً،ص۔۳۶۰

۵۲۔ ایضاً،ص۔۶۶۶

۵۳۔ ایضاً،ص ۳۸۷تا۳۹۷

۵۴۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، (مضمون) اقبال کا سیاسی تفکر (مشمولہ اقبال باکمال)، تاج بک ڈپو، لاہور، ۱۹۶۶، ص۔۳۹۴

۵۵۔ ایضاً،ص۔۴۲۳

۵۶۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، مکتبہ اردو ادب لاہور، ۱۹۵۹ء، ص:۳۳۹

۵۷۔ بانو قدسیہ راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۲۸۱

۵۸۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دیرا، مکتبہ اردو ادب لاہور، ۱۹۵۹ء، ص:۳۰۷

۵۹۔ ابدال بیلا، دروازہ کھلتا ہے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۶۲، ۶۶۳

۶۰۔ عبداللہ حسین، باگھ، قوسین خان چیمبرز لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۱۶

باب دوم:

پہلا دور (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۰ء) کے ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر

الف:

قیام پاکستان کے بعد کا سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامہ

قیام پاکستان کے بعد نوزائیدہ مملکت کو بہت سے سیاسی و سماجی مسائل کا سامنا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کی آبادکاری تھی۔ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے پاکستان آ رہے تھے۔ اور اپنے اوپر ڈھائے جانے والے کی داستانیں بیان کرر ہے تھے۔ان حلات میں ادباء نے ان واقعات کو ناول کی شکل میں لکھنا شروع کیا۔ یہ دور مقالہ کی تقسیم کار کے مطابق (۱۹۴۷ تا ۱۹۷۰) تک ہے۔اس دور میں ہجرت کے واقعات ہندوؤں اور سکھوں کے مسلمانوں پر مظالم اور ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔اس دور کے اہم ناولوں میں خدا کی بستی، خاک اور خون، رقص ابلیس، تلاش بہاراں، آنگن، اداس نسلیں، اور آبلہ پا شامل ہیں۔قیام پاکستان کے بعد کے سیاسی سماجی منظر پر اقتباسات کے ذریعے بحث کی گئی ہے۔

جب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا تو سیاسی و معاشی صورتحال بہت ابتر تھی ایک طرف ملک کا کوئی آئین یا دستور نہیں تھا دوسری طرف لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین بھارتی علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آ رہے تھے جن کی آبادی کاری بہت اہم مسئلہ تھا۔سیاسی حالات میں تقسیم ہندوستان میں بہت بڑی بڑی ناانصافیاں ہوئیں۔ برصغیر کی آزاد ریاستوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنی مرضی سے یا اپنے عوام کی مرضی سے شامل ہو سکتی ہیں چنانچہ ان حالات میں ریاست بہاولپور اور قلات پاکستان میں شامل ہو گئیں۔ ریاست حیدر آباد دکن ایک مسلم ریاست تھی اور اس کے والی نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا لیکن بھارت نے اس پر قبضہ کر لیا ریاست کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور عوام پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے لیکن بھارت نے اس پر بھی قبضہ کر لیا تاہم پونچھ کے مقامی لوگوں نے بھارتی فوج کے خلاف علم بغاوت کر دیا اور گوریلا جنگ شروع کر دی اور کشمیر کے کچھ علاقے آزاد کروا لیے۔ کشمیر کے علاوہ ریاست جونا گڑھ پر بھی بھارت نے

قبضہ کرلیا چونکہ بھارت برصغیر کی تقسیم نہیں چاہتا تھا اس لیے بھارت نے ہر ممکن کوشش کی کہ پاکستان کو اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ وہ تقسیم ختم کرنے پر مجبور ہو جائے اور اکھنڈ بھارت بن جائے اس لیے بھارت نے اثاثوں کی تقسیم کے حوالے سے بھی ناانصافیاں کیں۔ اثاثوں کی تقسیم کے حوالے سے آئین ٹالبوٹ مترجم طاہر منصور فاروقی یوں رقم طراز ہیں:

''پاکستان کو برطانوی راج کے زیر تصرف مالی وسائل کا بہت ہی کم حصہ دیا گیا۔ اصولی طور پر اسے غیر منقسم ہندوستان کے کل وسائل کا ۱۷.۵ فیصد حصہ ملنا چاہیے تھا لیکن دونوں ریاستوں کی حکومتوں میں پیدا ہو جانے والی بداعتمادی کی فضاء کے باعث اثاثوں کی تقسیم صحیح اور منصفانہ طور سے نہ ہو سکی..... اس طرح پاکستان کا مقرر کردہ فوجی ساز و سامان بھی ہندوستانی حکومت نے بہت پس و پیش کے بعد دیا وہ بھی حصے کے مطابق نہ تھا آرڈیننس سٹور میں سے پاکستان کا مقرر شدہ حصہ ۱۶۰،۰۰۰ ٹن تھا۔ اس ضمن میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ زیادہ دفاعی ساز و سامان بنانے کی سہولتیں اور انفراسٹرکچر ہندوستان ہی میں رہ گیا تھا۔'' (۱)

قیام پاکستان کے فوراً بعد لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین نے پاکستان کا رخ کیا ان کے لٹے پٹے قافلے پاکستان کی سرزمین پر وارد ہوتے رہے لیکن ان کی آبادکاری بہت بڑا مسئلہ تھا ان کے پاس مکان تھے نہ کاروبار۔ ان حالات کے بارے میں ''آئین ٹالبوٹ'' مترجم طاہر منصور فاروقی لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد ساڑھے تین ماہ کے دوران ہی ۶.۴ ملین مسلمان صرف مشرقی پنجاب ہی سے نقل مکانی کر کے سرحد پار آئے اس ہجرت کے ساتھ ساتھ دل دہلا دینے والی قتل و غارت بھی ہوئی۔ اس قتل و غارت کا اگر محتاط اندازہ بھی لگایا جائے تو بھی کم سے کم ۲۰۰،۰۰۰ افراد اس دوران زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تشدد اور قتل و غارت کا سب سے بہیمانہ ارتکاب پنجاب میں ہوا جسے لاہور اور امرتسر کے درمیان سے تقسیم کر کے دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا۔'' (۲)

جب کسی نوزائیدہ مملکت میں ۶ بہ ملین لوگ آ جائیں جن کے پاس مکان ہو نہ دیگر ضروریات تو پھر ایسے افراد کو آباد کرنا بہت مشکل کام تھا سب سے بڑی بات یہ کہ ان مہاجرین کا قتل عام کیا گیا ان کی عزتیں لوٹی گئیں خصوصاً سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ بہرحال حکومت پاکستان نے ان کی آبادکاری میں حصہ لیا اور جلد از جلد انہیں تمام ضروریات زندگی مہیا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ہجرت کے تناظر میں جو قتل عام ہوا اور جتنے زیادہ لوگ پاکستان آئے اس کے بارے میں نئی پاکستانی حکومت کو اندازہ نہیں تھا۔

یہ وہ حالات تھے کہ بھارت نے پاکستان کے ساتھ بہت ناانصافیاں کیں پاکستان کے حصے میں آنے والے وسائل کا پورا حصہ نہ دیا فوجی ساز و سامان اور اسلحہ بھی بڑی پس و پیش کے بعد دیا گیا بھارت کا اصل مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو اتنا کمزور کر دیا جائے کہ وہ دوبارہ ٹوٹ کر بھارت کا حصہ بن جائے لیکن یہ بھارت کا خواب پورا نہ ہوا۔ ابھی ریاستوں کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ بھارت نے پاکستان کا پانی روک دیا تا کہ پاکستان کو بنجر کر دیا جائے۔ اس حوالے سے چودھری محمد علی مترجم بشیر احمد ارشد اپنی کتاب ''ظہورِ پاکستان'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''سندھ طاس کے تنازعہ آب نے تقسیم پنجاب کی کوکھ سے جنم لیا اور منظر عام پر اس وقت آیا جب یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کے صوبے مشرقی پنجاب نے پاکستان کے صوبے مغربی پنجاب کو آنے والی نہروں کا پانی روک لیا مغربی پاکستان کی زمین زرخیز ہے۔۔فی الحقیقت سندھ کا دریائی نظام ہی مغربی پاکستان اپنی ساڑھے چار کروڑ آبادی کے عشر عشیر کا بھی کفیل نہیں ہو سکتا ہے اس کے برعکس ہندوستان میں کئی دریائی نظام ہیں جو بڑی حد تک کسی استفادہ کے بغیر سمندر میں جا گرتے ہیں مزید برآں اس کے بیشتر علاقے میں اس قدر بارش ہو جاتی ہے کہ آبپاشی کے بغیر بھی زرعی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔''(۳)

پاکستان کے دریائی پانی کی بندش پاکستان پر زوردار اقتصادی حملہ تھا تاہم بھارت کا یہ وار بھی خالی گیا اور سندھ طاس معاہدے کے تحت دریائے جہلم، چناب اور دریائے سندھ کے پانی پر پاکستان کا حق مانا گیا اور دریائے راوی، ستلج اور بیاس پر ہندوستان کا حق قرار دیا گیا۔

چوں کہ پاکستان کا قیام دوقومی نظریہ کی بنیاد پر ہوا تھا اس لیے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور

وہ علاقے بھارت میں شامل ہو گئے تھے تو مسلمانوں نے سوچا کہ وہ نئی اسلامی مملکت میں چلے جائیں جہاں اسلام کا بول بالا ہوگا، انصاف کی حکمرانی ہوگی اور مسلمان اپنی زندگیاں اسلامی نظام کے مطابق گذار سکیں گے یہی وہ محرکات تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنی جائیدادیں اور زمینیں چھوڑیں اور پاکستان کا رخ کیا۔

اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد افضال بٹ یوں رقم طراز ہیں کہ:

''ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ تقسیم کے فوراً بعد فسادات شروع ہو گئے۔ فسادات کی وجہ سے لاکھوں لوگ نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کی وجہ سے لوگ مشکلات کا شکار ہو گئے۔ ان حالات میں تمام اخلاقی اور انسان دوستی کی قدروں کو فراموش کر دیا گیا۔ لاکھوں لوگ قتل ہوئے، عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ معصوم بچوں کو بے دردی سے ہلاک کیا گیا۔ انسانوں نے درندوں کا روپ دھار لیا اور اپنے ہی بھائیوں کا شکار کیا۔'' (۴)

مہاجرین کی آبادکاری کے حوالے سے آئین ٹالبوٹ مترجم طاہر منصور لکھتے ہیں:

''مہاجروں کی ناگفتہ بہ حالت کی وجہ سے حکومت پاکستان کو ان کی بحالی و آبادکاری میں بہت دشواری ہوئی افراتفری اور انتشار کی حالت تھی۔ خاندان کے اراکین بچھڑ گئے تھے بعض کی خواتین اغواء کر لی گئی تھیں اور کچھ مہاجروں کا تو مال و اسباب مشرقی پنجاب کی پولیس نے لوٹ لیا تھا۔ اس کی ایک مثال سرالی کا پولیس سب انسپکٹر تھا جس نے کوٹ محمد خان کے دیہاتوں سے انہیں بحفاظت سرحد تک پہنچانے کے لیے ۱۰،۰۰۰ روپے بطور رشوت لیے۔'' (۵)

حکومت پاکستان کے پاس وسائل بہت کم تھے ان مہاجرین کی بحالی اور آبادکاری میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور سب سے بڑی بات یہ کہ بھارت سے آنے والے قافلوں سے مال و اسباب لوٹ لیا گیا اور خواتین کو اغواء کر لیا گیا۔ اس گھمبیر صورت حال کو ڈاکٹر محمد ذاکر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''فرقہ وارانہ تعصب اور کشت و خون کے جو مظاہرے ان دِنوں دیکھے ہیں مہذب دنیا

کی تاریخ میں ان کی مثال شاید ہی ہو۔ گھر کے گھر اُجڑ گئے۔ مکان جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ بے گناہ مکین در بدر مارے مارے پھرنے پر مجبور ہو گئے۔'' (۶)

قیامِ پاکستان کسی آسان اور آرام دہ حالات و واقعات کے نام نہیں تھا بلکہ پیش آنے والی مشکلات کو الفاظ میں بیان کرنا بے حد مشکل تھا۔ جس پر بہت سے اہلِ فکر و دانش انگشت بدنداں تھے۔ مہاجر کیمپوں کی صورتحال کے بارے میں آئین ٹالبوٹ مترجم طاہر منصور فاروقی لکھتے ہیں:

''مہاجر کیمپوں میں گندگی اور غلاظت کا یہ عالم تھا کہ وہاں ہیضہ اور دیگر بیماریاں پھوٹ پڑیں حتیٰ کہ لدھیانہ کے مضافات میں قائم مہاجر کیمپ میں اس قدر بدبو پھیل چکی تھی کہ وہاں سے ایک میل دور تک اسے بخوبی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کے وزیر برائے ریلف اینڈ ری ہیبلیٹیشن کے سی نیو بی کے مطابق روہتک سے آئے ہوئے ایک پیدل قافلے میں صرف ہیضے کی وجہ سے ۱۰۰ سے ۲۵۰ تک اموات ہوئی تھیں، اس کے علاوہ ۲۰۰ لوگ اس بیماری کا شکار ہو کر نحیف و نزار ہو چکے تھے۔'' (۷)

مہاجرین کی آبادکاری کے حوالے سے حکومت کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا دن رات مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے پاکستان آ رہے تھے۔ وسائل کم تھے اور مسائل زیادہ تھے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کی بھی کمی تھی ادویات نہ ہونے کے ہبرابر تھیں نامساعد حالات کے باوجود حکومت نے ان مسائل کو حل کیا اور مہاجرین کو آباد کیا۔

مجموعی طور پر قیام پاکستان کی سیاسی و معاشرتی صورتحال کچھ اس طرح سے ہے کہ مہاجرین کی آبادکاری بہت بڑا مسئلہ تھا جسے حکومت پاکستان نے بڑی تندہی سے حل کر لیا اگرچہ اس میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً جعلی کلیم پر لوگوں نے جائیدادیں اور زمینیں نام کروالیں۔ محکمہ مال نے اس صورت حال سے بہت فائدہ اٹھایا ملک میں کوئی بڑا کارخانہ یا فیکٹری نہیں تھی فوری طور پر واہ میں آرڈ نینس فیکٹری لگائی گئی جس سے ملک کی اسلحہ کی ضروریات پوری ہونے لگیں، ملک کا کوئی آئین نہیں تھا وقتی طور پر ۱۹۳۵ء کے آئین میں چند تبدیلیاں کر کے نافذ کر دیا گیا اور اپنا آئین بنانے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ قانون ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد منظور کرائی گئی جس میں کہا گیا کہ اقتدار مسلمانوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس اقتدار کو اللہ تعالیٰ

کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر عوام کے منتخب نمائندے استعمال کریں گے۔ ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کیا گیا جس سے ملک کی کرنسی کے مسائل حل ہونا شروع ہو گئے اور حکومت پاکستان نے اپنے سکے اور روپے جاری کرنا شروع کر دیئے ملک کے تعلیمی مسائل حل کرنے کے لیے تعلیمی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے پیغام میں فرمایا کہ ایسا تعلیمی نظام وضع کیا جائے جس سے باکردار اور اچھے مسلمان شہری پیدا ہوں۔ سول، اور فارن سروسز کا بھی آغاز کیا گیا تا کہ ملک میں با صلاحیت افسران کی کمی پوری ہو سکے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائداعظم اس نوزائیدہ مملکت کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اگلے جہان سدھار گئے۔ قائداعظم کی وفات سے بھی ملک وقوم کو بہت بڑا دھچکا لگا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد کے سیاسی وسماجی منظرنامے میں حب الوطنی کا عنصر کسی حد تک موجود تھا اس سوال کا جواب صحیح طور پر دیا جانا ممکن نہیں ہے چوں کہ ایک ایسی صورتحال کہ جب لوگوں کی ایک کثیر تعداد اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ایک دوسرے وطن میں منتقل ہو رہی ہو تو اس صورتحال میں وطن اور حب الوطنی کے بارے میں وثوق اور یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ حب الوطنی کے عناصر کی تلاش اور ان پر بحث کے لیے یہ ضروری ہے کہ قبل ازیں وطن کا تعین کیا جائے مگر اس ابتدائی دور میں نئے وطن کی تلاش میں سرگرداں لٹے پٹے قافلوں کے مکینوں میں حب الوطنی کا واضح عنصر موجود نہیں تھا۔ البتہ یہ بات ضرور کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے لیے کی جانے والی ہجرت چوں کہ ایک نظام اور ایک وطن کے لیے ہجرت تھی لہٰذا اسے حب الوطنی کی بنیاد ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کا آزادی کی خوشی میں پاکستان ہجرت کرنا پاکستان سے محبت کے زمرے میں آتا ہے۔ اور یہ ہجرت ہجرت مدینہ سے مشابت رکھتی ہیں۔ دونوں اسلام کی خاطر ہیں۔ اور دونوں میں لوگوں نے اللہ اور دین اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑا۔ جو دین کے ساتھ ساتھ اس جگہ یا وطن سے بھی محبت ہیں جہاں وہ اپنی مرضی سے آزادانہ زندگی بسر کر سکیں گے۔ پہلا دور جو (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۰ء) تک ہے۔ حب الوطنی کے عناصر کے حوالے سے درج ذیل ناولوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

ب:

متعین عہد میں پاکستانی اُردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا عمومی جائزہ

خاک اور خون (۱۹۴۹ء)

برصغیر میں رہنے والے تمام مسلمانوں کی حب الوطنی، ہندوستانی حب الوطنی بھی یعنی وہ سارے ہندوستان کو مجموعی طور پر اپنا وطن خیال کرتے تھے۔ مگر مختلف ادوار میں پیش آنے والے حالات و واقعات کے سبب اور کانگریس کی چالوں کے باعث مسلمانوں کی یہ کُلی حب الوطنی رفتہ رفتہ ایک جزوی حب الوطنی کے احساس میں تبدیل ہونے لگی۔ یعنی ہندوستان کی محبت نے پاکستان کی محبت کا روپ دھار لیا۔ نسیم حجازی ''خاک اور خون'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''مسلمانوں کی آنکھ اُس وقت کھلی جب حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس جسے آزادی کہتی تھی، وہ ہندو اکثریت کی حکومت کا دوسرا نام تھا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات نے پہلی بار کانگریس کی حکومت ہندوستان کے سات صوبوں پر مسلط کر دی۔ ہندو سیاستدانوں نے مسلمانوں کو نرغے میں لینے کے لیے جس قدر اطمینان اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا، اسی قدر وہ نرغے میں پھنسے ہوئے شکار کو مغلوب کرنے کے لیے جلد بازی پر اُتر آئے۔ واردھائی مہاتما کا زہر بھی بجھا ہوا نشتر اب آستین سے باہر آچکا تھا.....رام راج کی برکا واردھا یا ودیا مندر جیسی ناپاک اسکیموں کی صورت میں نازل ہونے لگیں۔ رب کعبہ کے سامنے سربسجود ہونے والی قوم کے بچوں کو مدارس میں گاندھی کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھنے کا سبق دیا جاتا۔ محمدؐ عربی کی نعت پڑھنے والوں کو بندے ماترم کا ترانہ سکھایا جا رہا تھا.....دختران توحید کے نصابِ تعلیم میں دیوداسیوں کے رقص شامل کیے جا رہے تھے۔''(۸)

نسیم حجازی کہتے ہیں کہ برصغیر کے وہ مسلمان جو پہلے ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب انہیں پتا چل گیا تھا کہ ہندو آزادی حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں کو غلام بنانا چا

ہتے تھے۔لیکن مسلمانوں نے اپنے الگ وطن (پاکستان) کے حصول کی کوششیں تیز کر دیں۔اوران کے دلوں میں پاکستان کے حصّول کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں کانگریس کی سات صوبوں میں حکومت بنی تو ہندوؤں کی مسلمان دشمنی کھل کر سامنے آ گئی۔مسلمانوں کو محمد عربیؐ کی نعت پڑھنے کی بجائے بندے ماترم کا ترانہ پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے نصاب میں ہندوؤں کا نصاب شامل کیا جا رہا تھا۔اب مسلمانوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی الگ مملکت ہی بنا کر رہیں گے۔

حب الوطنی کے احساس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کوئی وطن موجود ہو اور انسان اُس سے محبت کرے۔مگر ایک مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اُس وطن سے محبت کرے جو ابھی موجود نہیں ہے۔قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کرنے والے مسلمانوں کے دلوں میں حب الوطنی کا یہ دوسرا احساس اجاگر تھا۔نسیم حجازی یوں رقم طراز ہیں:

> ''مسلمان پاکستان چاہتے ہیں۔اس لیے کہ وہ ایک قوم ہیں اور ایک قوم کو بڑھنے، پھولنے اور پنپنے کے لیے آزاد وطن کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔اس لیے کہ وہ انسان ہیں اور ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی کا بوجھ اُٹھانے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ جب مسلمان پاکستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اُس کے ذہن میں وہ دماغی مورچہ ہوتا ہے جہاں اُسے ہندو اکثریت کے جارحانہ مقاصد سے نجات مل سکتی ہے اور جب ہندو متحدہ ہندوستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک ایسی وسیع شکارگاہ ہوتی ہے جہاں اکثریت کے بھیڑیے کسی روک ٹوک کے بغیر اقلیت کی بھیڑوں کا شکار کھیل سکتے ہیں۔'' (۹)

برصغیر کے مسلمان اب اپنا الگ وطن چاہتے ہیں۔اس لیے کہ وہ ایک قوم ہیں۔ایک قوم کو ترقی کرنے کے لیے آزاد وطن کی ضرورت ہوتی ہے۔دنیا کے تمام انسان برابر ہیں۔اکثریت کے بل بوتے کسی ایک قوم کو محکوم نہیں بنایا جا سکتا۔جب مسلمان قیام پاکستان کی آواز بلند کرتے ہیں تو اُن کے ذہن میں ہندو اکثریت سے الگ آزادانہ مملکت کا حصول ہوتا ہے۔اور جب وہ ہندو متحدہ ہندوستان کا نعرہ لگاتے ہیں تو اُن کے ذہن میں پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب ہوتا ہے۔یہ خواب مسلمان کبھی بھی پورا نہیں ہونے دیں گے۔اور نہ ہی ہوا ہے۔اصل میں

ہندو یہ چاہتے ہیں کہ آزادی کے بعد برصغیر کی تمام قوموں کو اپنے تسلط میں لے کر غلام بنانا چاہتے تھے۔ جسے مسلمانوں نے ناکام بنادیا۔حب الوطنی کا احساس صرف اور صرف کوئی ایسا احساس نہیں ہے۔کہ جس کا کوئی ضمنی اثر نہ ہو۔حب الوطنی کا احساس جب کسی قوم میں اجاگر ہوتا ہے تو ایک مخالف جذبہ رکاوٹ کی دیوار بن کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔یہی کچھ قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کرنے والے محبّ وطن افراد کے ساتھ ہوا کہ کانگریس اور پاکستان مخالف خواتین ان کے راستے میں آ کھڑی ہوئیں۔نسیم حجازی یوں رقم طراز ہیں:

''ہندو، تحریک پاکستان کے خلاف متحد اور منظّم ہو چکا ہے۔مہاسبھائی ہندو، کانگرسی ہندو، سناتن دھرمی ہندو، آریہ سماجی ہندو، تشدد پر ایمان رکھنے والا ہندو اور عدم تشدد کی تبلیغ کرنے والا ہندو، بظاہر مسلمانوں کو امن اور شانتی کا پیغام دینے والا ہندو، اور در پردہ مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے راز شٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کی فوجیں تیار کرنے والا ہندو سب ایک ہو چکے ہیں اور اگر ہم نے اپنے مستقبل سے آنکھیں بند نہیں کر لیں تو ہمیں بھی ایک ہونا پڑے گا۔یاد رکھیے! اگر ہم اجتماعی نجات کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے تو مشترکہ تباہی میں ایک دوسرے کے ساتھی ضرور ہوں گے۔'' (۱۰)

تحریک پاکستان اور تحریک آزادی کے دوران ہندو مسلمانوں کے خلاف متحد ہو چکا تھا۔وہ کسی بھی صورت میں آزاد پاکستان کے حق میں نہیں تھے۔وہ سادہ لوح مسلمانوں کو سہانے خواب دکھا کر قیام پاکستان کے خلاف کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔جب کہ مسلمان یہ عہد کر چکے تھے کہ وہ ہر صورت میں پاکستان بنا کر دم لیں گے۔ مسلمانوں کا ایک آزاد وطن کے لیے متحد ہونا وطن اور قوم سے محبت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

کسی بھی قوم کی اجتماعی حب الوطنی اگرچہ رفتہ رفتہ مختلف حالات و واقعات کے باعث پروان چڑھتی ہے مگر بعض اوقات اس میں ایسی ڈرامائی تبدیلیاں آ جاتی ہیں کہ حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات بھی کروٹ لے لیتے ہیں۔علیحدہ ملک کا احساس رکھنے والوں سے بھی ایسا ہی ہوا۔کہ خضر حیات نے کانگرس سے اپنا رشتہ توڑ دیا۔اس بارے میں نسیم حجازی یوں رقم طراز ہیں:

''پاکستان کے نعرے کو جو تقویت برسوں میں حاصل نہ ہوئی تھی، وہ اس چونتیس دن کی عملی

جدوجہد میں حاصل ہو چکی تھی۔ بالآخر خضر حیات خان کانگرس کے رتھ سے اچانک اپنا رسا تڑوا کر بھاگا اور گورنر نے مجبوراً مسلم لیگ کے لیڈر کو تشکیل وزارت کی دعوت دی لیکن کانگر س اس صورتِ حالات کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ مکڑی جس نے برسوں کی محنت سے مکروفریب کے سُنہری تاروں کا جال تیار کیا تھا، منہ میں آیا ہوا شکار جاتے دیکھ کر آپے سے باہر ہوگئی۔ ہندو ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں اس لیے حکمران تھا کہ وہاں ہندو کی اکثریت تھی۔ ہندو مسلم اکثریت کے صوبوں میں اس لیے برسرِ اقتدار رہنا چاہتا تھا کہ وہاں بعض ماؤں نے مِلت فروشوں کو جنم دیا تھا۔ اب ہندو اس لیے برہم تھا کہ پنجاب کی مُسلم اکثریت اُس کے تسلط سے آزاد ہو رہی تھی۔ اُس کے نزدیک پنجاب میں مسلم اکثریت کی نمائندہ وزارت کا قیام پانچ دریاؤں کی سرزمین کے عملی طور پر پاکستان میں شامل ہو جانے کے مترادف تھا۔'' (۱۱)

مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے نتیجے میں اب تحریک آزادی کو خصوصاً چونتیس دنوں میں عروج حاصل ہو چکا تھا۔ خضر حیات نے کانگرس سے علاحدگی اختیار کی تو ہندوؤں کو بہت بڑا دھچکا لگا۔ انھوں نے برسوں سے مکرو فریب کا جو جال بنا رکھا تھا۔ یک دم ٹوٹ گیا۔ اب انہیں منہ میں آیا ہوا شکار نکلتے دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ لیکن مسلما نوں کے عزم مسلسل سے اُن کے تمام ارادے خاک میں مل گئے۔ مسلمانوں کی اپنی قوم کے لیے الگ وطن حاصل کر نے پر ڈٹ جانا حب الوطنی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

اجتماعی حب الوطنی کو لے کر کسی مقصد اور نظریئے کے تحت جدوجہد کرنے والے قافلے جب منزل پر پہنچتے ہیں تو اُس کا احساس ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جدوجہد کا ثمر ملتا ہے۔ تمنائیں اور حسرتیں پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور خواہش حقیقت کا روپ دھار کر سامنے کھڑی ہوتی ہیں۔ قیام پاکستان کا منظر بھی اسی طرح کا ایک واقعہ ہے۔ نسیم حجازی نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

''چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی رات کو مسلمانوں کے گھروں میں آزادی کے نعرے اور مسرت کے قہقہے گونج رہے تھے۔ بارہ بج کر ایک منٹ پر پاکستان اور ہندوستان کی

آزاد مملکتیں وجود میں آ چکی تھیں۔ گاؤں کے مسلمانوں کے گھروں میں چراغاں کیا جا رہا تھا۔ کمسن لڑکے پٹاخے اور پھلجھڑیاں چلا رہے تھے اور بڑے مسجد میں جمع ہو کر شکرانے کے نفل پڑھ رہے تھے۔ سلیم نے ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر اپنے بالا خانے کی چھت پر پاکستان کا جھنڈا نصب کیا۔ مجید اس کے قریب گیس بتی لیے کھڑا تھا۔ نیچے باہر کی حویلی اور مسجد کے ساتھ کھلی جگہ میں جمع ہونے والے لوگ ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔''(۱۲)

جب قیام پاکستان کا فیصلہ ہو گیا تو ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی شب کو مسلمانوں کے گھروں میں آزادی اور خوشی کے نعرے گونج رہے تھے۔ بارہ بج کر ایک منٹ پر دنیا کے نقشے پر پاکستان اور ہندوستان دو آزاد مملکتیں وجود میں آ چکی تھیں۔ مسلمانوں کے گھروں میں چراغاں کیا گیا تھا۔ اور بزرگ مسجد میں شکرانے کے نوافل ادا کر رہے تھے۔ سلیم نے اپنے گھر پر پاکستان کا جھنڈا لگایا۔ لوگ گلیوں میں پاکستان زندہ آباد کے نعرے لگا رہے تھے۔ پاکستان سے محبت کرنا ہی دراصل حب الوطنی ہے۔

حب الوطنی کا احساس محض ایک خاموش جذبہ ہی نہیں ہوتا کہ دل کے کسی کونے میں پروان چڑھتا رہے۔ پھلے، پھولے، ثمر بار ہو اور بس۔ حب الوطنی کا جذبہ قربانی بھی مانگتا ہے۔ وقت کی قربانی، گھر بار کی قربانی، غربت کی قربانی، مال اور جان کی قربانی، جان کی قربانی کو شہادت کا نام دیا جاتا ہے اور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ہر شہادت کے پیچھے حب الوطنی کا جذبہ ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ نسیم حجازی اپنے ناول خاک اور خون میں یوں رقم طراز ہیں:

''بالا خانے کی منڈیر پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ چند گولیاں جھنڈے کے بانس میں لگیں اور وہ درمیان سے ٹوٹ کر اسماعیل کے اوپر گر پڑا۔ اسماعیل ٹوٹا ہوا جھنڈا پکڑ کر پیٹ کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ منڈیر کے قریب پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل اٹھا اور پھر ایک ہاتھ سے منڈیر کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے ہاتھ سے جھنڈے کو اپنے سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے پکارا۔ ''پاکستان زندہ باد! پاکستان زندہ باد! پاکستان.....''
ایک گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ جھنڈے سمیت منہ کے بل گر پڑا۔ سبز جھنڈے پر

سفید چاند اور ستارے کا نشان اس کے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔'' (۱۳)

جب قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا تو ہر طرف فسادات پھوٹ پڑے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ جہاں بھی مسلمان ملتے بچے، بوڑھے، جوان اور عورتیں یا چھوٹی چھوٹی بچیاں انہیں موقع پر ہی قتل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے گھروں میں مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ اسماعیل کے گھر میں پاکستان کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ کچھ گولیاں جھنڈے کے بانس پر لگیں تو بانس ٹوٹ کر اسماعیل کے اوپر گر پڑا۔ اسماعیل جھنڈا اٹھا کر نعرے لگانے لگا۔ ''پاکستان زندہ باد، پاکستان زندہ باد'' ایک گولی اس کو لگی اور وہ جھنڈے سمیت گر پڑا اور وطن کی محبت پر شہید ہو گیا۔

اجتماعی حب الوطنی کے جذبے کی جب تاریخ پاکستان کے تناظر میں تشریح کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس جذبے کی سرسراہٹ بیک وقت لاکھوں دلوں میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب لوگوں نے ایک سمت قافلے کی شکل اختیار کی۔ اس قافلے کو قائداعظم کی صورت میں ایک محبّ وطن قائد بھی میسر تھا۔ قیام پاکستان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اجتماعی حب الوطنی اور اجتماعی کاوش کا ثمر ہے۔ نسیم حجازی ''خاک اور خون'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''پاکستان ہزاروں مصیبتوں، ہزاروں ناامیدوں اور ہزاروں پریشانیوں کا سامنا کر رہا تھا، افق پر تاریک آندھیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔۔۔ لیکن اس مُہیب طوفان میں بھی روشنی کا ایک مینار اپنی جگہ قائم تھا۔۔۔ قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کے ملاح قائداعظمؒ محمد علی جناح کے الفاظ بجھے ہوئے دلوں میں یقین اور ایمان کی مشعلیں روشن کر رہے تھے۔۔۔ ''پاکستان کو اب کوئی نہیں مٹا سکتا تھا۔ ہم ان تاریکیوں اور طوفانوں سے سرخرو ہو کر نکلیں گے۔'' (۱۴)

پاکستان بے شمار قربانیوں کے نتیجوں میں معرض وجود میں آیا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے انتھک محنت اور کوشش کرنا پڑی۔ اور نوزائیدہ مملکت مصیبتوں، ناامیدیوں اور پریشانیوں کا شکار تھی۔ ان حالات میں اس کشتی کے ملاح قائداعظم محمد علی جناحؒ کے الفاظ مردہ دلوں میں یقین اور ایمان کی شمعیں روشن کر رہے تھے۔ قائداعظمؒ کے یہ الفاظ ''پاکستان کو اب کوئی نہیں مٹا سکتا ہم ان تاریکیوں اور طوفانوں سے سرخرو ہو کر نکلیں گے''۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے حوصلے اور مستقل مزاجی سے جلد ہی تمام مسائل پر قابو پا لیا گیا۔ اگرچہ قائد کی عمر نے وفا نہ کی تاہم وہ ملک کو ایک

پٹڑی پر چڑھا چکے تھے۔نسیم حجازی نے قائداعظم کے الفاظ کو اپنے ہم وطنوں کے لیے دیئے میں تیل ڈالنے والی بات قرار دیا ہے اور یہ الفاظ وطن سے محبت کے غماز ہیں۔

قیام پاکستان کے لیے جدو جہد کرنے والوں کی حب الوطنی نے جب آخر کار پاکستان کی تشکیل کا خواب حقیقت میں بدل لیا تو ایک اور آفت آن پڑی۔ ہندوستان نے کشمیر پر عوامی رائے کے خلاف قبضہ کر لیا۔ پاکستان کے قبائلی اور دیگر علاقوں کے لوگ کشمیری محکوم افراد کی امداد کے لیے روانہ ہو گئے۔ان کا یہ عمل حب الوطنی کی ایک ایسی تصویر ہے، جو کسی ہم وطن پر ظلم کے نتیجے میں اجاگر ہوتی ہے۔نسیم حجازی اپنے ناول ''خاک اور خون'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''موسم بہار کی ایک صبح عصمت اور راحت راولپنڈی میں سڑک کے کنارے ایک مکان کے پھاٹک میں کھڑی کشمیر جانے والے مجاہدین کو دیکھ رہی تھیں۔لوگ سڑک کے کنارے اللہ اکبر اور مجاہدین کشمیر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ لوگ مختلف مقامات سے کشمیر، پاکستان اور عالمِ اسلام کی طرف سے پٹیل اور نہرو کو جواب دینے آئے تھے، یہ لوگ اپنی دیسی رائفلوں سے دشمن کے ٹینکوں، طیاروں اور توپوں کا مقابلہ کرنے آئے تھے۔عصمت اور راحت ان بجلیوں کو دیکھ رہی تھیں جنھیں مشرقی پنجاب کی راکھ نے جنم دیا تھا۔مجاہدین کا لشکر گزر گیا اور عصمت آبدیدہ ہو کر کہہ رہی تھی۔''میرے بھائیو! بڑھے چلو۔خدا تمھیں محمود غزنویؒ کا عزم اور محمد بن قاسمؒ کی غیرت عطا کرے۔تمھیں کشمیر میں بیگناہوں کا خون پکار رہا ہے۔تمھیں مشرقی پنجاب کی مساجد بُلا رہی ہیں۔'' (۱۵)

قیام پاکستان کے بعد کشمیری مسلمانوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا انڈیا نے زبردستی کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کر دیں۔ان حالات میں پاکستان سے مجاہدین کشمیری مجاہدین کی مدد کے لیے جا رہے تھے۔ یہ اُسی ماحول کی منظر کشی کی گئی ہے۔موسم بہار کی ایک صبح عصمت اور راحت تھیں۔لوگ اللہ اکبر اور مجاہدین کشمیر زندہ باد کے نعرے لگا کر مجاہدین کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔جب مجاہدین کا لشکر گزر گیا تو عصمت رو رو کر کہہ رہی تھی کہ! میرے بھائیو! بڑھتے چلو خدا تمھیں محمود غزنویؒ کا عزم اور محمد بن قاسمؒ کی غیرت عطا کرے۔ایک

عورت کے یہ الفاظ پاکستان سے محبت کا بہترین اظہار ہیں۔

علی پور کا ایلی (۱۹۶۱ء)

کسی بھی علاقے کی بود و باش میں بازار کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ لوگوں میں رابطے کی مرکزی جگہ بازار اور منڈیاں ہی ہوتی ہیں۔ جہاں لوگ بیٹھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ دکھ درد بانٹتے ہیں اور ایک دوسرے کے حالات و واقعات سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ لوگوں میں یہ باہم اشتراک وطن کی محبت بھی اجاگر کرتا ہے۔

ممتاز مفتی رقم طراز ہیں:

> ''علی پور کے بازاروں میں لوگ دکانوں پر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے، دنیاوی اور مذہبی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے۔ کوئی اس اہم بات پر روشنی ڈالتا کہ شیخ عظمت بیگ کے گھر اولاد کیوں نہیں ہوتی۔ کوئی نقطہ سمجھاتا کہ آصف علی کی بیگم دراصل کس خاندان سے ہے۔ ایک اس امر کی وضاحت کرتا کہ نورے حجام کے پاس وہ کونسا بے نظیر نسخہ ہے جو تنکوں کے حساب سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک یہ راز فاش کرتا کہ بابو سمیع کے لڑکے اعظم بیگ کی بیوی کی آنکھیں اتنی متکلم کیوں ہیں۔'' (۱۶)

انسان جہاں رہتا ہے اس علاقے سے محبت کرتا ہے۔ علی پور کے بازاروں کا ذکر لوگوں کا دکانوں پر بیٹھ کر حقہ پینا اور دنیا بھر کی باتیں کرنا۔ ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ انسان کا گھر صرف اُس کے رہنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ اس کے آس پاس سننے والے سب لوگ اور پورا ماحول ایک ایسی فضا تخلیق کرتا ہے جس سے گھر اور وطن کی محبت دونوں مل کر پروان چڑھتی ہیں۔ ممتاز مفتی یوں رقم طراز ہیں:

> ''سکول سے بہت دور شہر کے دوسرے سرے پر علی احمد کا مکان ایک گلی میں واقع تھا۔ اس مکان میں چار کمرے تھے۔ ایک بہت بڑا صحن جس میں ایک کونے پر خاردار درخت لگا

تھا۔ مکان کے ایک طرف کئی ایک غریب کنبے آباد تھے۔ وہیں ایک کوٹھڑی میں مائی رفیقاں اوراس کا بیٹا گاما رہتے تھے۔ دوسری طرف ایک گھوڑا ڈاکٹر رہتے تھے جن کا رنگ بے حد کالا تھا مگر جن کی پیشانی محراب دار تھی۔'' (۱۷)

اس پیرا گراف میں علی احمد کے مکان کا محل وقوع بیان ہوا ہے۔ یہ مکان سکول سے بہت دور شہر کے دوسرے سرے پر واقع تھا۔ مکان کے چار کمرے تھے اور بہت بڑا صحن بھی تھا۔ صحن کے ایک کونے پر خاردار درخت تھا۔ مکان کے ایک طرف کئی غریب گھرانے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک کوٹھڑی میں رفیقاں مائی اور اس کا بیٹا گاماں رہائش پذیر تھے۔ مکان کی دوسری طرف ایک گھوڑا مار ڈاکٹر کی رہائش گاہ تھی۔ مکان جہاں انسان رہتا ہے اُس کا محل وقوع اور اردگرد کے رہنے والوں کے بارے میں بیان کرنا اپنے وطن اور گھر سے محبت کا اظہار ہے۔

حب الوطنی کے تجزیئے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہر انسان کو اپنے وطن سے جو مجموعی محبت ہوتی ہے۔ اس میں بہت سی جزئیات بھی شامل ہوتی ہیں۔ جن میں ایک اہم جزو وطن کا ہے۔ انسان جس جگہ بھی ہو اپنے وطن کا نام سن کر چونک اُٹھتا ہے۔ ممتاز مفتی یوں رقم طراز ہیں:

علی پور.....اس کے کان میں آوازیں پڑیں۔

ایلی چونکا.....گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔

''ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ نام مانوس سا ہو۔ جیسے وہاں اسے کچھ کرنا ہو۔ اس نے سامنے دیکھا ہاجرہ سوٹ کیس اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ وہ سامان اٹھانے لگا باہر پلیٹ فارم پر دھندلکے کا ایک پھیلاؤ تھا۔ اس پھیلاؤ میں گویا لوگ تیر رہے تھے۔ وردی والا بابو ہاتھ میں جھنڈی اٹھائے گھور رہا تھا۔ سر پر بستر ے اٹھائے وہ ایک سرخ پوش بہاؤ کو چیرتے ہوئے جا رہے تھے۔'' (۱۸)

جب ایلی کے کان میں آوازیں پڑیں علی پور علی پور وہ چونکا اور گاڑی رک گئی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ یہ نام مانوس سا ہے۔ اُس نے سامان اُٹھایا اور گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ علی پور علی پور کی آواز اپنے وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

انسان کے نصیب میں حصول رزق کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھانا لکھا ہوا ہے۔ وہ اپنے دیس سے پردیس اور دیگر کئی علاقوں میں ساری عمر خاک چھانتا پھرتا ہے۔ مگر اس سارے سلسلے میں اس کا دھیان آبائی وطن کی طرف ہی ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی یوں رقم طراز ہیں:

''قاضی پور سے ایلی کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ اور اب وہ گروپتن میں مقیم ہے۔ گروپتن ایک چھوٹا سا خوبصورت سا قصبہ تھا۔ اس میں دو ایک کشادہ سڑکیں جن پر بنگلے اور کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک تنگ و تاریک بازار تھے شہر کے باہر چند ایک صاف ستھری آبادیاں تھیں کچھ حصہ گھٹا گھٹا سا تھا جیسے پرانے شہروں میں ہوتا ہے۔ گروپتن میں طرز کہن اور طرز جدید دونوں پہلو موجود تھے۔'' (۱۹)

ایلی نے ملازمت کے سلسلے میں قاضی پور میں بھی کچھ وقت گزارا تھا۔ اور اب وہ گروپتن میں مقیم تھا۔ یہاں پر بھی اُس نے کچھ وقت گزارا۔ اور گروپتن کے بارے میں بتایا ہے کہ گروپتن ایک چھوٹا سا خوبصورت قصبہ تھا۔ سڑکیں کھلی تھیں۔ تنگ و تاریک بازار تھے۔ شہر تقریباً صاف ستھرا تھا۔ گروپتن میں قدیم و جدید دونوں قسم کی عمارات تھیں۔ گروپتن میں چونکہ ایلی کچھ عرصہ رہا تھا۔ اُسے وہاں سے محبت تھی۔ اس لیے اس نے بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے اور یہی وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

قیام پاکستان سے مسلمانوں کی حب الوطنی کو دو وجوہات کے باعث زیادہ تقویت ملی ایک انگریز کی غلامی سے نجات اور دوسرا ہندو کے تسلط کا خاتمہ۔ قیام پاکستان سے قبل کے حالات و واقعات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس دور میں مسلمانوں کی حب الوطنی کا جذبہ تسلط کی دو دبیز تہوں میں دبا ہوا تھا۔ جو اب ظاہر ہو گیا۔ ممتاز مفتی یوں رقم طراز ہیں:

''جب ہندوستان کی آزادی کی آواز بلند ہوئی تو ایلی کو بے حد خوشی ہوئی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کا ملک آزاد ہو جائے۔ اور کوئی بیرونی طاقت اس ملک پر مسلط نہ رہے۔ ایلی کے دل میں ان مجاہدوں کے لیے احترام تھا جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ ہندوستان کے لیڈروں پر ناز کرتا تھا۔ مثلاً مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح۔ اس کے

باوجود اس نے کبھی کسی سیاسی مجلس میں حصہ نہ لیا تھا۔ اور نہ ہی ان محبوب لیڈروں کو کبھی دیکھا تھا۔ حالاں کہ اس زمانے میں سیاسی بیداری بڑھ چکی تھی۔ اور لوگوں کے دلوں میں سیاسی جذبہ یوں لہریں لے رہا تھا کہ ذاتی مسائل بھی پس پشت پڑ چکے تھے۔ پاکستان کے قیام کے سوال ان دنوں پیش پیش تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی دھوم مچی ہوئی تھی یوپی کے مسلمان پاکستان کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں علم وادب کی جگہ سیاسیات کا ابال آیا ہوا تھا۔'' (۲۰)

ہندوستان میں جب آزادی کی آواز بلند ہوئی تو ایلی بہت خوش ہوا وہ چاہتا تھا کہ اس کا ملک آزاد ہو۔ وہ مسلم اور غیر مسلم لیڈروں کا بہت احترام کرتا تھا۔ قیام پاکستان کا سوال بھی ان دنوں پیش پیش تھا۔ جس سے ایلی بہت خوش ہوتا تھا۔ ہندوستان کی انگریزوں سے آزادی اور پاکستان کا قیام وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

حب الوطنی کے جذبے کی بعض اوقات تقسیم یوں ہوتی ہے کہ محبّ وطن اپنے آپ کو وطن خیال کرنے لگتا ہے۔ مثلاً ایرانی کا ایران ہونا پنجابی کا پنجاب ہونا اور پاکستانی کا پاکستان ہونا یہی صورت حال ایلی کے ساتھ بھی در پیش آئی۔ مفتی یوں رقم طراز ہیں:

''ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان ہی نہیں وہ بذات خود پاکستان ہے۔ چاہے وہ پاکستان کے حق میں تھا۔ یا خلاف چاہے وہ اسلام سے بیگانہ تھا چاہے وہ مذہبی تعصب سے بے نیاز تھا۔ وہ بذات خود پاکستان تھا۔ اس کے دل میں کوئی چلا رہا تھا پاکستان زندہ باد۔'' (۲۱)

ایلی نے یہ بات محسوس کی کہ وہ صرف مسلمان ہی نہیں بل کہ وہ خود پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کے حق میں تھا یا نہیں۔ وہ بذات خود پاکستان تھا۔ اُس کے دل میں یہ آواز آرہی تھی۔ وہ ''پاکستان زندہ باد'' یہی چیز حب الوطنی ہے۔ وطن کی محبت کا پہلو دار جذبہ بہت سی شاخیں رکھتا ہے۔ اس کی ذیل میں بہت سے معاملات آتے ہیں۔ وطن کی خاک کا ہر ذرہ دیوتا ہوتا ہے۔ وطن کی ہر چیز مدارس، اخبارات، ریڈیو اور اس طرح کے دوسرے ذرائع بھی اپنے اندر ایک جادوئی کشش رکھتے ہیں۔ اور ان کو دیکھ یا سن کر احساس میں عجیب طرح کی تازگی جاگ اُٹھتی ہے۔ ریڈیو پا

کستان کے اعلان اول کو سن کر ایلی پر یہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ممتاز مفتی اس حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

''ریڈیو نے مہر سکوت توڑ دی۔

طبل بجنے لگا۔

جیسے دور بہت دور ایک دل دھڑک رہا ہو۔

وہ مدھم دھڑکن قریب آ رہی تھی.....اور قریب.....اور قریب۔

''ہم ریڈیو پاکستان سے بول رہے ہیں۔'' (۲۲)

ریڈیو نے خاموشی توڑ دی۔طبل بجنے لگا۔ایلی نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے بہت دور ایک دل دھڑک رہا ہو۔ وہ ہلکی دھڑکن اس کے نزدیک آ رہی تھی۔اور قریب.....اور قریب۔

''ہم ریڈیو پاکستان سے بول رہے ہیں''

ایلی نے جب یہ آواز سنی تو بہت خوش ہوا۔اور سوچنے لگا کہ ہمیں ایک تو انگریزوں سے آزادی حاصل ہوگئی ہے۔اور دوسرا ہندوؤں کے تسلط سے نجات مل گئی ہے۔درج بالا تمام چیزیں وطن سے محبت کا اظہار ہیں۔یہ ناول انسانوں کی نفسیاتی سوچ کا عکاس نظر آتا ہے۔اس میں پاکستان بننے سے پہلے کے حالات وواقعات کا ذکر کر کے مصنف نے ایلی کی پاکستان سے محبت کا ذکر بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ایلی جب یہ سنتا ہے کہ ہم ریڈیو پاکستان سے بھول رہے ہیں۔تو اس کے دل میں پاکستانیت جاگ اٹھتی ہے۔اور اس کا دل اپنے وطن (پاکستان) کی آزادی کی خوشی میں جھومنے لگتا ہے۔اور وہ خود کو ذہنی طور پر آزاد محسوس کرتا ہے۔میری دانست کے مطابق حب الوطنی (اپنے ملک سے محبت) ذہنی کیفیت کا نام ہے۔جو مختلف واقعات کرداروں اور شخصی اعمال کے ذریعے عیاں ہوتی ہے۔

ج:

متعین عہد میں پاکستانی اُردو ناولوں میں حب الوطنی کا خصوصی جائزہ

رقص ابلیس (۱۹۴۷ء)

ایم اسلم کے قلم سے ''رقص ابلیس'' شاہکار ناول میں انقلاب ۱۹۴۷ء کی خون جما دینے والی داستانیں تحریر ہیں۔آزادی کی نوید برصغیر کے تمام لوگوں کے لیے خوشی کا پیغام تو لائی ہی تھی مگر سب اس آگ اور خون کی ہولی سے بے خبر تھے۔اس ناول میں اس کے نام کی طرح تمام شیطانی دماغوں نے اور وقت کے فرعونوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ناحق لوگوں کی جان و مال کو جس طرح بے دردی سے روندا ہے ان تمام کا حال بیان ہے۔ایم اسلم لکھتے ہیں:

> ''یہ تو کسی کا سان وگمان بھی نہ تھا کہ سیاسی حالات ایک قوم کی تنگ نظری کے باعث اس طرح بگڑ جائیں گے اور سیاسی اختلافات اچانک ایسی خوفناک صورت اختیار کر لیں گے کہ نہ مسلمان کی جان محفوظ رہے گی نہ ہندو اور سکھ کی۔لیکن آج صبح سے ہی حالات بگڑتے نظر آ رہے تھے۔کاروبار تقریباً بند تھا، بازار سنسان پڑے تھے۔لوگوں کے چہروں سے خوف و ہراس مترشح ہو رہا تھا۔سرکاری ملازم بھی آج دفاتر نہیں گئے تھے۔نفرت اور فرقہ ورانہ عداوت کی آگ چپکے چپکے سینوں میں سلگ رہی تھی۔ایک قوم کے جذبات دوسری قوم کے خلاف بھڑک رہے تھے۔ابھی دن کچھ ایسا بھی نہیں گیا تھا کہ ادھر ادھر سے فساد کی خبریں آنے لگیں اور کبھی کوئی زخمی بھی خون کے چھینٹوں سے گل رنگ نظر آ جاتا۔زخمی ہونے والوں میں جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی، بچے بھی تھے اور عورتیں بھی، بھک منگے بھی تھے اور اپاہج بھی۔پردیسی بھی تھے اور شہر والے بھی۔'' (۲۳)

ناول کے اس حصے میں آزادی کے اعلان کے اوائل کے فسادات کا ذکر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اعلان آزادی کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ہیں وہ برصغیر کی قوموں کے لیے انتہائی خوف و ہراس کا باعث ہیں۔اس قسم کے حالات آن پڑے ہیں کہ کوئی بھی شخص خواہ کسی بھی قوم و مذہب کا ہو، کہیں بھی ہو، محفوظ نہیں کوئی بھی ملازم اپنے دفتر

نہیں گیا، ہر طرف خوف و دہشت کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ناول نگار نے نہایت مہارت سے اس وقت کا نقشہ کھینچا ہے جیسے وہ خود وہاں موجود تھے، اسی طرح قاری بھی انداز تحریر میں اس قدر محو ہے کہ وہ خود کو ان حالات میں مبتلا پاتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قومیت پرستی کی جو آگ لوگوں میں سلگتی تھی، اور جو نفرت کا لاوا پک رہا تھا، وہ پھٹ پڑا۔ آج کوئی اس نفرت اور تعصب سے محفوظ نہیں۔ کسی بھی شخص کو چاہے وہ کسی رنگ و نسل، مذہب و قومیت کا ہو، اسے امان نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آج سب ظلم، قتل و غارت گری کی عام اجازت ہے۔

ناول نگار مزید کہتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابلیس نے آج ہر فرقہ پرست، ہوس و حرص کے مارے ہوؤں، دولت کے پجاریوں کے دلوں اور دماغوں میں یہ ڈال دیا ہے کہ جو چاہو کرو، سب جائز ہے۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں، فسادی، بچوں، بوڑھوں، بیمار، معذور، غرض کسی بھی ذی روح کو آج زندہ نہ چھوڑنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

یہ سب ان اشتعال انگیز اور نفرت آمیز جلسے جلوسوں اور تقریروں و بیانات کی بدولت ہو رہا ہے جو ایک تنگ نظر قوم کے فساد پسند رہنما کرتے آئے ہیں آج لوگ ان کی توقع کے عین مطابق ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔

یہاں سب سے قابل ذکر امر یہ ہے کہ جس قوم کو شدید مشکلات اور خوف و ہراس کا سامنا ہے وہ مسلمان ہیں۔ تمام قومیں متحد ہو کر نہتے اور معصوم مسلمانوں کی جان و مال کے دشمن بن گئے ہیں۔ ہندو اور سکھ، انگریزوں کی پشت پناہی کے بل پر مسلمانوں کو قتل کرنے کے پے در پے ہیں۔ تمام دوسری قومیں اور خاص طور پر ہندو شروع سے ہی مسلمانوں کے خلاف نفرت دل میں دبائے بیٹھے تھے اور آگ جب انہیں انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کے غلبے سے نجات مل رہی ہے تو سب ان کو جائز حق سے محروم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسلمان کی آج جان محفوظ ہے نہ مال، نہ عزت محفوظ ہے نہ عصمت۔ ایک قیامت کا سا سماں ہے مگر اپنے وطن کی محبت ہے کہ لوگ مرنے کٹنے اور لٹنے کے باوجود بس آزاد وطن کی چاہ میں گم ہیں۔ یہ حب الوطنی ہی کا جذبہ ہے کہ اپنا سب کچھ کھونے کے بعد بھی اور آنے والے تمام اندیشوں سے باخبر ہوتے ہوئے بھی لوگ چلے جا رہے ہیں اور یہ خوشی، امید ایک آزاد وطن کی ہے۔

ایک اور دن کا احوال ملاحظہ ہو کہ جس میں ناول نگار نے مزید اور واضح الفاظ میں ہندوستان میں آنے والے انقلاب کا نقشہ کھینچا ہے:

''نقارے بج رہے ہیں۔ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔موٹر کے ہارن کی بھوں بھوں تلخ اور تیز سیٹیاں،گلی گلی سے، محلے محلے سے، ہر کوچہ و بازار سے ڈم ڈم ڈم، پھر نعرہ توحید، اللہ اکبر! ایک فلک شگاف نعرہ، پاکستان زندہ باد اور ساتھ ہی ''جے ہند'' کی گرجتی ہوئی آواز۔ست سری اکال کا شور، پھر اکا دکا بندوق یا پستول چلنے کی آواز، تڑاخ تڑاخ، پھر پولیس کی گولیاں، ٹھاں ٹھاں، ٹھیں، ٹھیں، ٹھیں ٹھا ٹھاں، تھاں اور بم پھٹنے کا خوفناک دھماکہ اور لوگوں کا شور وغل۔'' (۲۴)

ان سطور میں ناول نگار نے ایک دن کے حالات بیان کیے ہیں کہ ہر گلی، محلّہ اور بازار سے پاکستان زندہ باد کی آواز گونجتی اور ساتھ ہندو اپنے وطن کا نعرہ لگاتے۔ڈھول باجے بج رہے ہیں، ایک عجیب وغریب شور ہے۔جب سب اپنے اپنے نعرے لگاتے ہوئے آمنے سامنے آتے ہیں تو کہیں کوئی گولی چلا دیتا ہے۔پھر پولیس آجاتی ہے، کہیں کوئی بم پھٹتا ہے۔لوگوں کا شور، فضا میں بارود کی بدبو، گولیوں کی آوازیں الغرض ایک ہنگامہ برپا ہے۔

جب قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو مسلمان خوشی سے نعرے لگانے لگے اور نعرہ تکبیر بلند کرنے لگے، جس کے جواب میں ہندو مرہٹے بھی باہر نکل آئے اور گلی گلی، محلّہ محلّہ بازار میدان جنگ کا منظر پیش کرنے لگے۔وطن کی محبت لوگوں کو باہر لے آئی اور وہ بے خوف ہندوؤں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور یہی خوشی اور کامیابی اور بے خوفی ہندوؤں اور متعصب قوموں سے برداشت نہ ہوئی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر وہ مظالم ڈھائے کہ جن کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ان مظالم پر انگریز ان کے پشت پناہ تھے۔

اس وقت ایک طوفان مچ گیا اور ہر طرف آگ وخون کا کھیل کھیلا جانے لگا شہر شہر وادی وادی، فسادات پھوٹ پڑے۔ ہر جگہ جب مسلمان آزادی کا نعرہ بلند کرتے تو ہندو اپنے نعرے لگاتے مسلمانوں کے مقابل آجاتے اور جنگ چھڑ جاتی یوں کرتے کرتے شام ہوگئی۔

ایم اسلم نے نہایت خوبصورتی سے حالات وواقعات کا تسلسل برقرار رکھا ہے اسی دن شام کے وقت کا احاطہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''مشرقی چاند کی ہلکی ہلکی سی چاندی کائنات پر پھیل رہی تھی۔کچھ سردی بھی چمک اٹھی تھی

اور شاید خلق خدا طوفان گزر جانے کے بعد آرام کا فکر کر رہی تھی کہ اچانک ایک طرف سے پھر ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ بلند ہوا اور اس کے عقب میں پھر وہی ''ست سری اکال'' اور ''جے ہند'' کا نعرہ فضا میں گونجا۔ لیکن اس آواز میں کچھ دہشت تھی کچھ خوف سا تھا۔ ابھی یہ آواز فضا میں گونج ہی رہی تھی کہ پھر ایک بار بادل خوفناک گرج اور بجلی کی ہیبت ناک کڑک کی طرح ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ فضا میں ارتعاش سا پیدا کرنے لگا۔

شام کے وقت جب حالات سنبھلنے لگے اور لوگ گھروں میں آرام کی غرض سے لیٹنے لگے، چاندنی راتوں کا چاند اپنی روشنی سے جگمگاہٹ برقرار رکھنے کی کوشش میں تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ تھی کہ یکا یک نعرہ پاکستان بلند ہوا اور پھر جواب میں نعرہ ہند۔ ہندوستان کا نعرہ لگانے والوں کی آواز میں گھبراہٹ اور خوف تھا اس کے فوراً بعد ایک گرج دار آواز میں ''پاکستان زندہ باد'' کا ایسا نعرہ لگا کہ فضا گونج اٹھی۔ آزادی کے اعلان کے بعد یہ روزانہ کا معمول تھا۔ لوگ پاکستان زمدہ باد کہتے باہر نکلتے تو ہندو بھی باہر آجاتے مگر مسلمانوں کا جوش اور ولولہ اتنا زبردست ہوتا کہ ہندوؤں کے بڑے بڑے مجمعے بھی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے۔'' (۲۵)

مسلمانوں کے مصائب پاکستان آنے کے بعد بھی ختم نہ ہوئے۔ پاکستان کے ساتھ ہر طرح سے زیادتی کی گئی حکومت کے پاکستان انتظامی امور سرانجام دینے کے لیے انتہائی ناکافی وسائل تھے۔ بے یارو مددگار مسلمان جب پاکستان آئے تو سب سے بڑا مسئلہ کھانے پینے اور ٹھہرنے کا تھا۔ غرض مسائل کا ایک انبار تھا جو نئی وجود میں آنے والی مملکت اور لوگوں کو درپیش تھے۔ لوگوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی ہر ایک چہرہ ایک داستان الم پیش کر رہا تھا۔ ان حالات کا مختصر احوال ایم اسلم نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''جہاں کبھی شہر کی فصیل کا ایک دروازہ تھا ایک عمارت کے دروازے پر ''مہاجر ہوٹل'' کا تختہ لٹک رہا تھا وہ بازار جہاں یہ ہوٹل تھا بھلے وقتوں میں کوئی بارونق جگہ نہیں تھی۔ اس ہوٹل کے مشرق میں شہر تھا اور مغرب کی جانب ایک کھلا میدان۔ فسادات سے پہلے اس میدان

میں شہر والوں کی گائے بھینسیں بیٹھا کرتی تھیں لیکن آج یہاں بھی چپہ بھر زمین کہیں خالی نظر نہ آتی۔تمام میدان مہاجرین سے بھرا پڑا تھا۔پاکستان کی سرزمین میں ان لوگوں کی بے چارگی اور بے کسی دیکھ دیکھ کر تعجب بھی ہوتا اور افسوس بھی۔ان میں سے بہت سے لوگ ایسے تھے جن کے پاس بدن ڈھانکنے کو کوئی بھی کپڑا نہ تھا۔یہ لوگ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک وہیں بیٹھے رہتے کھانے کا برا بھلا انتظام حکومت کے ذمے تھا۔'' (۲۶)

کوئی جگہ غیر آباد نہ بچی، ہر طرف، ہر جگہ لٹے پٹے مہاجرین کے قافلے تھے۔شہر کی جس عمارت پر ہوٹل کا تختہ لگا تھا وہ علاقہ غیر آباد تھا۔آزادی سے قبل یہاں شہر کے باسیوں کے مال مویشی بندھے ہوتے تھے اور آج اس میدان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔مہاجرین بے بسی و بے کسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔یہ لوگ چاروں پہر وہیں بیٹھے رہتے ان میں سے بیشتر ایسے تھے کہ جن کا لباس بدن بھی محفوظ نہ تھا۔

انتظامی امور کی کمی ناکافی وسائل اور دیگر بے شمار مسائل کے باوجود جو لوگ پاکستان پہنچ چکے تھے ان کے دل مطمئن تھے۔ایک امان کا احساس ان کے سینوں میں تھا ایک بے خوفی اور خوشی تھی روشن مستقبل کی امید تھی، سحر نو کا احساس اور انتظار تھا جس کا ذکر ایم اسلم یوں کرتے ہیں:

''یہ تو ٹھیک ہے محبوب الہیٰ نے جواب دیا ''لیکن پاکستان تو مسلمانوں کے لیے امن کی جگہ ہے یہاں ہمیں کس چیز کا خوف ہوسکتا ہے میں تو کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے میں پھر اپنے کنبے میں آ گیا ہوں۔آپ یقین مانیں کہ میں نے جس وقت پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو گزشتہ مصائب ایک خواب سے معلوم ہونے لگے۔طبیعت ایک سکون اور اعتماد سا محسوس کرنے لگی۔اس سرزمین کی ہوا میں مجھے ایک نئی زندگی کا پیغام ملتا معلوم ہو رہا تھا غیریت اور اجنبیت کا خوف بالکل معدوم تھا۔میں جدھر نگاہ اٹھاتا، مجھے کچھ ایسا یقین سا ہونے لگتا گویا ہر چیز مجھے تسلیاں دے رہی ہے۔اور میرا دل بھی مجھے یہ اطمینان دلا رہا ہے کہ اس سرزمین میں جسے ہم پاکستان کہتے ہیں، مسلمانوں کے لیے امن ہی امن ہے۔''(۲۷)

محبوب الٰہی کسی سے تذکرہ کرتے ہوئے ہیں کہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے یہاں مسلمان محفوظ ہیں یہاں آنا تو ایسا ہے کہ جیسے کوئی بچھڑا اپنے گھر لوٹ آیا۔جس وقت میں نے اس زمین پر قدم رکھے ہیں تمام مشکلات اور مصائب جو ہم نے جھیلے ہیں، ایک فسانہ لگتے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ یہاں پہنچنے کے بعد سے مجھے ایک دلی سکون و اطمینان ہے۔اس زمین اور اس فضا میں عجیب کشش اور اپنائیت ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کے در و دیوار مجھ تسلیاں دے رہے ہیں اور ڈھارس بندھاتے ہیں۔ پرامید رہنے کے لیے کہتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ زمین اور آسمان مجھے کہتے ہیں یہی تو وہ پاک سرزمین ہے جہاں تمہارے لیے امان ہے جہاں سب مسلمان محفوظ ہیں۔

قیام پاکستان کے اعلان کے بعد وقتاً فوقتاً مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری رہا مشرقی پنجاب ان علاقوں میں سے ایک تھا۔ جہاں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں بے پناہ مظالم ڈھائے۔مہاجرین کے قافلے وقفے وقفے سے اپنی بدحالی اور بے بسی کے ساتھ پاکستان پہنچتے ہیں۔ان کے احوال ایم اسلم یوں بیان کرتے ہیں:

> ''آج مشرقی پنجاب سے پناہ گزینوں کا ایک بڑا قافلہ سنٹرل کیمپ میں پہنچا تھا شہر والوں نے بڑی ہمدردی اور فراخ دلی سے اپنے دلی سے اپنے مظلوم بھائیوں کے کھانے پینے کا سامان فراہم کیا۔تقریباً ہر شخص نے بقدر ہمت اس کار خیر میں حصہ لیا۔ کھانا ٹرک اور لاریوں میں بھر کر آیا تھا اور رضا کار جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں مہاجرین کی خدمت کے لیے موجود تھے۔ پناہ گزینوں نے راستے میں جو مصائب برداشت کیے تھے جو جو ظلم ان بیکسوں پر توڑے گئے سن کر کلیجہ منہ کو آتا۔ یہ لوگ گھروں سے تو پورے سامان سے لدلدا کر نکلے تھے لیکن جب پاکستان میں پہنچے تو ان میں سے بیشتر ایسے بھی تھے جن کے پاس بدن کے تین کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا اس قافلے میں جوان عورتیں خال خال نظر آتی تھیں مجروح اور بیمار کثرت سے تھے لیکن اس مصیبت، پریشانی اور بے چارگی کے باوجود پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی برابر لگ رہے تھے کہیں کہیں ایسے لوگ بھی نظر آجاتے جو ہاتھ اٹھا اٹھا کر پاکستان پہنچ جانے پر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔'' (۲۸)

یہ لوگوں کی حب الوطنی ہی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنے وطن پاکستان میں آئے ہیں ان سطور میں ایم

اسلم لکھتے ہیں کہ مشرقی پنجاب سے مہاجرین کے قافلے آ رہے ہیں اور آج ایک بہت بڑا قافلہ پناگزین وسطی کیمپ پہنچا ہے شہر کے باسیوں نے انتہائی بھائی چارے اور انسانی ہمدردی کے تحت ان لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ کھانے پینے کی اشیاء فراہم کیں۔ تمام مرد و خواتین رضا کارانہ جذبے کے تحت اپنے آنے والے بہن بھائیوں کی خدمت کے لیے حاضر تھے۔ ہر شخص کے پاس اپنے اوپر بیتے ظلم و ستم کی الگ اور دل دہلا دینے والی داستان تھی۔ یہ لوگ اپنا سب کچھ لٹا کر اس پاک سرزمین پر پہنچے تھے کچھ لوگ خدا کا شکر بجالا رہے ہیں تو کچھ لوگ نعرہ آزادی لگا رہے ہیں۔ مجروح، بیمار، زخمی، بوڑھے، معذور لوگ قافلے کے شریک ہیں جو مصائب کے دریا پار کر کے آئے ہیں۔ یہ سب درحقیقت جذبہ حب الوطنی کی بدولت تھا۔

ناول میں ایک طویل بیان مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم پر ہے۔ مشرقی پنجاب میں مسلم علاقوں کو مسلمانوں سے یوں خالی کیا گیا ہے تھا کہ کوئی ذی روح زندہ نہ بچا۔ خواتین کی عصمت دری کی گئی، گھروں کو مکینوں سمیت جلا دیا گیا۔ ماں کے سامنے بیٹے کو ذبح کیا گیا تو بیٹے کے سامنے باپ کو۔ خواتین اور جانوروں کو فروخت کر دیا گیا۔ اس وقت کوئی بھی ذی ہوش یہ مناظر دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ قاتلوں کے ہتھیار رکتے کہ رکنے کا نام نہیں لیتے تھے مگر قافلوں کے حوصلے تھے کہ ٹوٹ نہیں پا رہے تھے۔ سب پر بس پاکستان پہنچنے کی دھن اور لگن سوار تھی۔ پٹیالہ میں ڈھائے گئے مظالم کی داستان ایم اسلم کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''سکھ ریاستوں نے بھی عام سکھوں کو بہت مدد دی تھی۔ محبوب الہیٰ نے کہا کہ ''بے شک! ریاستوں کے سپاہی مشرقی پنجاب میں ہر جگہ سکھوں اور ہندوؤں کی مدد کرتے رہے اور پٹیالہ تو ان سب میں پیش پیش رہا۔ جتنا ظلم پٹیالہ میں مسلمانوں پر ہوا اس کی نظیر تو شاید اور کہیں نہ ملے''۔ دوست محمد خاں نے جواب دیا'' غالباً آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ ہمارے قبائلی بھائی تو جب پاکستان میں آتے ہیں تو سب سے پہلے پٹیالہ کا راستہ پوچھتے ہیں۔''(۲۹)

محبوب الٰہی دوست محمد خاں سے مکالمے کرتے ہوئے کہتے ہیں ہندوستان کی سکھ ریاستوں کے سپائیوں نے عام سکھ شہریوں کی خوب مدد کی جس کی بدولت مشرقی پنجاب اور خصوصاً پٹیالہ میں مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے گئے ہیں

ان کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر بے تحاشہ مصائب ڈھائے مگر وہ سب ملکر بھی ان کے جوش ولگن میں ذراسی بھی لغزش نہ لا پائے۔

پٹیالہ مشرقی پنجاب کے مسلم اکثریت والا مشہور شہر تھا کہ جہاں پر قبائلی علاقے کے لوگ بھی جاتے رہتے تھے۔جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ پاکستان پہنچنے والا ہر شخص ایک داستان رکھتا ہے ایک داستان وہ جو ہندوستان میں تھی، آزادی سے قبل اور ایک داستان داستان الم، راہ کی مشکلات، مصائب اور مظالم۔

قیام پاکستان کے بعد جو لوگ بھی پاک سرزمین پہنچے تقریباً سبھی اپنی اراضی جائیداد مال مویشی گھر بار غرض سب کچھ چھوڑ کر آئے تھے اس کے باوجود لاکھوں گھروں سے نکلے ہیں تو صرف سینکڑوں پہنچے ہیں، نہتے مسلمانوں پر ہندوؤں اور سکھوں نے جو مظالم چاہے وہ کیے۔درج ذیل ایک صاحب کے احوال کا ذکر ہے جسے ایم اسلم کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''لیکن آپ سننا چاہتے ہیں تو میں عرض کیے دیتا ہوں۔ میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا ہوں، کوئی تین پونے تین سو نفوس کی آبادی تھی، سب مسلمان ہی تھے اور گاؤں کی نصف سے زیادہ اراضی ہماری تھی۔ میرے والد مرحوم نے کاروبار کے سلسلے میں گاؤں چھوڑ کر شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی تاہم سال میں دو تین بار ہم گاؤں بھی چلے جاتے۔گاؤں میں ابا جان مرحوم نے ایک بنگلہ نما مکان بھی بنوا رکھا تھا۔ میں نے ایف۔اے تک تعلیم پائی تھی جو ابا جان مرحوم نے مجھے کاروبار میں لگا دیا۔اللہ کے فضل سے کاروبار بہت اچھا تھا۔سال ایک ہوا دل کی حرکت بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔'' (۳۰)

مہاجرین میں سے ایک صاحب استفسار کرنے پر بتاتے ہیں کہ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے باسی تھے۔بہت زمین اور جائیداد تھی۔گھر گاؤں میں تھا اور شہر میں بھی، اپنا کاروبار تھا اچھی تعلیم تھی۔مختصراً تمام نعمتیں عطا کردہ تھیں مگر جب آزادی کا نقارہ بجا تو وطن عزیز پاکستان کے لیے سب کچھ چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔

خدا کی بستی (۱۹۵۷ء)

شوکت صدیقی کا شمار ان نامور ناول نگاروں میں ہوتا ہے جن کے ناول قیام پاکستان کے بعد منظر عام پر آئے۔شوکت صدیقی کا ناول ''خدا کی بستی'' جو ۴۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، اکتوبر ۱۹۵۷ء میں لکھا گیا اس ناول میں قیام پاکستان کے حالات و واقعات، مہاجرین کی کسمپرسی اور برصغیر کے سیاسی و معاشرتی صورت حال پر نظر ڈالی گئی ہے۔خدا کی بستی میں موجود حب الوطنی کے عناصر کا تجزیہ درج ذیل ہے۔

قیام پاکستان کے بعد شائع ہونے والے اردو ناولوں میں حب الوطنی کا اظہار اس انداز سے ہوتا ہے کہ اپنے اپنے علاقوں سے ہجرت کرنے والے لوگ کھوئے ہوئے دیاروں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں وہ اپنے وطن اور اس کے مکینوں کو یاد کر کے روتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں۔اس ہجرت کا محرک نئے ملک کی تشکیل بھی ہو سکتی ہے اور حصول روزگار کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر بھی ہو سکتا ہے۔وطن سے دوری کا احساس خواہ کسی بھی وجہ سے ہوا ہو اپنے اندر ایک خاص قسم کی کسک اور بے تابی رکھتا ہے خدا کی بستی کا کردار نوشہ بھی اس قسم کی دردانگیز کیفیت سے دوچار نظر آتا ہے۔حب الوطنی کا تعلق ملک یا سرحدوں سے بھی بالاتر ہوتا ہے ضروری نہیں کہ کوئی شخص ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف ہجرت کرے تو اسے دکھ محسوس ہو بل کہ ایک گھر سے دوسرا گھر بدلنے میں بھی اسے اپنا پہلا گھر ہمیشہ یاد رہتا ہے۔شوکت علی صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''اس رات نوشا کو دیر تک نیند نہیں آئی اکیلے کمرے میں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔پہلے وہ راجہ کو یاد کرتا رہا۔پھر راجہ اس کی یاد کے سہارے وہ بہت دور چلا گیا جہاں اس کا اپنا گھر تھا، ماں تھی، بہن تھی، چھوٹا بھائی تھا۔اسے گھر کی ایک ایک بات یاد آنے لگی اور انہیں یاد کرتے کرتے وہ رو پڑا۔دیر تک خالی کمرے میں اس کی سسکیاں آہستہ آہستہ ابھرتی رہیں۔وہ اسی طرح روتے روتے سو گیا۔'' (۳۱)

درج بالا پیرا گراف میں حب الوطنی کو ایک الگ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔جس سے حب الوطنی کے معنی اور مطالب میں اضافہ ہوتا ہے۔حب الوطنی سے مراد یہ بھی ہے کہ کسی فرد کا اپنے وطن سے دور رہ کر بھی اپنے ملک کی

سرزمین، ملک کے باسیوں اور ان افراد سے محبت کا اظہار کرنا ہے جن کے ساتھ اس نے اپنا بچپن گزارا ہو۔ حب الوطنی کی بہترین مثال ہے۔ درج بالا اقتباس میں نوشا گھر سے دور رہ کر بھی اپنے وطن اور خاندان کی محبت کو نہیں بھلا سکتا۔ یہ حالت صرف نوشا کی نہیں بل کہ ہر اس فرد کی ہے جو کسی بھی غرض سے اپنے وطن سے دور ہوتا ہے۔

وطن سے محبت کا اظہار صرف جان اور مال کی قربانی سے ہی نہیں بل کہ معاشرے کے عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر کے بھی کیا جاتا ہے۔ مختلف فلاحی تنظیمیں اپنے منصوبے بنا کر لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرتی ہیں تا کہ لوگ پڑھ لکھ جائیں اور معاشرے کے مفید رکن بن سکیں۔ ناول نگار شوکت صدیقی نے یہاں پر ایک فلاحی تنظیم فلک پیما کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ تنظیم عام لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کوشاں ہے اور اپنے اجلاسوں میں عوامی فلاح کے فیصلے کرتی ہے۔ شوکت صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''فلک پیما کا ہفت روزہ اجلاس حسب معمول رات کے وقت رکھا گیا۔ اس روز ہر اسکائی لارک نے اپنی اپنی رپورٹ پیش کی۔ ان رپورٹوں پر رات گئے تک بحث ہوتی رہی۔ ان کا باقاعدہ تجزیہ کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ عوام کو سب سے پہلے ان کے شہری اور بنیادی حقوق سے آگاہ کیا جائے، باشعور بنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے تین اہم فیصلے کئے گئے۔ تعلیم بالغاں کا آغاز کیا جائے۔ دارالمطالعے قائم کئے جائیں۔''(۳۲)

فلاحی تنظیم فلک پیما کا اجلاس حسب معمول رات کو ہوتا ہے اور اس اجلاس میں تنظیم کے تمام اراکین نے اپنے اپنے شعبہ جات کے بارے میں تفصیلاً رپورٹ پیش کی اور ان رپورٹس پر بحث ہوتی ہے اور ان رپورٹس کا مکمل تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان منصوبہ جات کے بارے میں خوبیوں اور خامیوں کا مکمل پوسٹ مارٹم کیا ہے اس تمام بحث مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ عوام کو سب سے پہلے ان کے شہری اور بنیادی حقوق سے آگاہ کیا جائے۔ کیوں کہ عوام کو اپنے حقوق سے واقفیت ہی نہیں ہے عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے آگاہ کرنا حب الوطنی کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔ اس سے عام لوگ پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جائیں ان میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا ہو جائے گا اور کتب خانے قائم کیے جائیں جس سے لوگوں میں مطالعے کی عادت پیدا ہو جائے گی اور مطالعے سے انسانی شعور اور سوچ میں پختگی سے انسانی شعور اور سوچ میں پختگی پیدا ہوگی لہذا عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے متعارف کروانا تعلیم بالغاں کے مراکز کھولنا اور

کتب خانے قائم کرنا وطن سے محبت اور دوستی کا اظہار ہے۔ پاکستان کے پسماندہ علاقوں میں تعلیمی ترقی فلک پیما کا منشور تھا۔ یہ فلک پیما کے کارکنان کا یہ جذبہ اپنے اندر حب الوطنی کا ایک خاص عنصر رکھتا ہے۔

فلک پیما کے اراکین دور دراز کے علاقوں میں کام کرتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کو تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہیں۔ ''خدا کی بستی'' میں اس طرح کے ایک اجلاس کا منظر یوں بیان کیا گیا ہے۔

> ''یہ سنیچر کی شام تھی، علی احمد بڑا سا تختہ اور پیٹرومیکس لیے، سلمان اور اپنے دوسرے ساتھی اسکائی لارک کے ہمراہ ایک پس ماندہ بستی میں پہنچا۔ لوگوں نے انہیں حیرت اور استعجاب سے دیکھا انہوں نے خاموشی سے ایک نیم پختہ دیوار کے ساتھ تختہ سیاہ لٹکایا۔ پیٹرومیکس روشن کیا اور لوگوں کے اکٹھا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ان کے گرد خاصا ہجوم ہو گیا علی احمد نے تعلیم کی اہمیت پر مختصر تقریر کی۔ کتنے ہی لوگ اسی وقت تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔'' (۳۳)

اس مختصر سے تعلیمی اجلاس میں علی احمد کا لوگوں کو تعلیم کے بارے میں بتانا دراصل اپنے اندر جو جذبہ لیے ہوئے ہے وہ تعمیر و ترقی، فلاح و بہبود کے جذبات سے مزین ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے پس پردہ حب الوطنی ہی کارفرما ہے۔ علی احمد کا لوگوں سے حسن سلوک اور انہیں تعلیم کی افادیت سے آگاہ کرنا اس امر کا مظہر ہے کہ احمد علی اور ان کی تنظیم فلک پیما وطن میں تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ اسی پیراگراف میں احمد علی کی کاوش کے نتائج بھی سامنے آتے ہیں اور پتا چلتا ہے کہ لوگ تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

فلک پیما ایک فلاحی تنظیم تھی جو اپنے وطن سے محبت کرتی تھی۔ تنظیم کے کارکنان چاہتے تھے کہ ان کے وطن کے لوگ تعلیم حاصل کریں تاکہ وہ خوشحال اور صاف ستھری زندگی گزاریں اور معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کریں۔ اسکائی لارک اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے دن رات کوششوں میں مصروف رہتے۔ دور دراز کے علاقوں میں سفر کر کے عوام کو تعلیم کی اہمیت کے بارے میں آگاہی دیتے۔ اس حوالے سے شوکت صدیقی ناول ''خدا کی بستی''، میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''تعلیم بالغاں کے ساتھ ساتھ تقریروں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ صفدر بشیر اپنے گروپ کے دو

اسکائی لارکوں کے ہمراہ روزانہ کسی پس ماندہ بستی میں جاتا اور اچھا شہری بننے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے اور تعلیم کی اہمیت پر زور دیتا۔ توہم پرستی اور فرسودہ رسم ورواج سے پیدا ہونے والی سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتا۔ انہیں ترک کرنے اور ان کے خلاف موثر طور پر جدوجہد کرنے کی تلقین کرتا وہ عام فہم میں ان کی ذہنی تربیت کرتا۔ ان کا سیاسی اور سماجی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتا۔'' (۳۴)

سکائی لارکوں نے تعلیم بالغاں کے ساتھ ساتھ تقریروں کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور وہ اپنی تقاریر کے ذریعے لوگوں کو تعلیم کی اہمیت کے بارے میں آگاہ کرتے۔ صفدر بشیر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہر روز پسماندہ علاقوں میں جاتا اور لوگوں کو اچھا شہری بننے اور صاف ستھری زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا توہم پرستی اور فرسودہ رسم و رواج سے پیدا ہونے والی معاشرتی برائیوں کی نشان دہی کرتا۔ ان معاشرتی برائیوں کر ترک کرنے کی تلقین کرتا اور ان کے خلاف منظّم کوشش کرنے کی تلقین کرتا۔ صفدر بشیر ان لوگوں کو بہت عام فہم زبان میں سمجھاتا اور ان میں سیاسی وسماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ صفدر بشیر کا لوگوں کو تعلیم کی اہمیت کے بارے میں آگاہ کرنا اور فرسودہ سماجی روایات کے نقصانات سے آگاہ کرنا حب الوطنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ پاکستانی عوام کی فلاو بہبود کا کام ہے۔ عوام کی فلاح اصل میں پاکستان کی فلاح ہے عوام سے محبت پاکستان سے محبت ہے لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلک پیما پاکستانی حب الوطنی سے سرشار نظر آتی ہے۔

خان بہادر جیسے چالاک اور مکار لوگ ایسی تنظیموں کو خریدنے کی کوشش کرتے ہیں جو عوامی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہی ہوتی ہیں۔ خان بہادر نے ''فلک پیما'' تنظیم کو اپنے مفادات کی خاطر بیس ہزار روپے کا چیک دیا تھا اور اب وہ اپنے مفادات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایسی صورتحال میں سکائی لارکوں نے اپنے اجلاس میں فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ خان بہادر کی امداد کا چیک قبول نہیں کریں گے۔ شوکت صدیقی لکھتے ہیں:

''رات کے نو بجے تھے۔ خان بہادر کی کار ''فلک پیما'' کے ہیڈ کوارٹر کے سامنے ایک بار پھر نمودار ہوئی وہ مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ صفدر بشیر، علی احمد اور فہیم اللہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ خان بہادر نے کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو کی پھر حرف مطلب پر

آ گیا۔

کہئے کیا فیصلہ ہوا آپ کے اجلاس میں؟

صفدر بشیر نے جواب دیا! خان بہادر صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی تجویز پر عمل نہیں کر سکیں گے البتہ آپ ہسپتال کی تعمیر کے لیے ہماری مالی امداد کرنا چاہیں تو ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے۔'' (۳۵)

خان بہادر رات کے نو بجے فلک پیما کے دفتر میں آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اجلاس میں کیا فیصلہ ہوا ہے سکائی لارک خان بہادر کو بتاتے ہیں کہ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے لیے ایسا کرنا ناممکن ہے۔علی احمد نے بیس ہزار کا چیک خان بہادر کو واپس کر دیا یہاں پر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ خان بہادر بیس ہزار روپے لے کر عوامی فلاحی ہسپتال بنوا کر جعلی دوائیوں کا کاروبار کر کے زیادہ کمائی کرنا چاہتا تھا اس بات سے سکائی لارک آگاہ ہو چکے تھے چنانچہ سکائی لارکوں کا خان بہادر کے پاکستانی عوام کے خلاف غلط اقدام کی حوصلہ شکنی کرنا وطن سے محبت کی بہت بڑی مثال ہے۔ فلک پیما تنظیم کے اراکین میں جذبہ حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس لیے یہ لوگ کسی ایسے شخص یا ادارے سے امداد نہیں لیتے تھے جو اپنے ذاتی مفادات کے لیے تنظیم کا استعمال کرے۔شوکت صدیقی نے یہاں پر وطن سے محبت کی بہت اعلیٰ وارفع مثال پیش کی ہے۔

سلیمان فلک پیما تنظیم کا بہت متحرک کارکن تھا وہ تنظیم کی بہتری کے لیے دن رات کام کر رہا تھا۔خان بہادر کے غنڈوں نے جب فلک پیما کے قائم کردہ ہسپتال پر حملہ کیا تو دوسرے سکائی لارکوں کے ساتھ سلیمان بھی بہت شدید زخمی ہو گیا تھا اور وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ تک ہسپتال میں رہا جب اس کی صحت ذرا ٹھیک ہوئی تو اس نے گھر کا رخ کیا۔انسان جہاں پیدا ہوتا ہے پلتا بڑھتا ہے۔اس علاقے سے اسے کو زیادہ محبت ہوتی ہے۔شوکت صدیقی لکھتے ہیں:

''ستمبر کی ایک دھندلی صبح کو سلمان چپ چاپ اپنے گھر پہنچ گیا اس کے ہاتھ میں بوسیدہ اٹیچی کیس تھا لباس ملگجا تھا اور سر کے خشک بال بکھرے ہوئے تھے وہ اپنی وضع قطع سے دیسی دوا خانے کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا اس کی آمد پر نہ کوئی ہلچل پیدا ہوئی اور نہ ہی کسی نے توجہ دی۔گھر کا ہر فرد سرد مہری سے پیش آیا۔باپ نے تو بات تک کرنا گوارا نہ کی۔البتہ ماں کی

مامتا بلک اٹھی۔''(۳۶)

سلمان کے والد نے اعلیٰ سرکاری آفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دی تھیں۔اس کے سب بچے پڑھ لکھ کر برسرروزگار ہو چکے تھے صرف سلیمان ہی کم پڑھا لکھا تھا اور وہ گھر سے بھاگ کر''فلک پیما''تنظیم میں شامل ہو چکا تھا آخر کار اسے اپنے وطن،اپنے گھر کی یاد ستاتی ہے تو وہ گھر آجاتا ہے لیکن اس کے آنے پر کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا جاتا البتہ اس کی ماں اسے گلے لگا کر بہت دیر تک روتی رہی گھر کے کسی بھی فرد نے اس سے زیادہ بات چیت یا سوالات نہیں کیے تاہم سلیمان کا خان بہادر کی پاکستان مخالف خواہشات کی تکمیل سے انکار کے بدلے میں گنڈوں کی بھینٹ چڑھنا اور زخمی ہونا دوسرے لفظوں میں پاکستانی عوام ملک کی خاطر اپنی جان کا نظرانہ پیش کرنے کے مترادف ہے۔اور پھر ٹھیک ہو جانے کے بعد بدلہ لینے کے بجائے اپنے گھر واپس آنا انتشار اور بربریت سے کنارہ کشی اختیار کرنا یہ سب پاکستان سے محبت کی مثالیں ہیں۔

شوکت صدیقی کے ناول میں وطن سے محبت کے جذبات مختلف رنگوں میں نظر آتے ہیں یہاں چند نقادوں کی آرا کا ذکر کیا جاتا ہے ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب اُردو ادب کی مختصر تاریخ میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''شوکت صدیقی نے خدا کی بستی میں غربت اور ہوس زر کی آویزش کو سماجی جرائم اور اخلاق باختہ کرداروں سے نمایاں کیا ہے۔اس ناول کے نظریاتی مقاصد بے رحم حقیقت نگاری میں چھپ جاتے ہیں۔شوکت صدیقی نے معاشرتی المیے کو پوری شدت سے ابھارا لیکن مقصد کو عریاں نہیں ہونے دیا۔''(۳۷)

شوکت صدیقی نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے معاشرے کے حالات دیکھتے انہیں ناول کے رنگ میں پیش کر دیا اور یہ ناول لکھنے کا بڑا مقصد وطن عزیز سے محبت کا اظہار ہے کیونکہ جو انسان اپنے وطن سے دلی محبت کرتا ہے وہی معاشرتی برائیوں اور قباحتوں پر کڑھتا ہے ڈاکٹر انور سدید کے نزدیک غربت اور ہوس زر معاشرے کو تباہ کر دیتے ہیں اور معاشرہ تنزلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ناول خدا کی بستی کے بارے میں کتاب مترجم ڈاکٹر اسلم آزاد اور ڈاکٹر فقیر حسین لکھتے ہیں ملاحظہ ہو:

> ''اردو ناولوں میں شوکت صدیقی کے ناول''خدا کی بستی''کو بے حد شہرت اور مقبولیت

حاصل ہوئی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ دور کے ناولوں میں اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ پریم چند ہی کی طرح شوکت صدیقی نے زندگی اور اس کی تمام تلخیوں کو وسیع تجربات و مشاہدات کے آئینے میں دیکھا اور اپنے دور کی سماجی کشمکشوں، معاشی الجھنوں، اخلاقی گہرائیوں اور پیچیدہ معاشرتی حقیقتوں کو تفصیل کے ساتھ ناول کے پلاٹ میں سمونے کی کوشش کی ہے۔''(۳۸)

شوکت صدیقی چوں کہ خود بھارت سے پاکستان ہجرت کر کے آئے تھے اور وہ اپنے خوابوں اور سپنوں میں فلاحی مملکت دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس کے برعکس حالات پیدا ہو گئے تھے بے راہ روی عام تھی ہر شخص زیادہ سے زیادہ مال و اسباب اکٹھا کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ حرام و حلال کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ شوکت صدیقی کا اپنے ناول خدا کی بستی میں معاشرتی حالات و واقعات کو بے باک انداز میں پیش کرنا بھی وطن سے محبت کا اظہار ہے کیوں کہ صرف وطن کی محبت ہی انسان کو حقیقی واقعات پیش کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔

ناول خدا کی بستی کے بارے میں ڈاکٹر افضال بٹ اپنی کتاب اردو ناول میں سماجی شعور میں یوں رقم طراز ہیں۔

''یہ پہلا ناول ہے جس میں تقسیم کے بعد کے پاکستانی شہری معاشرے کے مسائل کو بڑی جرأت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے پاکستان بننے کے بعد نیم سرمایہ دار اور نیم جاگیر دار طبقے نے معاشرے کا بری طرح استحصال کیا ان طبقوں نے جمہوریت اور مذہب کی آڑ میں ہوس پرستی اور فریب کاری کی انتہا کر دی۔ شوکت صدیقی کراچی میں بطور مہاجر آباد ہوئے تھے۔''(۳۹)

ڈاکٹر محمد افضال نے یہاں پر بڑے واشگاف الفاظ میں ناول ''خدا کی بستی'' کے بارے میں اپنی رائے دی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستانی معاشرے میں بہت زیادہ برائیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ جرائم پیشہ لوگ اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور وہ اپنے مذموم مقاصد کے لیے بچوں کو بھی استعمال کر رہے تھے۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کو صرف اور صرف پیسہ چاہیے تھا وہ پیسے کی خاطر ہر وہ کام کر رہے تھے جو پاکستانیت کے خلاف تھا۔ پاکستان کی سالمیت کو نیم

سرمایہ دار اور نیم جاگیر دار طبقے نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ان لوگوں نے مذہب اور جمہوریت کی آڑ میں وطن عزیز کے وسائل کو بہت بے دردی سے لوٹا۔شوکت صدیقی نے ملکی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے ''خدا کی بستی'' میں ان تمام سماجی اور معاشرتی برائیوں سے پردہ اٹھایا ہے اور ایسی سماجی اور معاشرتی برائیوں سے پردہ اٹھانے والا بہت بڑا محبّ وطن ہوتا ہے اگر ناول ''خدا کی بستی'' کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول میں ہر جگہ کسی نہ کسی رنگ میں پاکستان اور پاکستان کے لوگوں سے سے محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد عارف اپنی کتاب اُردو ناول اور آزادی کے تصورات میں شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''خدا کی بستی قیام پاکستان کے دس برس بعد ۱۹۵۷ء کی تصنیف ہے۔اس عہد میں سیاستدان حکمران تھے۔سیاست شطرنج کے کھیل کی طرح کھیلی جا رہی تھی۔اصل حکمران برطانوی سامراج کی تربیت یافتہ بیوروکریسی اور خان بہادر جیسے جاگیردار تھے۔عوام نے پاکستان کی صورت میں آزادی وخوش حالی کے جو خواب دیکھے تھے چکنا چور ہو چکے تھے۔ ہر طرف جبر تھا،تشدد تھا غربت تھی، بے روزگاری تھی۔یاس کی تاریکیوں کا راج تھا اور امید کی کرن کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔''(۴۰)

شوکت صدیقی اس وقت کے تمام سیاسی و معاشرتی حالات کی نشان دہی کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔عوام نے قیام پاکستان کے بعد آزادی وخوشحالی کے جو سپنے دیکھے تھے چکنا چور ہو چکے تھے۔قتل وغارت عام تھی لوگوں کی جائیدادوں پر زبردستی قبضہ کیا جا رہا تھا۔رشوت اور سفارش کا بول بالا تھا۔غربت اور بیروزگاری اپنی حدیں پھلانگ چکی تھیں بیماریاں عام تھیں اور علاج کی کوئی سہولت موجود نہ تھی۔

شوکت صدیقی ایک اچھے معالج کی طرح پاکستانی معاشرے کے معاشی ، معاشرتی اور سماجی حالات کا بغور جائزہ لیتے ہیں۔اور بحیثیت ادیب اپنے فرائض منصبی اس طرح ادا کرتے ہیں کہ ان کی پاکستان اور پاکستان کے لوگوں کے لیے محبت کھل کر سامنے آتی ہے۔اور وہ معاشرے میں پائی جانے والی تمام معاشرتی اور سماجی برائیوں سے پردہ اٹھا کر ایک اچھے اور فرض شناس ادیب کی ذمہداریوں کو پورا کرتے ہیں ۔

آنگن (۱۹۶۲ء)

خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کا موضوع آزادی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں برصغیر کی تہذیب وتمدن اور آزادی سے قبل پُر آشوب دور کی کہانی ہے۔ جس میں تحریکِ آزادی کے پس منظر میں پیدا ہونے والے معاشی اور جذباتی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ یوپی کے ایک گھرانے کے ذریعے ناول میں سیاست کی کارفرمائی کو دکھایا گیا ہے۔ اس گھرانے کے افراد مختلف سیاسی نظریات سے وابستہ ہیں۔ کوئی کانگریس کا حمایتی ہے تو کوئی مسلم لیگ کا سرگرم رکن۔ کوئی انگریزوں کی حمایت کرتا ہے تو کسی کو برطانوی حکومت سے شدید نفرت ہے۔ مصنفہ نے سیاسی رجحانات کو کرداروں کی مدد سے بڑے خوب صورت انداز سے پیش کیا ہے۔

ناول کی ہیروئن عالیہ ہے جس کے گھر کا ماحول عجیب کش مکش کا شکار ہے۔ ماحول کی کشیدگی کا باعث اس کا پھوپھی زاد صفدر علی ہے۔ صفدر علی کی ماں سلمٰی نے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی جس کا خاندان کو بڑا دُکھ ہوا۔ ان دنوں پورے ملک میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی مٹی سے محبت کا دم بھرتا ہے۔ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ وہ ہجرت کر کے نئی جگہ اپنے مسکن بنائے لیکن انھی دنوں ایک خاندان ہی نہیں بل کہ تمام لوگ پریشان اور فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد جب پاکستان بن جاتا ہے تو عالیہ کا ماموں اُسے اور اس کی ماں کو اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ چھمی کا شوہر اسے طلاق دے کر پاکستان چلا جاتا ہے۔ جمیل اور چھمی شادی کر لیتے ہیں اور ہندوستان میں ہی رہ جاتے ہیں۔ عالیہ اور اس کی ماں کو پاکستان میں ایک وسیع وعریض کوٹھی الاٹ کر دی جاتی ہے۔ عالیہ ماضی کی یادوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔ وہ ایک سکول میں استانی لگ جاتی ہے۔ صبح کے وقت بچوں کو پڑھاتی ہے اور شام کو والٹن کیمپ میں جا کر مہاجرین کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کو اردو ادب میں لازوال حیثیت حاصل ہے۔ اس میں ان کے دلکش اسلوب کا بھی دخل ہے۔ یہ ناول قصے کی دلچسپی کے حوالے سے خون جگر سے تخلیق کردہ نظر آتا ہے اس کی فنی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیانیہ عمل، جزئیات اور مکالمے کے ذریعے کرداروں کے داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں کو زندہ کر دیتی ہیں درحقیقت

ناول کا مکمل مواد ہی فن کے خمیر میں اس خوبصورتی کے ساتھ گوندھا گیا ہے کہ پورا ناول پہلی سطر سے آخری سطر تک پڑھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

خدیجہ مستور کی اس لازوال تخلیق میں حب الوطنی کے جو عناصر سامنے آئے ہیں ان کا احاطہ درج ذیل اقتباسات کی صورت میں کیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد اردو ناول میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں ان میں آزادی، انقلاب اور وہ ظلم وستم ہیں جو آزادی کے وقت ہوئے ہیں۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ان گنت نعمتوں کے خزانے انسان کو عطا کیے ہیں۔ یہ موجود نہ ہوں تو وہ زندگی گزار ہی نہیں سکتا اور یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ وہ کسی بھی نعمت کا صحیح معنوں میں شکر نہیں ادا کر سکتا۔ ہر نعمت دوسری نعمت سے بڑھ کر نظر آتی ہے لہٰذا اس کی درجہ بندی مشکل ہے تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادی خدائے بزرگ و برتر کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے۔ اس کی قدر صرف وہی قوم کر سکتی ہے جو غلامی کے اندھیرے میں بھٹکتی اور ظلم کی چکی میں پستی رہی ہو۔ آزادی غلامی کا سب سے سہانا خواب ہوتی ہے۔ وہ اس خواب کی تعبیر پانے کے لیے طویل جدوجہد سے گزرتے ہیں اس راہ میں جان و مال کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ برصغیر کی آزادی کی بھی یہی تاریخ رہی ہے۔ جب پاکستان قائم ہوا اس وقت ہندو مسلم اور سکھ فسادات عروج پر تھے اس وقت آگ وخون کی ہولی کھیلی گئی اور شاید آسمان بھی رو دیا ہوگا۔ ان تمام واقعات کو نہایت ہنرمندی سے ہمارے ادب میں عکس بند کیا گیا ہے۔

آزادی کے اعلان کے بعد یہ طے ہو گیا تھا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں گے، اب لوگ کھل کر ان سے نفرت اور ان کے ملک چھوڑ کر جانے پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ خدیجہ مستور ان احساسات کو یوں قلمبند کرتی ہیں۔

> ''شاباش تم بڑی سمجھدار ہو، میری ساری امیدیں تم سے وابستہ ہیں، تم کو پتہ پہلے تھا کہ مجھے ان بے ایمان تاجروں سے نفرت ہے۔ انہوں نے ہمیں غلام بنا لیا ہے۔ مجھے بھی نفرت ہے ابا! اس نے ابا کو خوش کرنے کیلئے کہا تھا۔ ابا نے تپائی پر پیالی رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ ابا آخر سارے انگریزوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔ وہ آخر کب ملک پر حکومت کر رہی

ہیں۔انشااللہ ایک دن یہ سب اپنے ملک واپس چلے جائیں گے، میں تم لوگوں کے خیال
سے کچھ نہیں کرسکتا مگر اتنا بڑا ملک تو پڑا ہے نا؟'' (۴۱)

اپنے وطن، 'اپنی مٹی، اپنی دھرتی، جنم بھومی سے رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کبھی بھی کہیں بھی اس رشتے سے ناطہ نہیں توڑ سکتا۔ بالکل اسی طرح ان سطور میں بھی وطن سے محبت کا اظہار فرنگیوں سے نفرت کے اظہار کے ذریعے کیا گیا ہے۔

اب آزادی کے اعلان کے بعد انگریز اپنے ملک واپس لوٹ جائیں گے تو لوگوں کے دلوں میں امید کی ایک نئی کرن پھوٹ پڑی ہے۔ ایک ایسے ملک کی امید جہاں آزادی ہوگی جہاں کوئی غاصب نہ ہوگا۔ آزادی کے اعلان کے بعد مسلمان اس یقین میں مبتلا ہو گئے تھے کہ نئے اور آزاد ملک میں سب کچھ ہوگا سب امن ہوگا، تمام مصائب، تکالیف اور مصیبتوں سے نجات مل جائے گی چونکہ مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کے کٹھ جوڑ کی وجہ سے محکومی اور ظلم و ستم کا شکار تھے۔ پاکستان کی صورت میں انہیں ایک ایسا زمین کا ٹکڑا ملنے والا تھا جس کی آغوش سب کے زخم مندمل کر دے گی۔ اسی امید پر مسلمان زندگی گزار رہے تھے۔ اسی دن اور وطن کے لیے وہ تمام ظلم سہہ رہے تھے۔ ناانصافیاں برداشت کر رہے تھے کہ پاکستان کی صورت میں ان کے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا اسی امید اور انتظار کو ناول نگار نے جس طرح الفاظ میں ڈھالا ہے وہ کچھ یوں ہے:

''بڑے چچا سے گھر کی ضرورتوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ سرخ پڑ جاتے جانے کیوں جھینپ
جھینپ کر سب کی طرف دیکھتے، اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور پھر بڑی
امنگ سے سب کو سمجھانا چاہتے جب ملک آزاد ہو جائے گا تو سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی
تم لوگ ذرا گہرائی میں جا کر سوچو۔ ''(۴۲)

محکومی اور ظلم کی چکی میں پستے مسلمان اب ہر وقت قیام پاکستان کے منتظر تھے۔ اسی طرح گھر کی ضرورتوں کا ذکر کیا جاتا تو پریشانی کے سبب ناول کا کردار بڑے چچا فکر مند ہو جاتے۔ مگر وہ سب کو امید دلاتے کہ پریشانی اور مصیبتوں کے دن ختم ہونے والے ہیں اور جب ہم پاکستان جائیں گے تو تمام مسائل ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے اور پھر بس راحت امن اور سکون ہوگا۔

یہ حب الوطنی کے جذبے کے تحت ہی ہے کہ ایک آس اور امید کے بل پر مظالم اور پریشانیاں برداشت کی جا رہی ہیں۔ اور یہ آس اور امید اس وطن سے ہے جو ابھی آزاد نہیں ہوا جس کا کوئی وجود نہیں سوائے نام کے اس سے بڑھ کر حب الوطنی کی مثال کیا ہو سکتی ہے۔ خدیجہ مستور یوں رقم طراز ہیں:

''میں نہ کہتی تھی کہ ہر مسلمان لیگ میں شامل ہو، مسلم لیگ زندہ باد۔ چھمی نے بھی نعرہ لگا دیا مگر اس وقت کسی نے اس کی خوشی اور نعرے کی پرواہ نہ کی، بڑی چچی جو ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھیں رو رو کر آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔ جمیل بھیا انہیں تھپک رہے تھے، پانی پلا رہے تھے مگر ان کی دیوانی آنکھوں میں ذرا ٹھراؤ نہ پیدا ہو رہا تھا۔ چھمی نے بھی پاکستان سے محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر نعرہ لگایا کہ سب مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہیے۔ مسلم لیگ زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اور یہ وطن پاکستان سے محبت کا اظہار تھا۔''(۴۳)

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد لاہور منظور ہو گئی جسے ہندوؤں نے طنزاً قرارداد پاکستان کا نام دے دیا۔ یہ نام مسلمانوں کو پسند آ گیا اور یہ قرارداد پاکستان کہلائی جانے لگی۔ قرارداد لاہور کے بارے میں خدیجہ مستور یوں رقم طراز ہیں:

''قراردادِ لاہور منظور ہو گئی، آٹھ کروڑ مسلمان اپنا حق لیکر رہیں گے۔ صبح تڑکے تڑکے اخبار والے کو کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک جھانک کر لوگ آوازیں دے رہے تھے۔ آج اخبار خریدنے میں سارا محلّہ پیش پیش تھا۔''(۴۴)

جب قرارداد لاہور منظور ہو جاتی ہے تو دوسرے دن وطن سے محبت کے لیے ایک الگ آزاد وطن کی اُمید میں سب لوگ اخبار خریدتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو اب اُمید پیدا ہو گئی ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمان آزادی کا حق لے کر رہیں گے۔

آزادی کی نوید کے بعد لوگ پر جوش اور پر امید نظر آتے ہیں اور بس ان کو پختہ یقین ہو گیا ہے کہ پاکستان جیسی پاک سرزمین پر پہنچتے ہی ہمیں ہر قسم کا امان ہو گا۔ سب بچھڑے مل جائیں سب غم غلط ہو جائیں گے۔

خدیجہ مستور نے بھی نہایت مہارت سے تمام واقعات کو واگزار کیا ہے اپنے قلم کی جادوانی سے انہوں نے محکوم اور مظلوم ہندوستانی مسلمانوں کی جذبات کی عکاسی کی ہے۔

اس آس وامید کا تذکرہ ان سطور میں ہے کہ کیسے لوگ دیوانہ وار وطن کی چاہ میں جی رہے تھے کہ تمام امیدیں آزادی سے وابستہ کر لی تھیں۔ سب کو کامل یقین تھا کہ آزادی کے بعد انگریز بھاگ جائیں گے اور ایک پرامن اور پرسکون زندگی ہماری منتظر ہوگی ناول نگار یوں رقم طراز ہیں:

> ''مت روئیے بڑی بھابھی، جب ملک آزاد ہوگا تو شکیل بھی واپس آجائے گا'۔ اماں نے مضحکہ خیز طریقے سے کہا اور داد طلب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اور جب ملک آزاد ہوگا تو سارے انگریز دُم دبا کر بھاگ جائیں گے، ہمارے پاکستان میں تو ایک انگریز بھی نہ رہے گا''۔ چھمی بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔'' (۴۵)

اماں اپنی بڑی بھابھی کو دلاسہ دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ جب ملک آزاد ہوگا تو انگریز واپس انگلستان چلے جائیں گے اور ان کی غلامی سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی کیوں کہ ہمارے وطن پاکستان میں کوئی انگریز نہ ہوگا اور ان کا بچھڑا بیٹا شکیل بھی واپس آجائے گا۔

خواتین، مرد سب حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں اور آزادی کے لیے ہونے والے جلوسوں میں دیوانہ وار حصہ لے رہے تھے کوئی شریک ہو کر تو کوئی اپنی بنائی اشیاء بھیج کر۔ غرض ہر ایک پاکستان کی محبت سے سرشار ہے اور وہ اپنے وطن کی محبت میں بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار کھڑا ہے۔

زیرِ نظر مکالمے میں بھی دو نوجوان لڑکیاں آزادی کے جلوس کے بارے میں اور گھر کے مرد حضرات کے رد عمل پر بحث کر رہی ہیں۔ خدیجہ مستور یوں رقم طراز ہیں:

> ''جلوس قریب آ گیا ہے۔ بچے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ ''مسلم لیگ زندہ باد، قائداعظم زندہ باد، بن کر رہے گا پاکستان، دھتیا راج نہیں ہوگا، چڈیا راج نہیں ہوگا۔ عالیہ چھت کی منڈیر سے جھک کر گلی میں جھانکنے لگی، دو بڑے لڑکے مشعلیں اٹھائے سب سے آگے تھے۔

نہیں دیکھنے دیا ظالم نے''، چھمی جھانکتی ہوئی آئی اور عالیہ کے برابر کھڑے ہو کر نیچے گلی میں آدھی لٹک گئی''۔ ہائے کیسا شاندار جلوس ہے وہ آپ کے بڑے چچا نے دروازے سے جلوس نہیں دیکھنے دیا، جل کر خاک ہو گئے حضرت۔

ہائے بجیا میں نے مشعلیں کیسی اچھی بنائی ہیں، ہیں نا؟ چھمی نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ آج تو آپ کے بڑے چچا جلتے جلتے ختم ہو جائیں گے۔

چھمی کیسی باتیں کرتی ہو چھمی، بس پتہ چل گیا کہ لیگی ویگی کچھ نہیں ہو، بڑے چچا کو جلانے کے لیے یہ سوانگ رچایا ہے۔'' (۴۶)

تمام لوگ بچے، بوڑھے خواتین پاکستان کے لیے جیتے مرتے ہیں، سب کو ایک ہی انتظار ہے کہ وہ اپنے ملک جائیں، غلامی سے نجات حاصل کریں سب پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے جا رہے ہیں۔ بن کے رہے گا پاکستان کے نعروں سے گلی، محلے بازار گونج اٹھے ہیں۔ ہر ایک حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے اور ایک روشن مستقبل کے منتظر ہیں۔

پاکستان کے قیام کے اعلان کے بعد مسلمانوں میں نہایت ملے جلے ردعمل کا اظہار سامنے آیا ہے کچھ لوگ تقسیم سے بہت خوش اور کچھ لوگ نالاں نظر آ رہے تھے۔ دونوں کے اس ردِعمل کی وجہ بنیادی طور پر حب الوطنی ہی تھی جو لوگ مخالف تھے وہ اپنا گھر بار، اپنے آباؤ اجداد کی زمین نہیں چھوڑنا چاہ رہے تھے اور جو لوگ حق میں تھے وہ الگ اور آزاد وطن کی محبت میں مسرور تھے۔ اس حوالے سے ناول نگار یوں رقم طراز ہیں:

''شام کو بڑے چچا گھر آئے تو اپنی بیٹی کے پاس ٹک گئے۔ وہ بڑے چاؤ سے باتیں کر رہے تھے کہ چھمی کو ایک دم جوش آ گیا۔ ساری سنجیدگی غرق ہو گئی اور وہ بچوں کو جمع کر کے نعرے لگانے لگی۔ مسلم لیگ زندہ باد بن کر دہے گا پاکستان۔ دھتیا راج نہیں ہوگا، چٹیا راج نہیں ہوگا۔'' (۴۷)

چھمی جو کہ پاکستان کی محبت میں سرشار ہے وہ کسی کے بھی وجود کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے برملا اپنی خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ وہ محلے کے بچوں کو جمع کر کے مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں نعرے لگاتی ہے اور یہ نعرہ بھی لگاتی

ہے کہ ہندو راج نہیں چلے گا۔ گو کہ اس کے اس عمل سے گھر کے ماحول میں تناؤ آجاتا ہے مگر وہ ان سب باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پاکستان سے محبت کا اظہار کرتی ہے۔

قیام پاکستان کے اعلان سے مسلمانوں میں بے پناہ جوش وخروش پیدا ہوا اور ہر گلی، محلّہ، بازار کم وبیش سیاسی میدان لگنے لگا گھر گھر سیاست پر بات ہونے لگی ہر ایک پاکستان کے مقصد اور حقیقت کو بیان کر رہا تھا۔ اسی طرح اس پیراگراف میں دسترخوان پر پاکستان کی مقصدیت پر آگاہی دی جارہی تھی۔ جمیل بھیا پاکستان کے قیام سے متعلق پر جوش خطاب کر رہے تھے۔ جمیل بھیا بڑے وثوق سے کہہ رہے تھے کہ قیام پاکستان کو کوئی نہیں روک سکتا۔ دس کروڑ مسلمان اپنے الگ اور آزاد وطن کے لیے کھڑے ہیں۔ کوئی ہندو اور کوئی طاقت انہیں اس مطالبے سے روک نہیں سکتی۔

وہ مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو لوگ جہاں ہیں وہیں رہیں گے اور کوئی ہندو کسی مسلمان کو یہ نہیں کہے گا کہ اپنے ملک جاؤ کیوں کہ ہم پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں کو نہیں کہیں گے کہ وہ یہاں سے جائیں۔ ناول نگار ان مکالمات کو یوں بیان کرتی ہیں:

> ''رات جب سب لوگ کھانا کھا رہے تھے تو جمیل بھیا بڑے جوش وخروش سے بولتے جا رہے تھے۔ مطالبہ پاکستان ایک ایسی حقیقت ہے جیسے ہم آپ بیٹھے ہیں۔ کانگریسی لاکھ روڑے اٹکائیں مگر کچھ نہیں کر سکتے۔ دس کروڑ مسلمانوں کے اس مطالبے کو کون روک سکتا ہے۔ تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے؟ بڑی چچی نے پوچھا۔
>
> واہ! ''اس کی کیا ضرورت پڑے گی۔ جو جہاں ہے وہیں رہے گا''۔
>
> مگر ہندو ہمیں کیوں رہنے دیں گے، وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاؤ۔

ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے ہم ان سے کب کہیں
گے کہ جاؤ۔''(۴۸)

آزادی گرما گرم بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔قیام پاکستان کے اعلان نے مسلمانوں کے اندر ایک نیا جوش اور جذبہ پھونک دیا ہے۔قیام پاکستان کے اعلان سے حب الوطنی کا جوش و ولولہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔مسلمان اپنے وطن کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ان سطور میں بحث یہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد کیا سارے مسلمان پاکستان چلے جائیں گے،جس کے جواب میں جمیل بھیا کہتے ہیں کہ جو جہاں ہے وہیں رہے گا کوئی کسی کو کسی دوسرے ملک جانے کا نہیں کہے گا کیوں کہ جو ہندو پاکستان میں مقیم ہوں گے انھیں ہم وہاں سے جانے کا نہیں کہیں گے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو حالات پیش آئے ہیں انھوں نے سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔بڑے چچا ان لوگوں میں سے تھے جو قیام پاکستان پر پاکستان نہیں گئے وہ اپنے آباؤ اجداد کی زمین کو چھوڑ کر نہ جا سکے مگر جو آگ اور خون کی ہولی مسلمانوں کے خون سے کھیلی گئی اس نے ان کو شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا۔ان کا خیال تھا کہ سب کچھ پرامن ہوگا اور ہندو مسلمانوں اور سکھوں کو کچھ نہیں کہیں گے مگر جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا،ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا اور بستی کی بستیاں اجاڑ دیں ان سب حالات کے مدنظر کوئی بھی ذی ہوش حواس باختہ ہوسکتا تھا اور بہت سے لوگ ذہنی ونفسیاتی مریض ہوئے۔بڑے چچا کی کیفیت کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے:

''پاکستان بن گیا۔لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جا چکے تھے۔پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی بڑے چچا اس صدمے سے جیسے نڈھال ہو گئے تھے۔
بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے! یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ انہیں کس نے سکھایا ہے؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟''(۴۹)

جب وہ یہ سب کچھ عالیہ سے پوچھتے تو وہ ان کا سر سہلانے لگی۔بڑے چچا آپ آرام کیجیے،آپ تھک گئے ہیں بڑے 'چچا' اور بڑے چچا اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے خون کی ندی ان کی آنکھوں کے سامنے بہہ رہی ہو۔

قیام پاکستان سے قبل بھی مسلمان ہندوؤں کے محکوم تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہر شعبہ ہائے زندگی میں اپنے ماتحت رکھا ہوا تھا۔ مسلمان ہر قسم کی پستی کا شکار تھے۔ ان حالات کا سامنا کرتے ہوئے جب مسلمانوں نے اپنے لیے الگ اور آزاد وطن کا مطالبہ کیا تو ہندوؤں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور جب پاکستان بن گیا تو جو لوگ ہجرت کر کے پاکستان جا رہے تھے انہیں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا۔ قافلوں کے قافلے ختم کر دیئے گئے کسی بچے، بوڑھے عورت مرد پر ترس نہ کھایا گیا۔ خواتین کی عصمت دری کی گئی۔ مسلمان خواتین کو بیچ دیا گیا۔ غرض مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے مگر یہ جذبہ حب الوطنی ہی تھا کہ جس کے تحت مسلمانوں نے کسی بھی چیز اور کسی بھی غم کی پروانہ کی۔

بڑے چچا اس خوش فہمی میں تھے کہ قیام پاکستان کے وقت ہندو مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر نہ مجبور کریں گے اور نہ ہی کوئی تکلیف دیں گے مگر ہندو تو شروع ہی سے مسلمانوں کے دشمن رہے ہیں اور دشمنی نبھانے کا ایک اور موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتے تھے لہٰذا انہوں نے انگریزوں کی آشیر باد سے سکھوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ بڑے چچا کو اپنی سوچ کے برعکس ہوتے دیکھ کر شدید صدمہ پہنچا۔

قیام پاکستان پر پل پل حالات واقعات بدل رہے تھے اور حادثات جنم لے رہے تھے۔ بڑے بڑے خاندانوں کے لوگ بٹ گئے کوئی جانے والے تھے اور تیار بیٹھے تھے اور کوئی جانے والوں کو منع کر رہے تھے ان کے خیال میں پاکستان وہ لوگ جائیں جو یہاں غیر محفوظ ہیں مگر وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ہندوستان میں کوئی محفوظ نہیں۔

انہی لوگوں میں ایک بڑے چچا اور ان کا خاندان تھا جو خود کو ہندوستان میں محفوظ سمجھ رہے تھے اور خاندان کے باقی لوگوں کو بھی ہجرت سے منع کر رہے تھے مگر جو لوگ وطن کی محبت میں شرشار تھے انہیں کون روک سکتا تھا وہ تو پہلے ہی سب کچھ پاکستان کے نام کر چکے تھے۔ اس حوالے سے ناول نگار یوں رقم طراز ہیں:

> ''شام کو سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آ گیا۔ انہوں نے اماں کو لکھا تھا کہ انہوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً جواب دیجئے اور تیار رہیں''۔ بس ابھی تار دے

دو جمیل میاں، ہماری تیاری میں کیا لگے گا، ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں''۔ ہے! اپنا بھائی ہے
بھلا ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا سکتا ہے؟ مارے خوشی کے اماں کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔'' (۵۰)

جو لوگ پاکستان کی محبت میں مبتلا تھے انہیں کوئی تسلی کوئی آسرا ہندوستان میں رہنے پر مجبور نہ کر سکا۔ مسلمان پاکستان جانے کے لیے انتہائی بے تاب تھے گو کہ انہیں معلوم تھا کہ ہندو فسادی راستے میں گھات لگائے کھڑے ہوں گے اور ان کی محفوظ آمد پاکستان میں ناممکن ہے مگر انہوں نے اپنے وطن کے لیے تمام تر مصیبتیں اور پریشانیاں اٹھانے کی ٹھان رکھی تھی۔ عالیہ کی امی بھی انہی لوگوں میں سے تھی جو پاکستان جانے کے لیے انتہائی بے قرار تھی اور جیسے ان کے بھائی کا خط آیا کہ انہوں نے پاکستان کے لیے اپنی خدمات وقف کر دی ہیں اور پاکستان جا رہے ہیں اگر ان کی بہن کو جانا ہے تو بتائیں اور تیار رہیں۔ عالیہ کی اماں تو پہلے ہی بے قرار تھیں اپنے ملک جانے کے لیے اسی لیے فوراً حامی بھر لی۔

صورتحال اس قدر گھمبیر تھی کہ جو لوگ جانا چاہ رہے تھے وہ جا رہے تھے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جانا چاہتے تھے مگر ان کے بزرگ نہیں جا رہے تھے اور نہ انہیں جانے کی اجازت تھی چھمی ان لوگوں میں سے تھی جو جانا چاہتے تھے مگر جا نہیں سکتے تھے۔

اس کے لکھے خط کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے:

''چھمی کا خط آیا تھا اس نے کیا لکھا ہے عالیہ؟ بڑی چچی نے پوچھا اس نے لکھا ہے کہ
پاکستان جانا مبارک ہو، ضرور جایئے اس پاک سرزمین کو میری طرف سے چومئے گا اور
مجھے وہاں کی تھوڑی سی مٹی بھیج دیجئے گا۔ میں اپنی مانگ میں لگاؤں گی، میں بدنصیب تو
وہاں بھی نہیں جا سکتی اور سب دعا سلام لکھی ہے''۔ عالیہ کو جتنا یاد تھا سب سنا دیا۔'' (۵۱)

عالیہ بڑی چچی کو بتاتی ہے کہ چھمی نے خط لکھا تھا۔ بڑی چچی خط کا متن پوچھتی ہیں تو وہ بتاتی ہیں کہ چھمی نے پاکستان جانے پر مبارک باد دی ہے اور کہا ہے کہ ضرور جانا اور اس پاک سرزمین کی پاک مٹی مجھے بھیجنا کیوں کہ میں بد نصیب تو جا نہیں سکتی اسی لیے وہ مٹی میں اپنی مانگ میں لگاؤں گی۔

آبلہ پا (۱۹۶۴ء)

رضیہ فصیح احمد ایک منجھی ہوئی اور بہترین داستان گو ہیں انہوں نے آبلہ پا میں آزادی کی جدوجہد سے لے کر قیام پاکستان اور اس کے بعد کے واقعات کو نہایت خوبصورتی اور مہارت سے قلم بند کیا ہے کہ قاری خود کو ان حالات و واقعات میں موجود پاتا ہے۔ آبلہ پا میں حب الوطنی کے جو عناصر پائے جاتے ہیں ان کا احاطہ اس حصے میں کیا گیا ہے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں نے آزادی کی جدوجہد میں اضافہ کر دیا اسی بناء پر ملک میں ایک بے چینی، عدم اعتماد کی فضاء نے جنم لیا۔ ہندو انگریزوں سے ملک چھوڑنے کا مطالبہ کرتے جبکہ مسلمانوں نے اپنے الگ وطن کا مطالبہ کیا کیونکہ مسلمان سمجھ چکے تھے ان کی تہذیب وتمدن اور معاشرتی ترقی کا پنپنا ناممکن تھا کیونکہ ہندو ہر چیز پر قابض تھے۔ ناول نگار ان حالات کو یوں بیان کرتی ہیں:

> ''جنگ ختم ہونے کے بعد آزادی کی جدوجہد نے وہ تیزی پکڑی کہ سانس لینے کی مہلت نہ ملی، نعرے، تقریریں، بحثیں، فساد عام ہو گئے۔ اسکول میں مسلمان اور ہندو لڑکیوں کے درمیان تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف آزادی کی امید کیساتھ آپس میں پھیلتے ہوئے عدم اعتماد کی وجہ سے بے چینی بڑھ رہی تھی ایسے میں تائی نے بہتر سمجھا کہ تعلیم کے ان جانباز سپاہیوں کو مورچے سے واپس کر دیا جائے چنانچہ وہ تینوں پھر اکٹھ باسٹھ کرتے یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں جا پہنچے جہاں ان دنوں ان کے بابا کا تقرر تھا اپنے گھر سے نکلے اب کئی سال گزر چکے تھے وہ اب ہوشیار ہو رہی تھی مگر اب بھی بیرونی دنیا کی بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔'' (۵۲)

قیامِ پاکستان کی بازگشت سننے کے بعد مسلمانوں نے جہد مسلسل کے لیے اپنی کمر کس لی۔ مسلمانوں کا پاکستان کے لیے نعرہ بلند کرتے ہی نفرت کا ایک دور شروع ہو گیا۔ ہندوؤں کی مسلمانوں کے لیے تنگ نظری اور تعصب سامنے آنا شروع ہو گیا۔

ہر جگہ مسلمان اور ہندو بحث کرتے نظر آتے۔ تلخیاں بڑھتی جا رہی تھیں ایسے میں تائی یوپی چلی گئیں اور بچوں کو اسکول سے ہٹا کر ساتھ لے گئی اب وہ زندگی کے رموز سے واقف ہو رہی تھیں مگر ابھی بھی بہت وقت درکار تھا پوری

طرح بدلتے معاشرتی حالات کو سمجھنے کے لیے۔

قیام پاکستان کے بعد حب الوطنی کا الگ رمز نظر آیا اس میں پاکستان کے مختلف علاقوں کا نہایت خوبصورتی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ رضیہ فصیح نے نہایت مہارت، خوبصورتی اور سیاحتی مقامات کو خوبصورتی سے قلم بند کیا ہے۔

ان سطور میں ایبٹ آباد کے جنت نظیر علاقے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ حب الوطنی کا ایک اور مقام ملک کے علاقوں اور جگہوں کی دلکشی کو بیان کر کے اپنی وطن پرستی کا اظہار کیا ہے۔ ایبٹ آباد شمالی پاکستان کے سیاحتی ،خوبصورت اور ٹھنڈے علاقوں میں سے ہے۔

ناول کے کردار بھی انہی علاقوں کی سیر کو نکلتے ہیں۔ ان کے خیالات اور مناظر کو ناول نگار کچھ اس طریقے سے الفاظ میں ڈھالتی ہیں۔

> ''ایک ہفتے اس پرسکون جگہ پر رہ کر وہ ایبٹ آباد کی بلندیوں کی طرف روانہ ہو گئے اپنی چھوٹی سی کار میں وہ تنہایوں محسوس کرتے تھے جیسے دو آزاد پرندے ہیں جو فضا میں اڑتے پھرتے ہیں اور ہر خوبصورت نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے کسی ڈال یا پات پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایبٹ آباد کے راستے میں چھوٹی بڑی پہاڑیوں پر تازہ گھاس ہلکی مخملیں چادر کی طرح پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بائیں طرف کے پہاڑوں پر جگہ جگہ سرمئی دھواں منجمد ہو گیا تھا جو ان بلندیوں پر جگہ جگہ بنے ہوئے مکانوں کی نشان دہی کر رہا تھا۔ کہیں کہیں تندور کے شعلے بھی بلند ہو رہے تھے۔ '' (۵۳)

ایبٹ آباد ایک پُر فضا اور پُر سکون مقام ہے۔ ناول کی ایک کردار ایبٹ آباد کی بلندیوں کی طرف رواں دواں ہوتی ہے۔ وُہ آزاد پرندے کی طرح محسوس کرتی ہے اور خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ ایبٹ آباد کے پُر فضا مقام کا ذکر دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ناول کی مرکزی کردار صبا پاکستان کے بالائی علاقوں کی سیر کو نکلتی ہے اور اس علاقے کی خوبصورتی کو اپنے

الفاظ اور خیالات میں بیان کرتی ہے۔سیدو شریف پراؤ کا اگلا مقام ہے جو کہ ایک خوبصورت علاقہ اسلام آباد ملحق یہ گاؤں بھی انتہائی خوبصورت اور حسین ہے۔سیدو شریف کے حسین مناظر کو ناول نگار نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''شام کو وہ سیدو شریف پہنچے اور وہاں سے دو میل چناروں کے سائے میں اور دریا کے کنارے دبے ہوئے مینگورہ ہاؤس میں اپنا سامان ڈال کر اور چائے پی کر مزار دیکھنے گئے جو سیدو شریف سے دس میل دور ہے، لمبے لمبے گھاس کے قطعوں کائی لگی پہاڑیوں چنار کے چھتنار درختوں سے گھرا ہوا سفید محل بہت خوبصورت لگ رہا تھا وہ بائیں طرف پڑی ہوئی سنگ مرمر کی بنچوں پر بیٹھ گئے۔اوپر پہاڑیوں سے بہتا ہوا پانی نشیب میں آرہا تھا۔بیچ میں اُگے ہوئے درختوں کے چاروں طرف چکر کاٹنا، بڑے پتھروں سے بچتا چھوٹے پتھروں کو پھلانکتا وہ نیچے چلا جارہا تھا۔'' (۵۴)

سیدو شریف کی تعریف وطن سے محبت اور الفت کا اظہار ہے اس کے ساتھ ساتھ ایسے مقامات پر انسان کو قدرت کے حسین شاہکاروں کو دیکھ کر خدا کی قدرت پر اور پختہ یقین ہو جاتا ہے۔یہ مقامات انسپائریشن کا سبب بھی ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر پانی۔

ناول کی ہیروئن صبا بھی پانی سے متاثر ہو کر کہتی ہے کہ انسان کو پانی کی طرح ہونا چاہیئے جہاں کم جگہ ملے وہاں سکڑ جاتا ہے اور جناں کشادہ جگہ ملے وہاں پانی پھیل جاتا ہے پانی ہر حال میں خاموش بہتا چلا جاتا ہے۔وہ ناامید نہیں ہوتا۔کہیں نہ کہیں سے اپنا رستہ نکال لیتا ہے اور اس کی اسی مستقل مزاجی کی راہ میں چٹانیں بھی پاش پاش ہو جاتی ہیں۔

وطن کی محبت جس کے دل میں بس جائے وہ ہر جگہ اس کی یاد میں کھوئے رہتے ہیں۔ٹھیک اسی طرح ہم جہاں جاتے ہیں جس کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں اس کا عکس نظر آتا ہے۔

ان سطور میں بھی ناول کے کردار قصہ ماضی میں پشاور اور نوشہرو کو یاد کرتے نظر آتے ہیں رضیہ فصیح احمد کچھ یوں لکھتی ہیں:

''پھر ہمیں اکثر واقعات یاد آتے رہتے ہیں کئی دفعہ یوں ہوا کہ ہم نیویارک کے کسی شاندار سے ہوٹل میں صوفہ پر بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہیں اور اچانک مجھے نوشہرہ بس اسٹینڈ کا زنانہ ویٹنگ روم یاد آ گیا جہاں کسی نامعلوم منبع سے آیا ہوا نصف فٹ پانی ہر وقت بھرا رہتا ہے۔اس میں گنڈیریوں کی سفید پھولی ہوئی لاشیں اور مالٹے کے چھلکوں کے لائف بیلٹ تیرتے رہتے ہیں۔میل سے چیکٹ بینچوں پر معطر بدبوؤں سے بسی ہوئی عورتیں اجنبی تیز تیز نگاہوں سے مجھ جیسی غیر جنس کو مستقل اپنی زبان میں کچھ بولتی جا رہی ہیں اور جب لندن کے پکاڈلی بازار میں گھوم رہے ہوتے تو اچانک امجد کہتے۔نامعلوم کیوں اس وقت مجھے پشاور کا قصہ خوانی بازار یاد آ گیا۔بروک لین برج پر سے گزرتے ہوئے ہمیں اپنے جھولتے ہوئے کشتیوں کے پل یاد آئے۔ایک ڈرگ اسٹور میں گھس کر سائیکل اور ریڈیو سے لے کر کتابیں اور آئس کریم تک دیکھ کر دل بہل جاتا اور اپنے وطن کی دکان دکان پھر کر چیز ڈھونڈنے اور بھاؤ تاؤ کرنے کو طبعیت مچل اٹھتی۔'' (۵۵)

ان سطور میں ناول کے کردار پشاور اور نوشہرہ کو یاد کرتے ہیں جب کہ وہ پیرس، بروکلین اور نیویارک میں ہوتے ہیں۔یہ وطن کی کشش ہی ہے کہ آپ دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں ہیں مگر آپ کو اپنے وطن، اپنی دھرتی کی اشیاء اور مقامات بار ہا یاد آتے ہیں اور آپ ان کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔دنیا بہت چھوٹی ہے یا دنیا گول کا فقرہ کبھی کبھی یوں بھی پورا ہو جاتا ہے کہ آپ کسی شخص سے ایک جگہ ملے ہیں اور پھر کسی ملک میں کبھی ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔سیاحت میں ایسے اتفاقات ہوتے ہیں۔

جس ملک کو اتنی جہد مسلسل اور قربانیوں کو بعد حاصل کیا گیا ہے وہاں مختلف محکموں کی حالت زار اور کارکردگی کو دیکھ کر صبا انتہائی دکھ اور افسوس کا اظہار کرتی ہے۔

محکموں کی کارکردگی کا عالم یہ ہے کہ چند برس قبل بنائے گئے پل اور دیگر تعمیرات پر آئے روز مرمت کا کام کیا جاتا ہے جب کہ ڈیڑھ دو صدی پرانے پل اسی طرح موجود ہیں۔مضبوط اور سلامت کوئی نہ کوئی مصلحت ایمانداری اور نیک نیتی کے آڑے آ کر محکموں کی کارکردگیوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ناول نگار ان کی ترجمانی یوں

کرتی ہیں:

''کارکردگی ہر محکمے میں بہت کم ہے ذاتی فائدے کے لیے لوگ دوسروں کو اپنے دوستوں تک کو نیچا دکھانے سے نہیں چوکتے آپ نے کبھی مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں میں جا کر دیکھا کہ اٹھارہ سو کچھ کے پل جوں کے توں قائم ہیں اور چند سال پہلے کے بنائے ہوئے پلوں پر آئے دن مرمت ہوتی رہتی ہے بعض جگہ یہی پل دوبارہ بنائے جا رہے ہیں بڑی بڑی پبلک عمارتوں میں جنہیں لاکھوں روپے کے خرچ سے بنایا جاتا ہے عمارت ختم ہونے سے پہلے دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔اس سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی۔''(۵۶)

ملک میں غبن اور بے ایمانی محکموں میں بڑھتی ہوئی بدعنوای کا حال بیان کرتے ہوئے صبا کہتی ہے کہ بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کے چند برس میں ہی کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ پل اور دیگر تعمیرات کا بھی یہی حال ہے کہ ادھر تعمیر ہوئیں ادھر مرمت کی نوبت آ گئی کوئی چیز، کوئی مصلحت کوئی بات تو ضرور ہے کہ ایسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔اس ناول میں مصنفہ نہایت ایمانداری سے اپنے ملک کے تعمیراتی حالات کا جائزہ لیتی ہے۔اور غیر معیاری تعمیرات پر گہرے دکھ کا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس کا یہ اظہار اس کی پاکستان سے لازوال محبت کا اظہار ہے۔وہ چاہتی ہے کہ ان کاموں کے لیے ایماندار لوگ آگے آئیں۔یہ کام مظبوط اور پائیدار ہوں اور ان کی عمر کا عرصہ زیادہ سے زیادہ ہو۔ پاکستان کے لوگ خوش حال ہوں۔اور یہاں امن، سکون اور سلامتی ہو۔اس کے علاوہ ملک کے انتہائی خوب صورت علاقوں کی سیر کے بعد بیرون ملک جا کر بھی اس کو اپنے ملک پاکستان کے شہر یاد آتے ہیں۔اور جسمانی طور پر وہاں ہونے کے باوجود ذہنی طور پر پاکستان میں ہوتی ہے۔یہی حب الوطنی ہے اور یہی پاکستان سے محبت کا ثبوت بھی ہے۔

خون مسلم (۱۹۶۹ء)

خون مسلم ایم اسلم کے آزادی کے ناول میں سے ایک ہے۔اس میں انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی

سے قیام پاکستان اوراس کے حالات وواقعات کا احاطہ کیا ہے۔آغاز میں انگریزوں کی سوچ کا احاطہ کیا گیا ہے کہ کس طرح انہوں نے جنگ آزادی کو غدر کا نام دے کر محکوم قوم کو ذلیل ورسوا کیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس غدر کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ مسلمانوں کے لیے مزید پریشان کن تھے۔انگریز ہندوؤں پر بھروسہ کرتے تھے اور ہندو مسلمانوں کو محکوم رکھنے اور ہر سطح پر پست رکھنے کی تراکیب سوچا کرتے۔انگریزوں اور ہندوؤں نے مل کر مسلمانوں کے حقوق پر شب خون مارا تھا اور مسلمانوں کو ہر لحاظ سے تاریکی و جہالت اور ظلم کی اندھیر نگری میں دھکیلا تھا۔ایم اسلم نہایت خوبصورتی اور مہارت سے ان حالات کو قلم بند کرتے ہیں:

> ''۵۷ء کے انقلاب کی یاد ممکن تھا کہ اہل ہند بھول جاتے لیکن انگریز کو یہ منظور نہ تھا انگریز کی سامراجی حکومت کی پالیسی میں یہ بھی شامل تھا کہ ۵۷ء کا انقلاب جسے انگریز نے غدر کا نام دیا ہندوستان کی تاریخ میں ایک خونی باب کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔یہ ایک سیاسی چال تھی ایک مکروہ اور ناپاک چال انگریزوں کو صرف یہ بتلانا تھا کہ ہندوستانیوں نے انگریز کی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور انگریزوں نے انہیں ہر ممکن طریقہ سے ذلیل کیا لیکن حقیقت میں ذلت کا یہ احساس صرف غریب مسلمانوں کے لیے تھا کیوں کہ انقلاب کے وقت ہندوستان کا نظم ونسق انگریز کے ہاتھ میں تھا لیکن رسی تو جل گئی ہے مگر بل نہیں گیا والی بات ابھی تک موجود تھی۔'' (۵۷)

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کی ناکامی ہندو تو بھول چکے تھے کیوں کہ انہیں اپنے مذموم مقاصد میں کامیابی حاصل ہو چکی تھی مگر انگریز یہ قطعاً نہیں چاہتے تھے وہ اپنے خلاف جنگ کو بھولنے دیتے اسی لیے انہوں نے اس جنگ کو غدر کا نام دیا۔انگریزوں نے بارود کی بو سے ہندوستان کی فضاء آلودہ کر دی تھی اور اس جنگ کو خون آشام واقعے میں بدل دیا وہ سب کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف جو بغاوت کی جرات کی تھی اسے کچل دیا گیا۔ بظاہر انگریزوں نے تمام ہندوستانیوں کو باور کروایا کہ ان کے خلاف کوئی بغاوت کا انجام اس

سے بھی بھیانک ہوگا مگر حقیقتاً یہ سب غریب مسلمانوں کے لیے تھا۔ انگریز ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو تمام حقوق سے محروم رکھ رہے تھے۔ گو کہ مسلمان اور ہندو صدیوں سے ایک جھنڈے تلے متحد چلے آ رہے تھے مگر ہندو شروع ہی سے موقعوں کی تلاش میں رہتے جس میں وہ مسلمانوں کو ایذاء پہنچائیں۔ اذیت میں مبتلا کریں انگریزوں کے قبضے اور پھر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب کھل کر سامنے آ گیا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی کھل کر مخالفت شروع کر دی اور ان کے جائز حقوق پر بھی غاصب ہو گئے۔ معاشی و معاشرتی شعبوں میں مسلمانوں کے لیے زندگی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ ان حالات کے مدنظر مسلمانوں کو احساس ہوا کہ ہندو کبھی ہمارے خیر خواہ نہیں ہو سکتے اور یوں دوقومی نظریہ وجود میں آیا جب کہ ہندو اس بات پر مصر رہے کہ ہندوستان ان کا ہے۔ کانگریس سب کی نمائندہ جماعت ہے۔ ان حالات کی عکاسی ایم اسلم نے کچھ اس طرح کی ہے:

> ''صدیوں سے مل کر رہنے والے ہندو اور مسلمان میں ہندو کی تعصب نگاہی اور سیاسی تنگ نظری کی وجہ سے دو قوموں کا نظریہ پیدا ہو گیا اور اسی نظریہ نے بالآخر مسلمانوں کو پاکستان کا تخیل عطا کیا۔ ہندوستان کے وہ مسلمان جو ملک کے ایسے گوشوں میں آباد تھے جہاں قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی پاک ہوا کا بھی ان تک پہنچنا ممکن نا تھا اس مقدس مقصد کے حصول کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔ اب ایک طرف ''جے ہندوستان کا نعرہ لگتا اور دوسری جانب ''پاکستان زندہ باد'' کی آواز ملک کی سیاسی فضا میں ایک ہیئت سی پیدا کر دیتی یہ دو سیاسی نعرے اس بات کا ایک ناقابل تردید ثبوت تھا کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ ہندو اور مسلمان! اور ہندو کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ سارے ہندوستان کی واحد نمائندہ ہے محض غلط ہے۔'' (۵۸)

مسلمان اس بات کا ادراک کر چکے تھے کہ اگر انہیں اپنی سیاسی سماجی اور معاشی بقاء چاہئے تو انہیں اپنے الگ

وطن کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی اوران کی جدوجہد کی بدولت انگریز سرکار مسلمان کوالگ وطن دینے اور ہندوستان کی تقسیم پر راضی ہوگئی تھی۔

مسلمانوں کے لیے الگ وطن اپنی تہذیب وتمدن اور ثقافت بقاء کے لئے ناگزیر تھا۔ان سب حالات کے برعکس ایک طوفان تھا جو آمد کا منتظر تھا۔وہ طوفان مسلمانوں پر برپا کیا جاتا تھا مسلمان چوں کہ حب الوطنی میں اپنا سب کچھ نچھاور کر کے پاک سرزمین جارہے تھے جو کہ ہندوؤں کو قطعاً قبول نہ تھا۔

مسلمانوں کو ہندوستان سے زبردستی نکلنے پر مجبور کر کے ہندو پاکستانی حکومت پر دباؤ بڑھانا چاہتے تھے تاکہ پاکستان انتظامی امور میں ناکام ہو جائے اور خدانخواستہ ٹوٹ جائے مگر مسلمانوں نے جس طرح اور جس جذبہ حب الوطنی کے تحت ملک حاصل کیا، اسی ایثار اور قربانی کے جذبے کے تحت ساٹھ ستر لاکھ مسلمانوں کو نہایت خوشدلی سے خوش آمدید کہتے ہوئے انہیں ملک میں بسایا۔اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی اور یہ قیامت تک پاکستانی قوم کے لیے باعث فخر ہے۔

ہندوؤں نے ہر لحاظ سے مسلمانوں کے ساتھ، پاکستان کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کی اور ہر وقت یہ چاہا کہ پاکستان کو کمزور کیا جائے تاکہ اس کو ختم کیا جا سکے مگر جو ملک اللہ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے احکامات کی پیروی کرنے کے لیے بنا ہو اسے بھلا کونسی باطل قوت مٹا سکتی ہیں۔اس صورتِ حال کا نقشہ ایم اسلم نے کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''پاکستان کی حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ فرشتے نہیں۔ہماری طرح کے انسان ہیں اور انسانوں سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں ظاہر ہے کہ حکومت کے اراکین سے بھی ہوتی ہوں گی لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں مصائب پر نگاہ ہو وہاں محاسن بھی نظر انداز نہ کیے جائیں آپ صرف ایک مہاجرین کا مسئلہ ہی لے لیں۔مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ سے مسلمانوں کو نکلنے پر مجبور کر کے ہندوؤں نے پاکستان پر ایک خوفناک ضرب لگائی تھی۔ ساٹھ ستر لاکھ مسلمانوں کو از سرنو بسانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ہندو کی یہ ایسی خوفناک چال تھی کہ اگر قدرت مسلمانوں کی مدد پر نہ ہوتی تو حاکم بدہن ! پاکستان کا قصہ ختم ہو چکا

تھا۔ پاکستان حکومت نے اس کام کو جس خوش اسلوبی سے کیا اور لاہور کے مسلمانوں نے جس ایثار اور محبت سے اپنے مہاجرین بھائیوں کی خاطر مدارات کی، پاکستان حکومت اور مسلمانوں کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جس پر ہر پاکستانی جتنا فخر کرے کم ہے۔'' (۵۹)

ہندوؤں نے ہر بار پاکستان کی حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لیے ایک نئی چال چلی ہے مگر قدرت نے ہر بار مسلمانوں کی مدد کی ہے۔ ہندوؤں نے دلی اور مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو زبردستی بے دخل کر دیا تا کہ ان کی املاک و جائیداد پر قبضہ کیا جا سکے اور ساتھ ہی پاکستان کی حکومت پر بوجھ ڈالا جائے مگر جذبہ حب الوطنی اور قربانی کے جذبے سے سرشار پاکستانیوں نے اور خاص طور پر لاہور کے باسیوں نے جس خوش اسلوبی سے مہاجرین کی آمد کے معاملے کو سنبھالا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ان سطور میں عین آزادی کے دن کے لحاظ سے ہونے والے شر و فساد کے اندیشے کا ذکر ہے مزید برآں مسلمانوں کے خلاف انگریزوں اور ہندوؤں کی سازش اور ناانصافی کا بیان ہے۔ ایم اسلم رقم طراز ہیں:

'' آپ کو تو خیال ہوگا کہ آپ کا پیشتر علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا؟ میں نے پوچھا، خیال تو بہت قوی تھا۔ ڈاکٹر نے جواب دیا''۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امیدیں پوری نہ ہوں گی اور آخر وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے خلاف دو زبردست طاقتیں کام کر رہی تھیں ایک انگریز کی مسلمان دشمنی۔ دوسری طرف ہندو کی دولت۔ انگریز کی تو مسلمانوں سے ہمیشہ دشمنی رہی لیکن جب پاکستان کا اعلان ہوا تو ہندو کی دولت نے انگریزوں کو بھی خرید لیا۔ پندرہ اگست کو حد بندی کے کمشن نے اپنے فیصلہ کا اعلان کرنا تھا۔ ۱۲ اگست کو میں نے ذاکر کے بیٹے کا ختنہ کیا اور اسی روز میرے ایک ملنے والے سکھ نے جس کا نام جسونت سنگھ تھا اور گاؤں کا نمبردار تھا مجھ سے کہا کہ پندرہ اگست کو شہر میں ہنگامہ ہوگا میں بال بچوں کو لے کر اس کے پاس گاؤں میں آ جاؤں!' (۶۰)

ہندوؤں نے انگریزوں کی مسلمان دشمنی کو ملحوظ خاطر لاتے ہوئے انگریزوں کو اپنی دولت کے عوض خرید لیا۔

انگریز تو ازل سے ہی مسلمانوں کے دشمن تھے انہوں نے حد بندیوں میں بھرپور ہندوؤں کی من مانی کی اور خلاف ورزیاں کیں اور وہ علاقے جو مسلم اکثریت کی بناء پر پاکستان کو دیئے جانے تھے وہ ہندوستان کو دے دیئے۔

قیام پاکستان کی لازوال داستان میں مسلمانوں نے کسی بھی قسم کی کوئی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا۔ اپنا سب کچھ ملک پر قربان کر دیا۔ یہ صرف پاک وطن کی محبت تھی جس نے انہیں ہر قدم پر مضبوطی اور استقامت بخشی۔ پاکستان کے ذرے ذرے کو ان لوگوں نے اپنی بے دریغ اور بے لوث قربانیوں سے جلا بخشی ہے یہی وہ پاک دامن پاک باطن لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان کے سپنے کو سچ کر دکھایا۔

قیام پاکستان کی تقسیم یوں تھی کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہ خود بخود پاکستان کی حدود میں شامل ہو جانے تھے اور یہ لوگ اپنے گھروں میں پاکستانی کہلانے کی آرزو، دلوں میں بسائے بیٹھے تھے مگر کسے معلوم تھا کہ انگریز، ہندو اور سکھ ملکر مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اور ظلم وستم کی داستانیں رقم کریں گے انہی حالات کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے۔

> ''یہ وہ لوگ تھے جو اپنے اپنے گھروں میں کسی روز پاکستانی کہلانے کی آس لگائے بیٹھے تھے لیکن پاکستان بنا تو انہیں گھر بھی چھوڑنا پڑا اور وطن بھی۔ جان بھی دینی پڑی اور عزت بھی! یہ سب انگریز کے ترکش آخری تیر سے گھائل۔ ہندو کی عیاری اور ظالم سکھوں کے ظلم وستم کے ستائے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن پھر بھی ان اداس اداس چہروں پر کچھ اطمینان سا بھی نظر آتا تھا۔ اس پریشانی اور بے چارگی میں یہ اطمینان؟ ہاں سب کچھ لُٹا دینے کے بعد اور موت کے خوفناک منہ سے بچ جانے کے بعد آج یہ سب سرزمین پاکستان میں تھے۔ اس پاک سرزمین میں تھے اس پاک سرزمین میں جو انہوں نے اپنے خون سے سینچی تھی۔ جہاں ہر فرد اُن کی خدمت کو اپنا ایمان سمجھتا تھا اور ان کے دکھ درد کا ساجھی تھا اور کیسے نہ ہوتا؟ یہی وہ نیک نفس اور پاک باطن مہاجر تھے جن کی ہمیشہ زندہ رہنے والی قربانیوں سے پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ آج یہ ہمارے معزز مہاجر بھائی گھر بار لٹا دینے کے بعد، بہو بیٹیوں کو بھینٹ چڑھا دینے کے بعد، جوان بیٹوں! معصوم جانوں، بے کس

بوڑھوں اور کمزور اور ناتواں عورتوں کی قربانی دینے کے بعد پاکستان میں تھے جس کی خاک کا
ذرہ ذرہ انہیں قدم قدم پر لبیک کہہ رہا تھا۔ کیوں؟ یہ بہادر پاکستان کی عزت کے علمبردار تھے
اور پاکستان کے پرچم کے نگہبان!۔ ‘‘ (۶۱)

قیام پاکستان کے وقت مسلم اکثریت کے وہ علاقے جو پاکستان کے حصے میں آئے تھے اور وہ لوگ جوان علاقوں میں مقیم تھے وہ اپنے گھروں میں ہی پاکستانی کہلانے کے منتظر تھے مگر انگریزوں نے ہندوؤں کے کہنے پر ان علاقوں کا الحاق ہندوستان کے ساتھ کر دیا اور پھر ظلم وستم کا اندھیری رات مسلمانوں کے لیے شروع ہوگئی۔ مسلمانوں زبردستی ان علاقوں سے ہجرت پر مجبور کر دیا گیا ان کو قتل کیا گیا یوں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان پہنچے تھے۔ مگر یہاں کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر ان کا استقبال کیا کیوں کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے گھر بار لُٹا کر، معصوم بچوں، بہو بیٹیوں، بوڑھوں کی قربانی دے کر اس ملک کو دوام بخشا۔

وطن کی محبت کی خاطر انہوں نے سب کچھ لٹا دیا اپنا سب کچھ لٹا دینے اور چھن جانے کے باوجود ان کے چہروں پر ایک سکون اور اطمینان تھا کہ جیسے جس مقصد کے لیے انہوں نے ہر قربانی دی وہ پالیا۔ آزادی کے اعلان کے بعد جس طرح مسلمانوں پر شب خون مارا گیا اس کی بناء پر ایک کوس بھی سلامتی سے چلنا محال تھا۔ ہندو اور سکھ جگہ جگہ بھالوں، برچھیوں اور تلواروں کے ساتھ پیاسے اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح مسلمانوں کی تاک میں تھے۔

لوگ جیسے تیسے سرحد کی طرف گامزن تھے، لٹے پٹے، بے سروساماں زخمی، بیمار بس سب پر اپنے وطن پاکستان پہنچنے کی دھن سوار تھی۔ درج ذیل سطور میں ایم اسلم ایک ہجرت کا مختصر سا احوال بیان کرتے ہیں:

’’تین سے کوئی چار پانچ کوس تک پاکستانی علاقہ تھا اس کے بعد مشرقی پنجاب کی حد شروع
ہوتی تھی اور بکرم سنگھ کا گاؤں بھی کوئی کوس ڈیڑھ کوس دور تھا چوہدری اور ان کے ساتھی
گھوڑوں پر سوار تھے۔ کہار ڈولی اٹھائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے کبھی کسی جگہ ذرا
ستانے کو بھی بیٹھ جاتے۔ تو خیر اس طرح چلتے چلتے حد پر پہنچ گئے۔‘‘ (۶۲)

لوگ بچتے بچاتے پاکستان کی حدود میں داخل ہونا چاہ رہے ہیں اور سکھ اور ہندو قافلوں میں لوٹ مار اور قتل و

غارت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اسی طرح چوہدری صاحب بھی چند گھڑ سواروں کے ہمراہ پاکستانی حدود میں آنے کے کوشاں ہیں بالآخران کی محنت اور حب الوطنی رنگ لاتی ہے اور وہ پاکستانی حدود میں پہنچ جاتے ہیں۔

آزادی کے فوراً بعد ایک عجیب فضا تھی۔لوگ سوگوار بھی تھے اور مطمئن بھی۔گزشتہ صدی سے جاری جدوجہد مسلسل اور ان گنت قربانیوں کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک الگ وطن ملا ہے۔تحریک آزادی کے حوالے سے سفاک تاریخ اور وقت کے کرداروں کو ناول نگاروں نے اپنے اپنے قلم سے ڈھالا ہے۔

تحریک آزادی پر اب تک لکھا جارہا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آزادی کی تحریک میں دل اور روح پر جو زخم لگتے ہیں اور جن المیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے وہ خون میں دوڑنے لگتے ہیں اور آگے کے نسلوں میں بھی منتقل ہوتے ہیں۔لہذا اس موضوع سے اجتناب نہیں برتا جاسکتا۔وہ لوگ جو براہ راست آزادی کے حصول کے المیوں سے نہ گزرے ہوں وہ بھی اس سے بچ کر نہیں گزر سکتے اس لیے کہ جب وہ اپنی تاریخ کو فکشن میں سموئیں گے تو آزادی کے لمحات کو زیرِ بحث لانا ہوگا اور یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا کھویا کیا پایا؟ آدرشوں کی کس حد تک تکمیل ہوئی۔ تحریک آزادی بھی زندگی کا رزمیہ ہے پھر ناول بھی بقول رالف فاکس جدید عہد کا رزمیہ ہوتا ہے اس رزمیہ کے آئینہ میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کا مرکز موجود ہوتا ہے، اسی میں عظیم نقصانات کی داستان ہے اور اسی میں عظیم لمحات، مسرتوں کا قصہ بھی ہے، اسی میں عظمتوں کا کھوج لگانے کا فکری جبر بھی موجود ہے۔لہذا تحریک آزادی کا موضوع ایک مستقل بالذات موضوع ہے جسے ہم اپنے عرصہ محشر میں کھنگالتے اور پرکھتے ہیں اور زندگی میں انسانی اعمال وافعال کی مشکل سے گرفت میں آنے میں جو گہرائی ہے، قاری اس کے مطالعاتی قرب سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔

تحریک آزادی پر مبنی ناولوں نے امن اور افراتفری اور ہمہ گیر خلفشاروں کے زمانوں اور عہدوں کے انسانوں کی معاشرتی، تہذیبی، سیاسی، معاشی اور نفسیاتی کیفیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔دنیا تیزی سے بدل رہی ہے، اب بھی بہت سے خطوں میں آزادی کی جدوجہد چل رہی ہے یوں لگتا ہے کہ انسان ایک انتہائی طویل عرصوں سے مختلف قسم کی غلامیوں اور نوآبادیاتی دکھوں اور پریشانیوں کا شکار رہا ہے۔جس کی وجہ سے ہجرت، غریب الوطنی، ناسٹلجیا، اور دوسرے

جان لیوا مسائل پیدا ہوئے ہیں۔تاریخ اور جغرافیہ کے بدلنے کی جو داستان ہمارے ناولوں میں ہے وہ ہمارا اثاثہ ہے۔

اس دور کے ناولوں میں حب الوطنی کے جو عناصر بیان ہوئے ہیں ان میں اپنے گھر اور شہر سے دوری جدائی، اپنوں کی یاد، ان کی موت اور (ہمیشہ کی جدائی) نئے وطن کی محبت میں سب کچھ قربان کرنا شامل ہے۔الگ اور آزاد وطن کی خاطر، پاکستانی کہلانے کی خاطر، پاک زمین کی خاطر لوگوں نے بے دریغ قربانیوں سے گریز نہیں کیا۔قیام پاکستان کی خاطر اور پاکستانی کہلانے کے لیے برصغیر پاک و ہند کے لوگوں نے جو قربانیاں دیں ان کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔یہ ہجرت دنیا کی سب سے بڑی ہجرت ہے۔اس دور کے ادب میں ہجرت کا کرب، اور ہندو مسلم نفرت کو نہایت بہادری سے لکھا گیا ہے۔اور جن جن ناول نگاروں نے ان باتوں کا احاطہ کیا ہے وہ ہجرت کے کرب سے گزرے ہیں۔بیشتر نے اپنی آنکھوں سے قافلوں کے قافلوں کو لٹتے اور مرتے دیکھا ہے۔اسی لیے ان کے ناولوں میں ایسے عناصر ملتے ہیں ہیں جن میں حب الوطنی کے تمام رمز موجود ہیں۔

حب الوطنی کے جذبے سے سرشار لوگ دیوانہ وار اپنا سب کچھ قربان کر کے پاکستان کی جانب گامزن ہیں، انہیں یقین تھا کہ اگر اپنا سب کچھ لٹا کر اور پاکستان پر قربان کر دیں تو بھی آزادی کی نعمت اور ایک آزاد وطن کی فضا میں سانس لینے کی قیمت نہیں چکائی جا سکتی۔اس دور کے ناولوں میں جو قربانیوں اور عظیم مثالوں، ہندوؤں اور سکھوں کے مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم، انگریزوں کی ناانصافی، اور اس ناانصافی سے پھیلنے والی بے چینی، مسلمانوں کو زبردستی ہجرت پر مجبور کرنے اور پھر انہیں شہید کرنے، مسلمان ماؤں بہنوں کی عصمت دری کرنے مسلمانوں کی املاک کو نقصان پہنچانے، انہیں تباہ کرنے جیسے عناصر کا احاطہ کیا گیا ہے۔آزادی، حصول پاکستان ایک آدھ کی بات نہیں لاکھوں لوگوں کے خون کا ثمر ہے، لاکھوں بے گھروں نے اپنا گھر بار، اپنا شہر، آباؤ اجداد کی جاگیر کی قربانی، ماؤں کے بیٹوں، بوڑھوں کے سہاروں، بہنوں کے بھائیوں، سہاگنوں کے سہاگوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر پاکستان کی آزادی کو دوام بخشا ہے۔یہ ان مہاجروں کی ان گنت مشکلوں اور دکھوں کا مرہون منت ہے کہ جو ملک کی خاطر بے گھر ہوئے، بے آسرا ہوئے، لاچار و مجبور ہوئے۔مگر پاکستان کی خاطر ان کے قدموں نے لغزش نہیں کی۔

اس دور میں لکھے گئے ناولوں میں سب کی بے دریغ اور بے نظیر قربانیوں کا احاطہ کیا گیا۔ ایم اسلم، ممتاز مفتی، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، شوکت صدیقی، نسیم حجازی، کے ناولوں میں موجود حب الوطنی کے عناصر کا

احاطہ باب دوّم میں کیا گیا ہے۔ یہ دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کا ہے۔ اس دور کے ناولوں میں آزادی کی جدوجہد، آزادی سے پہلے کے حالات و واقعات، آزادی کا حصول، پاکستان پہنچنے کے لیے لوگوں کی دیوانہ وار ہجرت اور قربانیوں کا ذکر، قیام پاکستان کے بعد لوگوں کے خیالات وافکار کا نہایت مہارت، باریک بینی اور خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے سے لے کر قیام پاکستان اور اس کے بعد تک کے ناولوں میں مسلمانوں کی جدوجہد، ان کے ساتھ ان کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی ناانصافیاں (آزادی سے قبل) سب اصل میں ان کی حب الوطنی کے جذبے کی وجہ سے تھے۔ یہ سب ان کی حب الوطنی، الگ اور آزاد وطن کی محبت کے لئے جدوجہد اور قربانیاں ہیں۔ جن کا ذکر اس دور کے ناولوں میں جا بجا ملتا ہے۔

حُب الوطنی کے حوالے سے اس دور میں سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ وہ اجتماعی ہندوستان جو پہلے سب کا وطن تھا۔ اب بعض لوگوں کا وطن نہیں رہا۔ چوں کہ اب یہاں ایک نیا وطن تشکیل پا چکا تھا جس کا نام پاکستان ہے۔ اس دور میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ وطن کی حدود کا تعین دوبارہ ہوا اس لحاظ سے حُب الوطنی کے معانی بھی یکسر تبدیل ہو گئے۔ یعنی حُب الوطنی نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کے بعد ایک نیا لبادہ اوڑھ کر نئے معانی اختیار کر لیے۔

اس دور کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں حُب الوطنی اور ناول نگاری میں جو ارتقاء اور تبدیلی نظر آتی ہے اُس سے درکنار حُب الوطنی کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ہندوستان کے درمیان کھینچی جانے والی جغرافیائی تبدیلی حُب الوطنی کے روایتی مفہوم کو مفقود کر دیتی ہے۔ اب ماضی جیسی حُب الوطنی نہیں رہی کیوں کہ ہندوستانی اور پاکستانی کا اپنا وطن ہے کشمیری کا اپنا وطن الگ ہے۔

حُب الوطنی اور ناول نگاری کے لحاظ سے یہ دور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور ایک ایسا سنگ میل ہے کہ جہاں پہنچ کر سب کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔ حدود و قیود، ذہن، سوچ، یقین اور وطن کی محبت میں تغیر لہٰذا ناول نگاری کو جب ہم حُب الوطنی کے زوایے سے بغرض تحقیق دیکھتے ہیں تو یہ دور سب سے زیادہ نمایاں متغیر دُوررس اثر پذیر نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آئین ٹالبوٹ، مترجم طاہر منصور فاروقی، تخلیقات علی پلازہ، ۳ مزنگ روڈ لاہور، ص۔ ۱۶۳ تا ۱۶۴، ۲۰۰۵ء

۲۔ آئین تالبوٹ۔ ایضاً

۳۔ چودھری محمد علی مترجم بشیر احمد ارشد، ظہور پاکستان مکتبہ کارواں کچہری روڈ، لاہور، س ن ص۔ ۳۷۵

۴۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۔ ۱۵۸

۵۔ آئین ٹالبوٹ۔ ایضاً

۶۔ محمدِ ذاکر، ڈاکٹر، آزادی کے بعد ہندوستان کا ادب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء۔ ص۔ ۶۹

۷۔ آئین ٹالبوٹ، مترجم طاہر منصور فاروقی، تخلیقات، علی پلازہ، ۳ مزنگ روڈ، لاہور، ص۔ ۱۶۷، ۲۰۰۵ء

۸۔ نسیم حجازی، خاک اور خون، لاہور جہانگیر بکس ۲۰۱۶ء، ص۔ ۱۹۹

۹۔ ایضاً، ص۔ ۲۲۴

۱۰۔ ایضاً، ص۔ ۲۲۴ تا ۲۲۵

۱۱۔ ایضاً، ص۔ ۳۱۴

۱۲۔ ایضاً، ص۔ ۳۴۸

۱۳۔ ایضاً، ص۔ ۳۸۵

۱۴۔ ایضاً، ص۔ ۵۳۱

۱۵۔ ایضاً، ص۔ ۵۹۰

۱۶۔ ممتاز مفتی، علی پور کا ایلی، الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنوی سٹریٹ اردو بازار لاہور، ۱۹۶۱ء، ص۔ ۱۷

۱۷۔ ایضاً، ص۔ ۵۵

۱۸۔ ایضاً، ص۔ ۵۷۰

۱۹۔ ایضاً، ص۔ ۸۷۶

۲۰۔ ایضاً، ص۔ ۹۱۰

۲۱۔ ایضاً، ص۔ ۹۱۴

۲۲۔ ایضاً، ص۔ ۹۲۳

۲۳۔ ایم، اسلم، رقص ابلیس، القمر انٹر پرائزز، اردو بازار، لاہور، ۱۹۴۷ء، ص۔ ۲۶ تا ۲۷

۲۴۔ ایضاً،ص۔۲۹

۲۵۔ ایضاً،ص۔۲۹

۲۶۔ ایضاً،ص۔۳۳تا۳۴

۲۷۔ ایضاً،ص۔۴۵تا۴۶

۲۸۔ ایضاً،ص۔۱۰۶

۲۹۔ ایضاً،ص۔۸۷

۳۰۔ ایضاً،ص۔۹۳

۳۱۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، رکتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص۔۱۲۸تا۱۲۹

۳۲۔ ایضاً ص۔۱۶۹

۳۳۔ ایضاً ص۔۱۲۸

۳۴۔ ایضاً ص۔۱۲۸

۳۵۔ ایضاً ص۔۱۲۸

۳۶۔ ایضاً ص۔۳۴۹

۳۷۔ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز تک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۔۵۷۲

۳۸۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، فقیر حسین، ڈاکٹر، اردو ناول کا ارتقاء، بک ٹاک، سیال چیمبرز، ۳، ٹیمپل روڈ، لاہور، ص۔۱۵۶

۳۹۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص۔۱۷۸

۴۰۔ محمد عارف، پروفیسر، ڈاکٹر، اُردو ناول اور آزادی کے تصورات، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۔۱۷۸

۴۱۔ خدیجہ مستور، آنگن، سنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص۔۵۷

۴۲۔ ایضاً،ص۔۸۵

۴۳۔ ایضاً،ص۔۱۵۱

۴۴۔ ایضاً،ص۔۱۵۴

۴۵۔ ایضاً،ص۔۱۸۱تا۱۸۲

۴۶۔ ایضاً،ص۔۱۹۲

۴۷۔ ایضاً،ص۔۲۰۷

۴۸۔ ایضاً،ص۔۲۶۵

۴۹۔ ایضاً،ص۔۲۷۵

۵۰۔ ایضاً،ص۲۷۶

۵۱۔ ایضاً،ص۔۲۸۳تا۲۸۴

۵۲۔ رضیہ فصیح احمد،آبلہ پا،مقبول اکیڈمی،ادبی مارکیٹ،چوک انارکلی لاہور،۱۹۶۴ء،ص۔۱۶۴

۵۳۔ ایضاً،ص۔۱۷۲

۵۴۔ ایضاً،ص۔۱۸۳تا۱۸۴

۵۵۔ ایضاً،ص۔۲۰۶تا۲۰۷

۵۶۔ ایضاً،ص۔۴۲۳

۵۷۔ ایم اسلم،خون مسلم،دارالبلاغ،لاہور،۱۹۶۹ء،ص۔۷

۵۸۔ ایضاً،ص۔۱۱

۵۹۔ ایضاً،ص۔۲۴

۶۰۔ ایضاً،ص۔۷۶

۶۱۔ ایضاً،ص۔۱۳۲

۶۲۔ ایضاً،ص۔۱۸۱

باب سوم:
دوسرا دور (۱۹۷۱ء تا ۲۰۰۰ء) کے منتخب ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر

الف:
بیسویں صدی کے آخری عشروں کا سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامہ

بیسویں صدی میں کئی ممالک نے آزادی حاصل کی۔ بہت سی محکوم قوموں نے آزادی کا سورج دیکھا۔ چین، ہندوستان، پاکستان اور دیگر کئی قوموں نے مسلسل کوشش اور قربانیوں کے بعد آزاد اوطان حاصل کیے۔ اس صدی کے آخری عشرے میں بھی سیاسی وسماجی حالات تبدیل ہوتے رہے۔ دنیا کا گلوبل ویلیج کی شکل اختیار کرنا۔ تجارتی بلاک بنانا، وی ٹی او کا قیام، سویت یونین ریاستوں کا الگ الگ ہونا۔ روس کا بین الاقوامی میدان میں سپر پاور کے عزائم سے محروم ہونا، امریکہ کا سپر پاور بننا۔ ویت نام کی آزادی، مشرق وسطی کی جنگیں، افغان مہاجرین کی پاکستان آمد سے ایک نئی سیاسی صورت حال پیدا ہوئی۔

بیسویں صدی کے آخری عشرے سماجی لحاظ سے بھی تغیر پذیر رہے۔ حکومتیں محبوب الحق کے بنائے ہوئے فارمولے کے تحت اپنے ملک کی بہتری کے لیے کوشش کرنے لگیں اس صدی کے آخری عشرے سماجی طور پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

جنوبی ایشیا میں بیسویں صدی کے شروع سے ہی آزادی کی تحریک جوش وخروش سے چل رہی تھی بین الاقوامی سطح پر سیاسی تناؤ اپنے جوبن پر تھا پھر جلد ہی دنیا میں دو عالمی جنگیں شروع ہوگئیں بین الاقوامی طاقتوں میں سپر پاور بننے کے لیے جنگ شروع ہوگئی۔ نئے نئے اتحاد بن رہے تھے۔ نئے ممالک دنیا کے نقشے پر وجود میں آرہے تھے۔ چین، پاکستان اور دیگر کئی ممالک نے بھی آزادی حاصل کی۔

پاکستان کا دولخت ہو جانا بیسویں صدی کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ صوبہ مشرقی پاکستان دنیا کے

نقشے پر بنگلہ دیش کی صورت میں سامنے آیا۔ سویت یونین بھی چھ آزاد ممالک میں تقسیم ہوگئی۔ روس کے افغانستان میں داخلے کی وجہ سے افغان مجاہدین کی کثیر تعداد پاکستان میں آ گئی۔ امریکہ نے افغان طالبان کی مدد کی۔ جس کی وجہ سے دنیا میں طاقت کے لیے کھینچا تانی شروع ہوگئی۔ جب افغان مجاہدین پاکستان میں داخل ہوئے۔ تو ان کی وجہ سے پہلے پاکستان کی سیاسی، سماجی صورت میں جمود پیدا ہوا اور پھر اقتصادی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ امریکہ اور اقوام متحدہ نے افغان مجاہدین کی آبادکاری کے لیے امداد فراہم کی۔ اس امداد میں پاکستان پر بظاہر تو خوشحالی سامنے آئی۔ پھر حقیقتاً پاکستان کو ختم نہ ہونے والی جنگ کی دلدل میں دھکیل دیا گیا۔ معاشی منصوبہ بندی کی کمزوری اور آبادی پر بے پناہ دباؤ نے معاشی صورت حال کو مزید سنگین کر دیا مجاہدین کی ایک کثیر تعداد نے پاکستان کی معاشی اور سماجی صورت حال کو تبدیل کر دیا۔

افغان طالبان نے امریکہ کی مدد سے روس کو افغانستان سے پسپا کر دیا اور پورے ملک پر قابض ہو گئے اور پھر طالبان اور دوسرے افغان گروپوں کی درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی۔ افغانستان میں یہ جنگ جاری تھی کہ عراق نے پہلے کویت پر اور پھر ایران پر حملہ کر دیا۔ امریکہ نے کویت کی مدد کر کے عراق کو کویت سے بھگا دیا۔ عراق کو ایران سے بھی شکست ہوئی۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ نے سعودی عرب سے کئی معاہدے کر لیے۔ جس میں فوجی اڈے اور تیل کے ذخائر کی حفاظت شامل تھی۔ ویت نام میں امریکہ کو بدترین شکست کے بعد ایشیا نے دوبارہ قدم جمانے کے لیے مشرق وسطی کو راستہ دے دیا۔

امریکہ معاشی طاقت اور اثر ورسوخ کی وجہ سے دنیا کی سپر پاور بن گیا۔ تمام بین الاقوامی ادارے اقوام متحدہ اور آئی ایم ایف امریکہ کے ماتحت ہو گئے اور یہ ادارے آج بھی امریکی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں میں امریکہ کا اثر ورسوخ ایشیا میں ہو گیا۔

تجارت میں ترقی اور تمام ممالک کی عالمی منڈیوں تک پہنچ کو آسان بنانے کے لیے ایک عالمی ادارہ

۹۰ء کی دہائی میں وجود میں آیا۔ اس سے دنیا میں گلوبلائزیشن عام ہوگئی۔ جس سے دنیا کے تمام ممالک کو معاشی، سماجی اور سیاسی طور پر قریب لانے کی سعی کی گئی۔ دنیا بھر میں تجارتی بلاکس بنائے گئے۔ ان بلاکس کا مقصد دنیا کو گلوبل ویلیج بنانا تھا۔ یہ بات محسوس کی گئی کہ عالمی سطح پر پائی جانے والی بے چینی، تناؤ، بے یقینی، سماجی طور پر دوسرے ممالک سے الگ ہونا اور اختلاف کا ہونا باہمی رابطے کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر کسی مناسب پلیٹ فارم کا نہ ہونا۔ تجارتی بلاکس کی وجہ سے تمام ممالک ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور باہمی تنازعات اور اختلافات کو مل بیٹھ کر حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ دنیا بھر میں دو بڑے تجارتی اتحاد بنائے گئے جو سارک اور آسیان ہیں۔ ان دونوں بلاکس کا پاکستان بھی ممبر ہے۔ سب سے زیادہ کامیاب تجارتی اتحاد یورپی یونین ہے یہ اتحاد اگرچہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان ممالک میں سیاسی تناؤ اب بھی موجود ہے۔ ان سیاسی اختلافات کی بڑی وجہ ممالک کے درمیان موجودہ اختلافات کا عالمی عدالت میں غیر منصفانہ حل ہے نیز ترقی یافتہ ممالک کے مفادات کا زیادہ تحفظ کیا جاتا ہے اور چھوٹے اور ترقی پذیر ممالک کے مفادات کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے حقوق اور معاشی مفادات کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ عالمی ادارے چھوٹے اور ترقی پذیر ممالک کی دادرسی نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ چھوٹے ممالک کا ان عالمی اداروں پر اعتماد ختم ہو چکا ہے۔ بیسویں صدی میں مجموعی طور پر بہت سے سیاسی وسماجی تغیرات پیدا ہوئے۔ کئی جنگیں لڑی گئیں دو عالمی جنگیں بھی ہوئیں۔ جن کے نتیجے میں بے پناہ تباہی ہوئی اور بے شمار انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس صدی کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ بہت سے نئے ممالک دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئے اور کئی ممالک نے آزادی حاصل کی پاکستان، بھارت اور چین نے آزادی حاصل کی۔ اور سوویت یونین کے ٹوٹنے کی وجہ سے چھ آزاد ریاستیں بھی معرض وجود میں آئیں۔

اس صدی کے آخری عشرے میں پاکستان نے ایٹمی دھماکے کر کے ایٹمی طاقت ہونے کا اعلان کر

دیا۔ دُنیا میں نئی بحث چھڑ گئی کہ ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور افزودگی پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا گیا۔ پاکستان اسلامی دنیا کا پہلا ایٹمی ملک ہے۔ عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے ممالک نے پاکستان کے ایٹمی طاقت ہونے پر اقتصادی پابندیاں لگا دیں۔

پاکستان کے بعد ایران نے بھی جوہری ملک ہونے کا اعلان کر دیا۔ لیبیا نے بھی جوہری پروگرام پر کام شروع کر دیا۔ لیبیا کا جوہری پروگرام شروع کرنے کی عالمی طاقتوں کو بڑی تشویش ہوئی اور انہوں نے لیبیا کے ایٹمی پاور ہاؤس پر حملہ کر کے تباہ کر دیا۔ ایران کو بھی دھمکی دی گئی کہ وہ ایٹمی ہتھیار بنانے سے باز رہے ورنہ اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

اس صدی میں کچھ ایسے خطہ زمین بھی ہیں جہاں عوام گذشتہ کئی دہائیوں سے آزادی کی جدوجہد کے لیے اپنی جانیں قربانیں کر رہے ہیں اور وہ آج بھی آزادی کا سورج طلوع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان علاقوں میں کشمیر کی وادی سرفہرست ہے۔ مسئلہ کشمیر کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ۱۹۴۸ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ ان جنگوں کی ایک بڑی وجہ کشمیر اور دوسری وجہ بھارت کا پاکستان کو دل سے تسلیم نہ کرنا ہے۔

۱۹۴۸ء میں جب کشمیر میں جنگ شروع ہوئی اور بھارت نے محسوس کیا کہ مجاہدین کشمیر تمام کشمیر آزاد کرا لیں گے تو فوراً اقوامِ متحدہ میں چلا گیا اور جنگ بندی کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ وہ کشمیری عوام کی رائے لے کر کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کرے گا لیکن آج تک بھارت نے کشمیر میں استصواب رائے نہیں کرائی اور مسئلہ جوں کا توں ہے۔

۲۰ویں صدی کا ایک اور سیاسی ہنگامہ اس وقت برپا ہوا جب فلسطین میں موجود یہودی بستیوں کو ایک ملک کی حیثیت دے دی گئی۔ بیت المقدس کو مسلمانوں کے لیے تنگ کر دیا گیا۔ اور اس طرح مشرق وسطیٰ میں افراتفری پیدا کر دی گئی۔ اسرائیلی ہر روز مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں اور فلسطین جو کہ

بہت بڑا ملک تھا محض غزہ کی پٹی پر مشتمل رہ گیا ہے۔ یہ سب بین الاقوامی امن کے ٹھیکیداروں کی سرپرستی سے کیا گیا ہے آج بھی فلسطینی عوام ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں اور پوری دنیا اور عالم اسلام خاموش تماشائی ہیں۔

مجموعی طور پر ۲۰ ویں صدی معاشی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے کئی ادوار سے گزری اور کئی قومیں ترقی، خوشحالی کی جانب گامزن ہو چکی ہیں کچھ قومیں آج بھی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں اس صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کی ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ہزاروں میل دور بیٹھے لوگوں سے رابطہ ممکن ہو گیا ہے۔ نئے نئے کمپیوٹرنت نئے روبوٹس ہر طرح کے کام کرنے کے لیے مارکیٹ میں مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ اس دور میں لکھے جانے والے ناولوں پر جہاں درج بالا حالات و واقعات اثر انداز ہوئے وہاں لوگوں میں حب الوطنی کی نئی جہات نے بھی جنم لیا۔ اور لوگوں کے وطن کے ساتھ گہرے رشتے کو درج ذیل ناولوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ب:

متعین عہد میں پاکستانی اردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا عمومی جائزہ

جنت کی تلاش (۱۹۸۱ء)

اس ناول میں حب الوطنی کے عناصر درج ذیل اقتباسات میں نظر آتے ہیں ہر محبّ وطن شہری کو اپنے ملک، اپنے شہر اور اپنے گھر سے محبت فطری طور پر ہوتی ہے۔ وہ اپنے علاقوں اور شہروں کا ذکر بڑے فخر سے پیش کرتا ہے۔ رحیم گل اس اقتباس میں کچھ پاکستانی اور آزاد کشمیر کے شہروں کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''مظفر آباد، مانسہرہ کی نسبت گرم تھا۔ یہاں سے مری اور سرینگر کو سڑکیں جاتی تھیں۔ مظفر آباد شاید ہمیں اس لئے اچھا لگا کہ یہ آزاد کشمیر کا دارالحکومت تھا اور اس

سے کچھ جذباتی وابستگی تھی۔ ''(۱)

مظفر آباد میں مانسہرہ کی نسبت گرمی زیادہ تھی۔ یہاں سے مری اور سری نگر کو سڑکیں بھی جاتی تھیں۔ لیکن مجھے مظفر آباد بہت اچھا لگا شاید اس لیے کہ یہ آزاد کشمیر کا دارالخلافہ تھا۔ اور مجھے اس سے کچھ جذباتی وابستگی بھی تھی۔ مظفر آباد اور مانسہرہ کا ذکر دراصل اپنے وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ اپنے وطن کے شہروں کا ذکر دراصل اپنے وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ درج ذیل پیراگراف میں لاہور اور کراچی جیسے شہروں کی پسندیدگی کا ذکر ملتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

'' چنانچہ اگلے دن سامان باندھا اور شام تک میں لاہور پہنچ گیا.....شہروں کا خوبصورت شہر لاہور..... لاکھوں کی آبادی کا شہر مجھے سونا سونا لگا۔ میں ہمیشہ سے لاہور کو کراچی پر ترجیح دیتا رہا تھا.....مگر آج کراچی میں لاہور سے زیادہ کشش تھی۔ وہاں اس صدی کی ایسی بے چین روح رہتی تھی، جس کا درد سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔''(۲)

اس پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ لاہور اور کراچی دونوں ہی بہت خوبصورت شہر ہیں۔ بہت پر رونق ہیں آج کراچی زیادہ پرکشش نظر آ رہا ہے، تاہم دونوں شہروں کی پسندیدگی کا ذکر نظر آتا ہے۔ لاہور اور کراچی کا ذکر دراصل اپنے وطن سے محبت کا اظہار، کیوں کہ انسان جس جگہ یا ملک سے محبت کرتا ہے، اُس کا ذکر وہ کتابوں یا ناولوں میں ضرور کرتا ہے اور یہی حب الوطنی ہے۔

راجہ گدھ (۱۹۸۱ء)

راجہ گدھ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ راجہ گدھ میں اگرچہ روزق حلال اور رزقِ حرام کے انسانی زندگی میں نفسیاتی و عملی اثرات کے تھیم کو بتایا گیا ہے خود اس ملک میں اسلامی نشاط ثانیہ کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی اور یہ تاثر عام ہو رہا تھا کہ اخلاقی زوال، بے سمتی، ذات کی شکست و ریخت اور بے مقصدیت وغیرہ

اپنی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ بانو قدسیہ کا گھرانہ صوفی ازم یا روحانی اقدار کو اہمیت دیتا رہا ہے لہٰذا بانو قدسیہ نے دین اسلام کے احکامات میں رزق حرام کے بھیانک اثرات کے پہلو سے اپنا ماجرا اخذ کیا ہے جس کی بنیاد قیوم کو بنایا جو راجہ گدھ کے روپ میں سامنے آتا ہے لیکن ناول کا پورا پس منظر پاکستان ہے۔ ناول میں اس کے ہیرو قیوم کو راجہ گدھ کے مترادف قرار دیا گیا ہے اور رزق حرام کے ماحول میں دوسرے کردار سمی کو اس کی شخصیت کے دولخت ہو جانے کو اس سے جوڑ دیا گیا ہے۔ ناول میں ایک جہت مادیت پرستی کے سروکار کی بھی ہے۔ اس کے علمبرداران کے افسانہ نگار و دانش ور شوہر اشفاق احمد تھے۔ بانو کی دیگر تصانیف بھی صوفی ازم کی طرز پر ہی ہیں۔ ان کی تمام تصانیف ایک عہد بے کراں ہیں جو ہر بار ایک نئی کھوج کو سامنے لاتی ہیں اور ایک نئی سوچ کو جنم دیتی ہیں۔

ناول کے آغاز میں بانو تعارف کراتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ لوگ کہتے ہیں پوٹھوہار کا وہ علاقہ جہاں اب بیاباں اور خاکستر پہاڑ ہیں، جہاں کبھی صاف شفاف سمندر ہوا کرتا تھا اور پھر ایک قطرہ لہر در لہر بحیرہ عرب میں جا ملا اور اب ریگستان بچ گیا۔ ناول نگار رقم طراز ہیں:

> "پوٹھوہار کا وہ علاقہ جہاں دوسرے درجے کے بے آب خاکستری پہاڑ ہیں اور جن کو مقامی لوگ پبیاں پکارتے ہیں یہی علاقہ جو ہوائی جہاز کی کھڑکی سے امریکہ کے جنوبی ریگستانوں سے مشابہ نظر آتا ہے، یہ علاقہ ایک زمانے میں لہریں مارتا چاند کی طرف لپکتا، زمردیں سمندر تھا پھر کسی جوگی نے تین صدی سے اس کے کنارے بیٹھا گیان دھیان میں مصروف تھا، سمندر کو نظروں سے اوجھل ہونے کا سراپ دے دیا۔ سمندر ایسے لوٹا کہ ہر ہر لہر پالاگن کہتی بحیرہ عرب میں جا گری اور اس کے علاقے کی تہہ آب چھپی ہوئی پہاڑیاں ٹنڈ منڈ باہر نکل آئیں۔ ان پہاڑیوں کے نشیب و فراز اور کٹاؤ ایسے تھے کہ لہر در لہر سمندر کے بہاؤ کا پتہ دیتے

ہیں۔ (۳)

جس خوبصورتی سے ناول میں بانو قدسیہ نے پوٹھوہار کی کہانی بیان کی ہے وہ ان کے حب الوطن ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ وہ اسی جذبے کے تحت تاریخ کو قلم بند کر رہی ہیں۔ ان سے جڑی کہانیاں بتا رہی ہیں۔

پروفیسر سہیل قیوم سے باتیں کر رہے ہیں ان کی روح تک حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس حب الوطنی کے بارے میں بانو قدسیہ یوں رقم طراز ہیں:

> یہ لوگ ..... یہ پاکستان بنانے والے میرے ماں باپ جب ادھر آئے۔ پاک سرزمین پر.....تو یہاں آ کر ان لوگوں نے جفاکش محنتی بیویاں بیاہیں ..... نیا ملک بسانے کے لئے .....اپنے آپ کو مضبوط بنانے کے لئے ..... یہ عورتیں مردوں کو مجازی خدا سمجھتی تھیں۔ انہوں نے مردوں کا ساتھ دیا۔ غریبی دور ہوتی گئی .....جیسے روشنی قریب آتی جائے تو سایہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے.....لیکن ambitions آدمی کو یہ مار ہوتی ہے قیوم، وہ کسی جگہ جا کر حد مقرر نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کے بینک بیلنس بیرونی ممالک میں ہیں لیکن یہ مرض الحرص میں مبتلا لوگ کمائے جاتے ہیں۔'' (۴)

پروفیسر سہیل قیوم کو کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے پاکستان بنایا وہ میرے ماں باپ ہیں۔ وہ اس پاک سرزمین پر آئے تو انہوں نے جفاکشی اور محنتی بیویوں کو بیاہا، ان عورتوں نے نیا ملک بسانے اور مضبوط بنانے کے لیے خوب محنت کی اور اپنے مردوں کا ساتھ دیا۔ ان خواتین نے مردوں کو مجازی خدا سمجھا۔ یوں ان کی محنت سے غریبی دور ہوتی رہی اور خوشحالی اور کامیابی ملتی رہی مگر مردوں کی فطرت ہوتی ہے کہ کوئی حد مقرر نہیں کر سکتا کسی کامیابی کو آخری نہیں گردان سکتا ان لوگوں کی ساری دولت بیرون ملک ہے لیکن یہ حرص اور

لالچ کے مرض میں مبتلا تھے گھروں میں ان کی بیویاں ہیں مگر یہ ہوس کے مارے باہر عشق کیے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں سہیل صاحب کہتے ہیں کہ وہ ان تمام مرحلوں اور حالات سے گزرے ہیں۔ وہ اپنے ملک سے محبت سے معمور ہیں وہ اس جذبے کے تحت باتیں کیے جارہے ہیں۔

قیوم خود سے محو گفتگو ہے کہ اسے امتحان کے بعد چھٹیاں گزارنے کہاں جانا چاہیے وہ کہاں جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اپنے گاؤں چندرا نہیں جا سکتا کیوں کہ وہاں اماں نہیں ہے۔ وہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ ساندہ کلاں میں بڑے بھائی رہتے تھے مگر وہ کبھی ان کے پاس نہیں رہا۔ چندرا میں بجلی بھی نہیں تھی مگر اگر ماں زندہ ہوتی تو وہ امتحان کی تیاری کے لیے کسی نئی جگہ نہیں جانا چاہتا۔ وہ مزید کہتا ہے قصور میں ماموں کے پاس چلا جاؤں اگر چہ وہ ایک کمرہ دے دیں گے جہاں بابا بلھے شاہ کے مزار سے قوالیوں کی آواز آئے گی۔ ناول نگار کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''میں اپنے گاؤں چندرا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہاں ماں بھی نہیں تھی اور بجلی کا بھی انتظام نہیں تھا۔ ساندہ کلاں میں بڑے بھائی مختار رہتے تھے لیکن میں کبھی ان کے پاس نہیں رہا۔ اس لئے میں امتحان کی تیاری کے لئے کسی نئے ماحول میں جانے کو تیار نہ تھا چندرا میں بغیر بجلی کے تیاری ہو سکتی تھی بشرطیکہ ماں زندہ ہوتی۔''(۵)

یعنی حب الوطنی کی ایک جہت جو یہاں بیان ہوئی ہے کہ قیوم اپنی ماں اور اپنے گاؤں چندرا کو یاد کرتا ہے۔ وہ چندرا میں قیام کے لیے راضی ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہاں بجلی کا انتظام نہیں مگر ماں زندہ نہیں۔ وہ اس لیے چندرا نہیں جاتا وہ قصور اپنے ماموں کو یاد کرتا ہے۔

قیوم اپنے گاؤں چندرا کو یاد کرتا ہے اور کہتا ہے چندرا میں پرانا بھٹہ اگر چہ اب اینٹیں بنانے والے جا چکے ہیں لیکن جا بجا ٹوٹی چھوٹی اینٹوں اور پکی مٹی اور کھائیاں تھیں، برسات میں ان کھائیوں میں پانی بھر جاتا ہے انکے نزدیک مائی توبہ توبہ کی جھگی تھی جو ہر بات پر توبہ توبہ کرتی تھی۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا مگر اس

کا نام مائی توبہ توبہ مشہور ہے ایک رات قیوم نے بارش کی وجہ سے اس کی جھونپڑی میں پناہ لی۔ اس تمام منظر کو ناول نگار اس طرح بیان کرتی ہیں:

''میرے گاؤں چندرا میں ایک پرانا بھٹہ تھا۔ اینٹیں بنانے والے یہاں سے کبھی کے جا چکے تھے لیکن جا بجا ٹوٹی اینٹوں کیچھے، لال گیروے رنگ کی پکی مٹی اور گہری کھائیاں تھیں جن سے مٹی کھود کھود کر اینٹیں بنائی جاتی ہوں گی۔ برسات میں ان کھائیوں میں برساتی پانی بہہ کر اکٹھا ہو جایا کرتا۔ پرانے بھٹے کے پاس مائی توبہ توبہ کی جھگی تھی۔ پتہ نہیں کے اصل نام کیا تھا۔لیکن اب سارے گاؤں میں اسے سب مائی توبہ توبہ کہتے تھے۔ سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ وہ کالا علم جانتی ہے لیکن دو ایک بار میری موجودگی میں کسی نے اس سے استفسار کیا تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر توبہ توبہ کرنے گی۔ ایک روز میں شام گئے گھر نہ لوٹ سکا۔ باہر امرود کے باغ میں کچے پکے امرود توڑتے مجھے دیر ہوگئی۔ پتہ نہیں میرے ساتھی کیا ہوئے لیکن جس وقت میں باغ سے باہر نکلا تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پرانے بھٹے تک پہنچتے پہنچتے بارش کا یہ عالم تھا کہ مجھے لگا پانی کا ریلا مجھے زمین میں مسیخنا چاہتا ہے۔ اس روز میں نے مائی توبہ توبہ کی جھگی میں پناہ لی۔ ''(۶)

چندرا کی یاد کو مزید گہرا کرتے ہوئے ناول نگار لکھتی ہیں کہ چندرا میں ایک پرانا بھٹہ ہوا کرتا تھا مگر اب کچھ ٹوٹی اینٹیں، لال مٹی اور کھائیاں اس کی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں جبکہ اینٹیں بنانے والے یہاں سے کاروبار ختم کر چکے تھے۔ برسات کے دنوں میں یہ کھائیاں پانی سے بھر جاتی تھیں۔

ان کھائیوں کے ساتھ ہی مائی توبہ توبہ کی جھگی تھی جس کا اصل نام تو کچھ اور تھا مگر توبہ توبہ مشہور تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کالا علم جانتی تھی مگر وہ توبہ توبہ کہتی کانوں کو چھوتی رہتی۔ ایک دن قیوم اور

اس کے دوست باغ میں امرود توڑنے کی غرض سے گئے اور واپسی پر برسات نے آلیا۔ قیوم دوستوں سے الگ ہوگیا اور وہ رات وہ گھر نہ جاسکا۔ یہ رات اس نے مائی توبہ توبہ کی جھگی میں پناہ لی تھی۔ ان تمام حالات وواقعات کو نہایت باریک بینی اور تفصیل سے کھینچنے کی اصل وجہ سے ناول نگار کی حب الوطنی ہی کارفرما ہے۔

ایم۔اے کا امتحان دینے کے بعد قیوم اپنے بھائی مختار کے پاس ساندہ کلاں چلا گیا کیوں کہ اس کے پاس رہنے کے لیے اور جگہ نہ تھی۔ اس کے بھائی مختار سیکرٹریٹ میں ملازمت کرتے تھے۔ ان کا گھر دفتر سے نزدیک تھا۔ ساندہ کلاں میں مختار بھائی کے گھر سے دفتر جانے تک کے راستے میں ایک بوچڑ خانہ، گدھے، گندے نالے سے سیراب کھیت اور تعفن ملتا تھا۔

کرشن نگر سے ساندہ تک بسوں کے بعد آخری اسٹاپ کے بعد چل کر آنا پڑتا۔ بانو قدسیہ رقم طراز ہیں:

> ''ایم اے سوشیالوجی کا امتحان دینے کے بعد اپنے بڑے بھائی کے پاس ساندہ کلاں چلا گیا۔ میرے پاس جانے کے لئے اور کوئی جگہ نہ تھی۔ میرے بڑے بھائی مختار سیکرٹریٹ میں ملازم تھے اور ان کے لئے یہ رہائش گاہ دفتر سے قریب تھی۔ کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ تک ہم بسوں میں آتے اور وہاں چل کر ساندہ پہنچتے۔ راستے میں بوچڑ خانہ، گندے نالے سے سیراب کھیت، گدھے، اور تعفن ہر روز ملتا۔''(۷)

ساندہ کلاں میں مختار بھائی کا گھر دو منزلوں پر مشتمل تھا گھر کی نچلی منزل پر مختار بھائی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے ان کی بیوی ایف اے پاس تھی۔ دو بیٹے تھے۔ بیوی کا نام صولت تھا۔ گھر کی بالائی منزل کے اکلوتے کمرے میں قیوم ایک کاسنی رضائی، چند کتابیں اور تیل سے چلنے والے سٹو و لیمپ کے ہمراہ رہائش پذیر تھا۔ ساندہ کلاں کے گھر کا ذکر وطن دوستی کے زمرے میں آتا ہے۔

قیوم باغ میں منٹگمری ہال کی طرف سے داخل ہوتا ہے۔ایک چھوٹے سے ٹی اسٹال کے پاس موٹر سائیکل کھڑی کر کے سگریٹ کی ایک ڈبیا خریدتا ہے۔ پلٹ کر چیڑھ کے دراز درختوں کو دیکھتا ہے مگر جو پہاڑوں کے دیکھنے کے اتنے شوقین تھے اتنے خواہش مند تھے کہ انہیں دیکھنے کی خواہش میں وہ اتنے بلند ہو گئے۔ان الفاظ کو ناول نگار نے یوں جلا بخشی:

''میں منٹگمری ہال کی طرف سے باغ میں داخل ہوا۔چھوٹے سے ٹی سٹال کے پاس میں نے اپنی موٹر سائیکل پارک کی۔ایک ڈبیا سگریٹ خریدی پلٹ کر ان چیڑھ کے درختوں پر نظر ڈالی جو ہاڑوں کو چھوڑ کر شرمندہ شرمندہ میدانوں میں آباد تھے،لیکن جن کے دل میں ابھی تک پہاڑوں کو دیکھنے کی آرزو اتنی شدید تھی کہ وہ آسمان کی طرف بہت اوپر نکل گئے تھے۔''(۸)

قیوم لارنس باغ میں داخل ہوتا ہے سگریٹ خریدنے کے بعد وہ چیڑھ کے درختوں کی جانب نگاہ بلند کرتا ہے ایک بنچ پر بیٹھ کر وہ ان درختوں کے بارے میں سوچتا ہے جو پہاڑوں سے دور شرمندہ شرمندہ میدانوں میں آباد ہو گئے تھے مگر پہاڑوں کو دیکھنے کی آرزو اتنی شدید تھی کہ وہ آسمان کی طرف بہت اوپر نکل گئے تھے۔لارنس باغ کے درختوں کا ذکر بھی حب الوطنی ہے۔

سندھ کے طاس کے بارے میں ناول نگار یوں رقم طراز ہیں:

''سندھ کے طاس میں اس جگہ جہاں اب رانی کوٹ کا قلعہ ہے یہاں خشک تال تھے جن کی اردگرد چھدری ڈاڑھی کی طرح درختوں کا سلسلہ تھا ناریل اور پپیتے کے درخت تھے۔یوکلپٹس کے خوشبودار بلند قد ایسے درخت تھے جن میں جب سمندری ہوائیں چلتیں تو قد آدم گھاس اور ان درختوں میں چھپے ہوئے پوکھروں کی خود روئیدگی آہستہ آہستہ ہلنے لگتی اور خوشبودار ہو جاتی۔۔۔ہواؤں میں نمی اور تالابوں

کے ٹھرے پانیوں میں گنے کے باسی رس کی خوشبو تھی۔ سارے میں نیند کا تعویذ دفن
تھا مورفیا کی بھول بھلیاں تھیں۔ ایل ایس ڈی کے خواب تھے۔''(۹)

سندھ کے طاس میں اب رانی کوٹ کا بے آباد قلعہ موجود ہے وہاں خشک تاب تھے جن کے اردگرد ناریل اور پپیتے کے درخت تھے۔ یوکلپٹس کے خوشبودار بلند قد آور درخت تھے جن میں سمندری ہوا کی بدولت قد آدم گھاس اُگی ہوا میں نمی اور تالابوں کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں گنے کے رس کی باس تھی۔ سندھ طاس میں رانی پور کے قلعے اور باغات کا ذکر وطن دوستی ہے۔ اور چوں کہ یہ سب پاکستان میں ہے۔ لہذا در پردہ یہ پاکستان سے ہی محبت ہے۔

باگھ (۱۹۸۴)

باگھ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ بقول عبداللہ حسین کے باگھ کی تھیم پاکستان اور محبت ہے۔ باگھ کا مرکزی کردار ''اسد'' اس بے چین اور بے قرار روح کا سا ہے جو نڈر اور بے باک ہے۔ جبر اور غلامی کا مقابلے پر مزاحمت اور آزادی کا علم بردار بن کر ابھرتا ہے۔ اس کا وطن کشمیر ہے اور جہاں یہ اور دوسرے کردار آزادانہ طریقے سے ادھر ادھر جاتے رہتے ہیں مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ وقت کا جبر اسد پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اسد ایک وادی میں جاتا ہے جہاں کے محل وقوع کا تذکرہ وہ انتہائی خوبصورت الفاظ میں کرتا ہے وادی میں وہ ایک مکان میں داخل ہوتا ہے جس کے بارے میں ناول نگار یوں رقم طراز ہیں:

''ایک کھلا کچے صحن کے گرداگرد کمر کمر تک پتھروں سے بنی ہوئی چار دیواری تھی دراصل اس مکان کا ہی حصہ تھا گو مکان سے ملحق نہ تھا یہاں سے مکان کو جاتے ہوئے ایک مختصر سی سفید زمین پڑتی تھی۔ اس صحن میں چار درخت تھے، تین چنار کی شاخیں آپس میں ملتی تھیں اور ایک لمبا نوجوان سفیدے کا درخت جس کے پتے ہلکے

سبز رنگ کے تھے۔اس سفید کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے اسد کو یاسمین کا دمکتا ہوا چہرہ یاد آیا اور وہ رات کے انتظار میں یک لخت بیتاب ہو گیا۔ وسط مارچ کے اس چمکتے ہوئے دن کو اس بیتابی کے عالم میں اسے بہت سی باتیں یکے بعد دیگرے یاد آنے لگیں۔ وہ پنجاب کے میدانوں کا باسی اپنی سانس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پردیس میں آ بیٹھا تھا اس کا حمام دستہ اس کی ٹانگوں کے بیچ پڑا تھا اور بیچ بیچ میں وہ ہاتھ روک کر دوپہر کی دھوپ میں دور نیچے تک وادی میں دیکھ لیتا جہاں کچھ دنوں سے ایک شیر نے تباہی مچا رکھی تھی۔''(۱۰)

مکان کے گرد کمر کمر تک پتھروں سے بنی ہوئی چار دیواری سے علیحدہ کیا ہوا ہے۔صحن میں چار درخت تھے تین چنار اور ایک سفیدے کا تھا۔اسد سفیدے سے ٹیک لگا کر بیٹھتا ہے تو یاسمین کا دمکتا چہرہ اسے یاد آتا ہے تو وہ یک لخت رات کے انتظار میں بے تاب ہو گیا۔اسد پنجاب کے میدانوں کا باسی ہے وہ دوپہر کی دھوپ میں دور نیچے وادی میں دیکھتا ہے جہاں کچھ دنوں سے ایک شہر نے تباہی مچا رکھی ہے۔خوبصورت وادی اور درختوں کا ذکر بھی وطن سے محبت کا اظہار ہے۔وطن کوئی بھی ہوسکتا ہے۔

عبداللہ حسین گاؤں کا محل وقوع تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ گاؤں ایک اونچے پہاڑ پر واقع ہے۔گاؤں کے نچلے کنارے پر کھڑے ہوں تو پاؤں کے نیچے ہزار ڈیڑھ ہزار فٹ کی عمودی گہرائی تھی تفصیل کچھ یوں ہے کہ:

''گاؤں ایک مہیب پہاڑ پر واقع تھا۔ پہاڑ کی دیوار کے تقریباً وسط میں، ایک تنگ سی ہموار جھگی سے اٹھتا ہوا دوھواں دو سو گز تک چلا گیا تھا گاؤں کے نچلے کنارے پر کھڑے ہوں تو پاؤں کے نیچے ہزار ڈیڑھ ہزار فٹ کی عمودی گہرائی تھی جو کسی کھائی میں جا کر ختم ہوتی تھی۔ پلٹ کے دیکھیں تو گاؤں کے عقب میں پہاڑ کی

زمین آدھ پون میل تک اوپر آسمان کی طرف اٹھتی چلی جاتی تھی۔ مقابل کے پہاڑ
سے ایک سطح پہ دیکھیں تو پتھروں کے بنے ہوئے چوکور مکان چھوٹے چھوٹے ڈبوں
کی مانند ایک دوسرے کے اُوپر رکھے ہوئے نظر آتے تھے ذرا نیچے اُتریں تو گاؤں
نظر سے اوجھل ہو جاتا تھا، صرف درختوں کے اوپر اوپر چیڑ اور گربر کا دھواں ہوا
میں چلتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ گاؤں تقریباً چاروں طرف سے جنگل میں گھرا تھا۔'(۱۱)

گاؤں کے عقب میں پہاڑ کی زمین آدھ پون میل تک اوپر آسمان کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے مقابل کے پہاڑ سے ایک سطح پر دیکھیں تو پتھروں کے بنے ہوئے چوکور مکان چھوٹے چھوٹے ڈبوں کی مانند لگتے ہیں جو اوپر نیچے رکھے ہوتے ہیں۔ ذرا سا نیچے اترنے پر گاؤں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے صرف درختوں کے اوپر چیڑ اور گوبر کا دھواں ہوا میں چلتا دکھائی دیتا تھا۔ گاؤں چاروں طرف سے جنگل میں گھرا ہوا تھا۔ گاؤں اور اس کے گرد و نواح کا ذکر بھی وطن سے محبت کی ایک جہت ہے۔

اسد راستے پر چلتا ہوا گاؤں کی حد کے ساتھ ساتھ اوپر کو جاتا تھا تھوڑی دیر میں باہر باہر چلتا ہوا وہ گاؤں سے دور نکل گیا یہ رستہ ڈیڑھ کوس تک چڑھائی کا تھا پھر ڈھلان بن جاتا تھا اندھیرا پھیل چکا تھا اور اسد کی سانس بھولی ہوئی تھی۔

سرد ہوا اسے چھو کر گزر رہی تھی اس نے ایک موٹا کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ چڑھائی پر چڑھنے کی وجہ سے اس کا بدن گرم ہو چکا تھا مگر اچانک اس کو سینے میں گرانی محسوس ہوئی۔ عبداللہ حسین لکھتے ہیں:

''وہ اس راستے پر چل رہا تھا جو گاؤں کی حد کے ساتھ ساتھ اوپر کو جاتا تھا تھوڑی
دیر میں باہر باہر چلتا ہوا وہ گاؤں سے دور نکل گیا۔ یہ راستہ ایک ڈیڑھ کوس تک
چڑھائی کا تھا پھر ڈھلان پہ جاتا تھا اب اندھیرا ہو چکا تھا اور اس کی سانس پھول گئی

تھی۔ پہاڑ کی سرد ہوا اس کے بالوں میں سے گزر رہی تھی وہ ایک موٹا سا کوٹ نما
سویٹر پہنے ہوئے تھا جس کے بٹن کھلے تھے اس کا بدن چڑھائی پر چلنے کی وجہ سے گرم
ہو گیا تھا مگر پچھلے چند منٹ سے اس کو سینے میں گرانی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ
انگلیوں سے سینے کے بلائی حصے کو اہستہ آہستہ ملنے لگا گرانی کم نہ ہوئی۔'' (۱۲)

اسد چلتے چلتے گاؤں کی عقبی پہاڑی سے آگے نکل چکا تھا وہ راستے میں پڑے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ جہاں پر گاؤں کا ذکر آتا ہے یا گاؤں کے ماحول اور گردونواح کا ذکر آتا ہے یہ وطن سے محبت کی جہات ہیں۔ اسد کا گاؤں سے باہر نکلنا، گھومنا پھرنا بھی وطن دوستی ہے۔

اسد گاؤں کے بعد ایک گاؤں سے گزرتا ہوا چلا جا رہا تھا ایک گاؤں کے ایک مکان میں جانے کے بعد وہ اس کا جائزہ لیتا ہے اسی جائزے کو عبداللہ حسین نے ان الفاظ میں مقید کیا ہے۔

''گھر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا ایک دیوار میں مٹی کا راکھ بھرا سرد چولہا تھا۔
چولہے کے آگے نصف دائرے میں زمین پر تین بچے پڑے تھے۔ دو چھوٹے بچے
ابھی محوِ خواب تھے جب کہ نو دس سال کی ایک بچی آنکھیں کھولے چُپ لیٹی
تھی۔ ایک طرف ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی بھاری ڈنڈے کے ساتھ پتھر کی
دوری میں آہستہ آہستہ کچھ کوٹ رہی تھی۔'' (۱۳)

گھر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا ایک دیوار میں مٹی کا راکھ بھرا چولہا سرد پڑا تھا۔ زمین پر تین بچے بڑے تھے جن میں سے دو سو رہے تھے جبکہ نو دس سال کی ایک بچی چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی۔ ایک جانب ایک ادھیڑ عمر عورت ایک بھاری ڈنڈے سے پتھر کی دوری میں کچھ کوٹ رہی تھی دیوار کے ساتھ ایک کھاٹ پڑی تھی جو ٹوٹی ہوئی تھی کھاٹ پر میلے پھٹے ہوئے لحاف اور دیگر کپڑے ڈھیر کی شکل میں پڑے ہوئے تھے۔ بچی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور اسد کو دیکھنے لگتی ہے۔ گھر اور کمروں کا ذکر وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

گاؤں کے گھر مختلف انداز میں بنائے گئے تھے پرانے انداز کے گھر پتھر چن کر بنائے گئے تھے اسد تقریباً سبھی گھروں میں گیا تھا۔ ناول نگار ایک اور گھر کا یوں تذکرہ کرتے ہیں:

''کمرے کا فرش پہاڑ میں بنی ہوئی تین چوڑی چوڑی پتھریلی سیڑھیوں پر مشتمل تھا جس سے کمرے کی قدرتی حد بندی ہوگئی تھی۔ اور وہ ایک کی بجائے تین کمروں کا کام دے رہا تھا۔ ہر ایک سیڑھی چھ سات آٹھ فٹ چوڑے زینے والی اور تین فٹ کے قریب اونچی تھی۔ لمبائی کے رخ پہ سیڑھیاں اسی زینے کی شکل میں چلتیں، دیوار میں سے نکل کر باہر دور تک چلی گئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایک مقام پر بے تدبیر دیوار چن دی گئی تھی جس سے کمرہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک سیڑھی سے دوسری پر اترنے کی آسانی کے لئے بڑے بڑے مکعب پتھر رکھے ہوئے تھے چنانچہ کمرے کے اندر ایک سرے سے دوسرے تک جانے کے لئے چھلانگیں لگانے کی ضرورت نہ تھی۔''(۱۴)

اسد کشمیر کے مشن پر روانہ تھا اسی لیے وہ مختلف دیہات سے ہوتا ہوا کشمیر پہنچتا ہے یہ صرف اس کی مٹی سے محبت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر کشمیر میں اپنے مشن کے لیے جاتا ہے۔ وادی کشمیر کا خوبصورت منظر عبداللہ حسین یوں بیان کرتے ہیں:

''جبار کے گھر پہ انہوں نے شام کا وقت گزارا اور کھانے پینے سے فارغ ہوئے۔ جب اندھیرا پڑ گیا تو وہاں سے چل پڑے۔ رات اندھیری تھی اس علاقے میں اسد پہلے نہیں آیا تھا۔ لنگری سے نکل کر اس نے دیکھا کہ پہاڑ کھلنے شروع ہو گئے ہیں اور ستاروں کی روشنی دور تک جانے لگی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میدانی علاقہ جگہ جگہ نمودار ہو رہا ہے۔ اسد نے اندازہ لگایا کہ یہ علاقہ

پہاڑوں کے بیچ ایک سرسبز وادی کی شکل میں تھا جہاں مکی اور موجنی کی کاشت ہوتی ہوگی۔ درختوں کی اگاس ایک جیسی نہ تھی بلکہ جگہ جگہ گھنے جُھنڈ تھے جو غالباً اکا دُکا کاشت کاروں کے مکان تھے۔ وہ جھنڈوں اور کھیتوں سے بچتے بچاتے، پہاڑ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ اسد کبھی اس طرف ان علاقوں میں نہیں آیا تھا یہ ایک سرسبز میدانی گاؤں تھا اسد دیگر افراد کے ہمراہ پہاڑ کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔''(۱۵)

اس اقتباس میں پہاڑوں اور وادیوں کا ذکر آتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف فصلوں کا ذکر بھی ہے۔ یہ علاقہ بہت سرسبز اور خوبصورت تھا۔ یہ تمام جہات وطن سے محبت کا اظہار ہیں۔ اپنے گھر، علاقے، زمین اور درختوں کا ذکر بھی وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

جانگلوس (۱۹۸۷ء)

شوکت صدیقی کا ناول ''جانگلوس'' پہلی مرتبہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ جو بہت مقبول ہوا۔ اور پاکستان ٹیلی ویژن پر ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔ اس ناول سے وطن سے محبت کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

رحیم داد گورداس پور کا رہنے والا تھا۔ تقسیم کے وقت پاکستان آ گیا اور اپنے علاقے، اپنے وطن کی کتھا یوں بیان کرتا ہے۔

''رحیم داد رک، رک کر بولنے لگا۔ ''میں جی گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ فسادات میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر جو بیتی، وہ تو تیں نوں پتہ ہی ہوگا۔ ادھر اپنی زمینداری تھی۔ رہنے کو ماڑی تھی۔ گھر والی تھی، چار بچے تھے۔ بیٹی سب سے وڈی تھی۔ اسے بلوائی اٹھا کر لے گئے۔ اس سے چھوٹا پتر تھا۔ وہ میرے سامنے مارا

گیا۔ میں بلوائیوں سے بچ بچا کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گیا۔'' (۱۶)

رحیم داد کہتا ہے کہ وہ گورداس پور کا مہاجر ہے۔ وہاں پر میری زمینیں تھیں، گھر تھا۔ بیوی اور چار بچے تھے۔ بیٹی کو بلوائی اٹھا کر لے گئے۔ اور میں کسی نہ کسی طرح جان بچا کر پاکستان پہنچا ہوں۔ رحیم داد کا اپنے وطن اور بیوی بچوں کو یاد کرنا دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ہر انسان کو جہاں اپنے ملک شہر اور مکان سے محبت ہوتی ہے وہاں اپنے بچوں اور بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ اس طرح کی صورت حال شوکت صدیقی نے یوں بیان کی ہے:

''وہ کہاں رہتا ہے؟'' جمیلہ نے پوچھا۔

آج کل وہ اوکاڑے میں ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں بہاول نگر گیا تھا۔ واپسی پر دیپال پور جا رہا تھا۔ اس سے پتہ چلا میری گھر والی اور بچے تخت محل کے نزدیک ایک پنڈ میں ہیں۔ جب سے یہ سنا ہے، دل چاہتا ہے چھیتی نال وہاں پہنچ جاؤں۔'' (۱۷)

درج بالا اقتباس میں پاکستان کے تین شہروں کا ذکر آتا ہے۔ یعنی اوکاڑہ، بھاول نگر اور دیپالپور شہروں کا ذکر کرنا بھی وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ اس کے علاوہ بیوی، بچوں کا ذکر کرنا کہ گم شدہ بیوی بچوں کا پتہ چل جانا بھی محبت کا اظہار ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے پاکستان بن جانا بہت بڑا معجزہ تھا کیونکہ پاکستان ہزاروں قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا تھا۔ اور جب پاکستان بن گیا تو مسلمان بہت خوش تھے۔ قیام پاکستان کے وقت صورت حال کو شوکت صدیقی نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

''تو نے ٹھیک ہی سنا چوہدری۔'' نادر خاں نے جواب دیا۔ ''میں نوں اب تک وہ بھیانک رات یاد ہے۔'' اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔ ''میں بھولا نہیں۔ ایک ایک بات یاد ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ مسجد میں دن رات کلام پاک

کی تلاوت ہوتی، وعظ ہوتا۔ دعائیں مانگی جاتیں۔ ۱۴ اگست کو جب پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو ہم دونوں بھائی مسجد غزنویہ ہی میں تھے۔ رمضان کی ۲۷ تاریخ تھی۔ نہ پوچھ کیسی خوشی منائی گئی۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے۔ گرم جوشی سے گلے ملتے تھے۔'' (۱۸)

جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی تو اُس وقت نہ صرف عملی جدوجہد جاری تھی بل کہ مساجد میں باقاعدہ تلاوت کلام پاک کر کے دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ یا اللہ پاکستان بنا دے اور جب پاکستان بنا تو رمضان کی ستائیسویں تاریخ تھی۔ ہم بہت خوش ہوئے اور ایک دوسرے کو مبارکبادیں دیں۔ قیام پاکستان کے لیے دعائیں مانگنا اور ایک دوسرے کو مبارکبادیں بھی حب الوطنی ہے۔

ہر انسان اپنے موجودہ اور سابقہ علاقوں کو کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ ہجرت کے بعد اپنے آبائی علاقوں کو یاد کرتا ہے۔ اور پھر موجودہ علاقوں سے بھی محبت کرتا ہے۔ شوکت صدیقی لکھتے ہیں:

''رحیم داد نے مداخلت کی۔'' ویسے تو میں گورداس پور کا مہاجر ہوں اب میری زمیں داری نیلی بار ہی میں ہے۔ تیں نوں پتہ ہے ستلج کو پاک پتن میں نیلی کہتے ہیں اور اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں اس کا پانی نیلا نیلا دکھائی پڑتا ہے۔ پر دیپال پور میں ہے۔ اسے ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ میرا پنڈ ہے تو تحصیل دیپال پور میں اور دیپال پور بیاس بار میں ہے۔ میرا پنڈ دیپال پور سے دور اور اس علاقے سے بالکل ملتا ہے جو پاک پتن تحصیل کہلاتا ہے۔ پاک پتن تحصیل نیلی بار ہی میں ہے۔'''' وے تیرا پنڈ نیلی بار میں ہے۔'' شاداں نے کسی قدر حیرت سے کہا۔'' (۱۹)

رحیم داد کہتا ہے کہ وہ ہے تو گودار سپور کا مہاجر ہے لیکن اب تحصیل دیپالپور میں رہتا ہے۔ دیپالپور میں میرا گاؤں ہے اور زمینیں ہیں۔ اور میرا گھر بھی اُدھر ہی ہے۔ یہاں پر رحیم داد کی محبت دو حصوں میں

منقسم نظر آتی ہے۔یعنی گوداسپور اور دیپالپور سے۔دونوں جہتیں اپنے علاقے اور وطن سے جڑی نظر آتی ہیں۔

انسان کو حصول معاش کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔کبھی ادھر،کبھی ادھر۔لیکن وہ اپنا آبائی علاقہ یا وطن کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ایسی ہی صورت حال شوکت صدیقی نے اس طرح بیان کی ہے۔

''ویسے تو جی میں شیخوپورہ کا رہنے والا ہوں،لیکن جب فسادات کی آگ بھڑکی تو میں ملازمت کے سلسلے میں کرنال میں تھا۔گھر والے بھی ساتھ تھے۔' جلیل نے سنبھل سنبھل کر بتایا۔''ماں تھی،چھوٹا بھائی تھا،دو جوان بہنیں تھیں۔میرا پیئو پہلے ہی مر چکا تھا۔'' اس نے گہری سانس بھری۔''ستمبر ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا۔مجھے اب تک یاد ہے۔سکھوں اور ہندوؤں کے حملوں سے تنگ آ کر میں گھر والوں کے ساتھ بچ بچا کر حصار پہنچ گیا۔وہاں بھی حالات خراب تھے اور روز بروز بگڑتے ہی جا رہے تھے۔حملے ہوتے،آگ لگائی جاتی۔خون خرابہ ہوتا۔آخر کسی نہ کسی طرح میں ریلیف کیمپ پہنچ گیا۔گھر سے نکلتے ہی بلوائیوں نے اس میں آگ لگا دی۔میں نے دور سے اپنے گھر کے شعلوں میں جلتے ہوئے دیکھا۔کیا بتاؤں وہ کتنی بھیانک رات تھی۔'' (۲۰)

وہ شیخوپورہ کا رہنے والا ہے۔یعنی آبائی علاقہ شیخوپورہ ہے لیکن ملازمت کے سلسلے میں کرنال میں مقیم تھا۔گھر والے بھی ساتھ تھے۔تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا تو ہر طرف فسادات شروع ہو گئے۔اور میں اپنے بچوں کو لے کر ریلیف کیمپ میں پہنچ گیا۔میرا گھر بلوائیوں نے جلا دیا تھا۔

مندرجہ بالا پیراگراف میں بھی دو شہروں شیخوپورہ اور کرنال کا ذکر ملتا ہے۔اور تقسیم کے وقت کے فسادات کا بھی ذکر ملتا ہے۔شہروں اور فسادات کا ذکر وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ج:

متعین عہد میں پاکستانی اردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا خصوصی جائزہ

تنہا (۱۹۷۸)

سلمیٰ کا ناول 'تنہا' سانحہ مشرقی کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔اس کی پہلی اشاعت ۱۹۷۸ء میں اردو ڈائجسٹ لاہور کے زیر اہتمام ہوئی۔ یہ ناول چھپنے کے بعد بہت مقبول ہوا اور مزید اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔آج ہر پاکستانی سانحہ مشرقی پاکستان پر خون کے آنسو بہاتا ہے اس ناول میں سانحہ مشرقی پاکستان کے واقعات اور محرکات بیان کیے گئے ہیں۔سقوطِ ڈھاکہ کے یہ واقعات اور محرکات سامنے لانا دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ڈھاکہ کلب میں آرمی کے لوگ کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ چاق و چوبند بیرے سروس چینے میں مصروف ہیں۔میری ایک واقف کار بنگالی فیملی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک لمبا تڑنگا نوجوان مسز خان سے باتیں کرتا ہوا مجھ سے مخاطب ہو جاتا ہے۔اس کی گفتگو کا حال سلمیٰ اعوان نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔(۲۱)

''لاہور خوب صورت جگہ ہے میں وہاں گیا تھا۔''

''اچھا''۔میں کہتی ہوں۔

''میں نے واہگہ سیکٹر میں شہداء کی یادگاریں بھی دیکھی ہیں۔'' میں نے پھر مختصراً

''اچھا'' کہا ہے۔

بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں کا یہ پیغام پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کہ

''عزیز ہم وطنو! جب آپ پاکستان کے مختلف علاقوں میں جائیں تو ہمارے بارے میں یہ بتانا نہ بھولیں کہ ہم نے اپنا آپ کے کل کے لیے قربان کر دیا ہے۔''(۲۲)

پاکستانی فون کا ڈھاکہ کلب ریس کورس روڈ پر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ واقع ہے۔ یہاں پر مختلف

فیمیلیز کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔اور گپ شب کے ساتھ کھا پی بھی رہے ہیں۔ایک بنگالی فیملی ناول نگار کی واقف کار ہے۔وہاں ایک لمبا تڑنگا نوجوان مسز خان سے باتیں کرتے ہوئے ناول نگار سے مخاطب ہو جاتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ لاہور بہت خوب صورت شہر ہے۔ میں نے واہگہ بارڈر پر ۱۹۶۵ء کے شہداء کی یادگاریں بھی دیکھی ہیں۔ بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں کا یہ پیغام پڑھ کر آبدیدہ ہو گیا تھا کہ میرے پیارے ہم وطنو! آپ پاکستان کے لوگوں کو بتانا کہ ہم نے اپنا آج آپ کیکل کے لیے قربان کر دیا ہے۔ڈھاکہ کلب میں لاہور شہر کا ذکر اور ۱۹۶۵ء کے شہداء کی یاد گاروں کا ذکر بھی حب الوطنی کے ذمرے میں آتا ہے۔

ابھی سانحہ مشرقی پاکستان رونما نہیں ہوا۔حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہڑتالیں، جلسے جلوس روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔عوامی لیگ کے طلباء محبِّ وطن طلبہ پر تشدد کر رہے ہیں۔انہیں حکومتی سرپرستی حاصل ہے۔وہ بڑی دیدہ دلیری سے علیحدگی کی تحریک چلا رہے ہیں۔جب کہ محبّ وطن جماعتیں اور طلباء تنظیمیں ان کیخلاف سینہ سپر ہیں۔عوامی لیگ کے مقابلے میں جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم اسلامی چھاترو شنگھر اُن کا مقابلہ کر رہی ہے۔اس تنظیم کا لیڈر ان غنڈوں کے ہاتھ آجاتا ہے اور اسے شہید کر دیا جاتا ہے۔سلمٰی اعوان عبدالمالک کی شہادت کے حوالے سے یوں رقم طراز ہے۔

> ''کوریڈور کے آخری کونے میں کھڑی میں زار زار روتی ہوں۔شدت گریہ سے میری آنکھیں جلنے لگی ہیں۔عبدالمالک زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا ہے۔عبدالمالک جو میرا رشتہ دار نہیں، میرا عزیز نہیں، جس سے میں ابھی تک ملی بھی نہیں۔ پر وہ میری متاع تھی۔ میری قوم کی گراں قدر متاع کہ وہ دشمنان دین و وطن عناصر کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بنا ہوا تھا۔اس دیوار کو ئی۔ایس۔سی سینٹر میں عوامی لیگی غنڈوں نے توڑ ڈالا تھا۔
>
> حُب الوطنی کے چند دیوں میں سے ایک بجھ گیا ہے۔اندھیرے بڑھ رہے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کس کس کو نگلیں گے؟''(۲۳)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک کے دوران بڑی دو جماعتوں کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہے۔عوامی لیگ اور جماعت اسلامی،عوامی لیگ بنگلہ دیش کا نعرہ لگا رہی ہے جب کہ جماعت اسلامی متحدہ پاکستان کی حامی ہے۔ناول نگار کو جب عبدالمالک کی شہادت کا پتا چلتا ہے۔تو وہ زاروقطار رونا شروع کر دیتی ہے۔حالانکہ وہ ان کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا۔عبدالمالک دشمنان دین و وطن کے خلاف بہت مضبوط فولادی دیوار بنا ہوا تھا۔ جسے عوامی لیگ کے غنڈوں نے ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیا تھا۔حب الوطنی کا ایک اور دیا بُجھ گیا ہے۔عبدالمالک کا شہادت وطن سے محبت کا بہت بڑا کردار ہے۔

یہ واقعہ ناول نگار نے قیام پاکستان سے پہلے کا تحریر کیا ہے۔مسلمانوں اور ہندوؤں میں قیام پاکستان کے بارے میں بحث ہو رہی ہے۔ایک مسلمان ہندو سے مخاطب ہے۔سلمٰی اعوان اس گفتگو کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں۔

''سور کہتا ہے پاکستان نہیں بنے گا۔کہو نا ایک بار پھر۔نہ میں تیرا جبڑا توڑ دوں تو میرا نام بھی شلپی نہیں۔''

یہاں تاڑ کے درختوں کے پاس کھڑا وہ قہر بھری نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔جس کی ٹھوڑی پر ابھی ابھی اس نے ایک زوردار مُکا رسید کیا تھا۔وہ قد کاٹھ میں اس سے خاصا لمبا تھا اور کاہی رنگی چار کانہ دھوتی کو ہندوانہ سٹائل سے باندھے ہوئے تھے۔اس نے اپنے جبڑے کو سہلایا اور اپنے نوکا کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''اب تم اپنی خیر منانا۔''

''جاؤ جاؤ سیار (گیدڑ) کہیں کے،دھمکیاں دیتا ہے۔پور بو بنگار سے تمہاری قوم کو جوتے مار مار کر نکالیں گے۔ہمار خون پی پی کر گیا ہوگئی ہے۔''یہ اس نے زہر بھرے لہجے میں کہا تھا جو شلپی تھا۔''(۲۴)

تحریکِ پاکستان کے دوران ہندو پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ وہ نہیں مانتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے الگ ریاست بنے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان روزانہ بحث ومباحثے ہوتے رہتے اور فسادات بھی ہوتے رہتے۔ایک بحث کا ذکر ناول نگار نے کیا ہے کہ ایک جذباتی اور محبّ وطن مسلمان ایک ہندو سے کہتا ہے کہ سور کہتا ہے پاکستان نہیں بنے گا۔ایک بار پھر کہو میں تیرا جبڑا توڑ دوں گا۔ ہندو شیلپی کو قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔ ہندو بہت لمبے قد کا تھا اور ہندوانہ دھوتی پہنے ہوئے تھا۔اس نے شیلپی کو دھمکی دی کہ اب تم اپنی خیر منانا۔شیلپی نے جواب دیا جاؤ گیدڑ کہیں کے پور بو بنگال سے تمھاری قوم کو جوتے مار کر نکال دیں گے۔حب الوطنی قیام پاکستان سے پہلے بھی مسلمانوں میں پیدا ہو چکی تھی۔شیلپی کا ہندو کا للکارنا حب الوطنی ہے۔

تحریکِ پاکستان پورے ہندوستان میں اپنے جوبن پر تھی۔ ہندو اس نئی مملکت کے خلاف تھے۔ وہ انگریزوں سے نجات کے بعد اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھ رہے تھے۔لیکن مسلمان اپنے الگ وطن کے مطالبے پر ڈٹے ہوئے تھے۔فسادات بھی شروع ہو گئے تھے۔سلمیں اعوان نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''اور پھر یوں ہوا کہ بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے والے اور نہ کرنے والے ایک دوسرے پر پل پڑے۔کوئی بیس منٹ وہ گتھم گتھا رہے۔ جب دھان کے کھیتوں میں سے واپس آتے دو صلح پسند آدمی وہاں آئے۔ان کی مساعی سے وہ الگ تو ہو گئے پر ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ان کے کمزور کمزور بازو تنے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔
>
> اور جب مخالف پارٹی کے لڑکوں کو انھوں نے جاتے دیکھا تو وہ اونچے اونچے چلائے۔
>
> ''آمار نیتا قائداعظم قائداعظم جندہ باد لے کے رہیں گے پاکستان۔ پاکستان جندہ باد۔''(۲۵)

اس واقعہ میں سلمیٰ اعوان نے بتایا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ کرنے والے اور قیام پاکستان کے مخالفین کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی۔ وہ تقریباً بیس منٹ تک ایک دوسرے کو مارتے رہے۔ دھان کے کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں نیانھیں چھڑایا۔ اُن کسانوں کی کوششوں سے وہ الگ الگ تو ہوگئے لیکن اُن کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور جب مسلمان لڑکوں نے ہندو لڑکوں کو بھاگتے دیکھا تو انھوں نے اونچی آواز میں نعرے لگانے شروع کر رہے۔ آمارنیتا قائداعظم، قائداعظم جندہ باد لے کے رہیں گے پاکستان، پاکستان جندہ باد۔ مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ لڑنا اور قائداعظم زندہ باد اور پاکستان زندہ باد دو نئے بننے والے وطن سے محبت کا ثبوت ہے۔ اور یہی محبّ الوطنی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران مسلمان اور ہندو اپنا اپنا مؤقف بیان کرنے کے لیے جلسے جلوس منعقد کر رہے تھے۔ ناول نگار سلمیٰ اعوان نے شہید سہروردی جو کہ تحریک پاکستان کا سرکردہ رہنما تھا کے جلسے کا ذکر کیا ہے۔ جہاں پر انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جہاں پر سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ وہ غریب لوگ تھے۔ پھٹے ہوئے کپڑے اور دھوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ اور اکثریت کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ لیکن سب کے سب دلوں میں ایک جذبہ حب الوطنی تھا کہ ہم نے اپنا الگ وطن بنانا ہے اس جلسے کی روداد سلمیٰ اعوان نے کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

''تب اس نے بے اختیار سوچا۔'' یہ سب اسے دیکھنے، اسے ملنے اور سننے آئے ہیں۔ اس بارانی موسم میں اپنا وقت ضائع کر کے۔۔۔ کیوں کہ یہ ہمارے لیے ہندوؤں اور انگریزوں سے لڑ رہا ہے۔ ایک ایسے ملک کے لیے جہاں ہم مسلمان آزادی سے رہ سکیں گے۔''

''ہم پاکستان چاہتے ہیں۔ پاکستان جو ہمارا دیش ہوگا۔''

تب اس نے اتھاہ جذبے سے اپنی دلی آواز کو اس نعرے میں شامل کیا جو'' پاکستان ہوبے پاکستان ہوگے۔'' کی صدا بلند کر رہا تھا۔ شام ڈھلے جب گھر آتے ہوئے دادو حیدر علی سے باتیں کر رہے تھے، تب حیدر علی نے پوچھا تھا کہ یہ عجیب بات نہیں چالیس سال قبل

جس بنگال کی تقسیم کا ہندو شدت سے مخالف تھا، آج وہ خود اسے تقسیم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔''(۲۶)

شہید سہروردی نے جب یہ سوچا کہ یہ سب لوگ مجھے دیکھنے اور سننے آئے ہیں۔ یہ لوگ اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے ایک مقصد کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ ہم اپنا الگ وطن پاکستان چاہتے ہیں۔ پاکستان ہمارا الگ وطن ہوگا۔ جہاں پر ہم اپنی زندگیاں اپنے مذہب اسلام کے مطابق گزار سکیں گے۔ اسلام کا بول بالا ہوگا۔ انصاف ہوگا۔ ہر شخص کو علاج معالجے اور روزگار کی بہترین سہولیات میسر ہوں گی۔ یہ ایک خواب تھا۔ نئے بننے والے ملک کا ہندوؤں اور انگریزوں کے تسلط سے آزادی حاصل ہوگی۔ ہمارا اپنا ملک ہوگا۔ یہ سارے حالات دیکھ کر سہروردی نے فرط جذبات سے بھرپور نعرہ لگایا۔''ہوبے پاکستان ہوبے''یعنی پاکستان بنے گا۔ مسلمانوں کا آزادی کے لیے تحریک چلانا اور اپنے قائدین کے جلسوں میں جانا بھی دراصل نئے بننے والے ملک سے محبت کا اظہار ہے۔ اگرچہ اُس وقت ملک نہیں بنا تھا۔ الگ وطن کا خواب تھا۔ تاہم یہ خواب بھی حب الوطنی کا عنصر ہے۔ ہندوؤں کی عجیب منطق ہے کہ چالیس سال ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا مخالف تھا اور وہ خود بنگال کے بٹوارے کی بات کر رہا ہے۔

حیدر علی قیام پاکستان کے بارے میں اپنی دادو سے بحث کر رہا ہے کہ چالیس سال قبل بنگال کی تقسیم کا مخالف آج حمایت کر رہا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں مشرقی بنگال اور آسام کے صوبے کے قیام کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کی مالی حالت بہتر بنائی جائے۔ تاہم یہ ساری باتیں حیدر علی کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اب وہ اپنی دادو سے ایک اور سوال کرتا ہے۔ سلمیں اعوان یوں رقم طراز ہیں۔

''دادو مجھے ایک بات بتائیں پہلے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ پاکستان بن جانے سے ہمارے یہ دکھ درد دور ہو جائیں گے؟''

''بیٹو! یہ دکھ درد تو جیون بھر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پر یہ کتنی خوشی کی بات ہوگی کہ ہمارا اپنا ایک اسلامی دیش ہوگا جہاں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ کسی کا استحصال نہیں ہوگا۔

انصاف کے حصول کے لیے کوئی وقت نہ ہوگی۔''

''پردادو! جب پاکستان بن جائے گا تو بیماروں کو ہسپتال میں داخلہ ملے گا نا۔ ان کا علاج توجہ سے تو ہوگا نا۔ یہ عبدل چاچا جیسے لوگ اتنے مجبور تو نہ ہوں گے تب؟''

''مجھے امید ہے یہ مسائل فوری توجہ پائیں گے۔'' دادو نے اس کی پشت پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا۔''(۲۷)

دادو مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ قیام پاکستان سے ہمارے دُکھ درد دور ہو جائیں گے۔ دادو نے کہا بیٹو! دکھ درد تو ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن سب سے زیادہ خوشی کی یہ بات ہوگی کہ ہم ہمارا الگ اسلامی ملک ہوگا۔ جہاں پر سب لوگ امن اور آتشی سے رہیں گے۔ کوئی ظالم، جابر کسی دوسرے شخص پر ظلم اور زیادتی نہیں کر سکے گا۔ اور مظلوم کو سستا اور بآسانی انصاف میسر ہوگا۔ حیدر علی یہاں پر ایک اور سوال کرتا ہے کہ دادو پاکستان بن جانے کے بعد بیمار لوگوں کو ہسپتالوں میں داخل کیا جائے گا۔ اور کیا ان کا علاج مفت اور توجہ سے ہوگا۔ کیا غریب لوگ عبدال چاچا جیسے مجبور تو نہیں ہوں گے۔ دادو جواب دیتی ہیکہ بیٹا مطمئن رہو۔ انشاءاللہ پاکستان بن جانے کے بعد ہمارے یہ تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہ مندرجہ بالا بحث ایک دادو اور پوتے کے درمیان ہو رہی ہے۔ پوتا چھوٹی عمر کا ہے لیکن کچھ تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ مسلمان نئے بنے والے ملک پاکستان کے بارے میں بڑے مطمئن ہیں۔ اور یہ سوچ بھی دراصل حب الوطنی ہے۔ نئے بننے والے ملک کے بارے میں محبت اور مثبت جذبات رکھنا بھی حب الوطنی ہی ہے۔

ناول کے اس حصے میں ایک گھر میں ہونے والی گفتگو کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سومی آپا فخر کے درمیان مشرقی اور مغربی پاکستان کے اختلاف کے بارے میں بحث ہو رہی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی۔ آپا کا مؤقف ہے کہ غلط فہمیاں نفرت کو جنم دیتی ہیں۔ اور حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ فخر بہت غصے میں آ کر کچھ کہتا ہے۔ سلمٰی اعوان فخر کی گفتگو اس طرح بیان کرتی ہیں۔

''''ارے سومی آپا! بائیس (۲۲) سالوں نے ہمیں کیا دیا؟ اقتصادی بدحالی۔ اب ذرا دیکھیے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک ہماری پٹ سن نے پاکستان کو ستر فیصد زرمبادلہ دیا لیکن ہمارے صوبے پر ترقیاتی خرچ صرف پندرہ تا بیس فیصد تھا۔ انڈسٹری اور کارخانے لگانے کی حوصلہ افزائی صرف ویسٹ پاکستان میں ہوئی۔ پوربو پاکستان حکمران کی ترجیح نہیں تھا۔ پاکستان سے پہلے کلکتہ کی منڈی تھے اب ویسٹ پاکستان کی ہیں۔

ہماری سیاسی محرومیاں دیکھ لیں۔ اوّل تو صحیح معنوں میں نمائندگی ہیں نہیں ملی، اگر شومئی قسمت ہمارے لیڈر برسر اقتدار آ ہی گئے تو ان کے ساتھ کیا ہوا؟ خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرہ، پاکستان کا زیرک ترین اور مدبر سیاستدان شہید سہروردی جس سے نہرو بھی خائف تھا۔ بیروت میں زہریلی گیس سے مروادیا گیا کیوں کہ وہ وطن واپس آ کر ایوب خان کے خلاف تحریک چلانے والے تھے۔ آپ کے حکمران ٹولے، فوج اور نوکر شاہی نے پاکستان کے سینئر ترین جنرل آئی مجید کو عراق کے شاہ فیصل ثانی کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث کر کے کمانڈر ان چیف کے حق سے محروم کر دیا کیوں کہ وہ نگالی تھا اور اس ایوب خان سے کوئی پوچھتا کہ اس نے مولوی تمیز الدین کے ہوتے ہوئے اقتدار یحییٰ کان کو کیوں سونپا؟ یحییٰ خان کی شہرت آپ اپنے چچاؤں سے پوچھ سکتی ہیں۔'' (۲۸)

فخر آپا سے بڑے جذبات میں کہتا ہے کہ ارے سومی آپا کہ ہمیں بائیس سالوں میں کیا ملا ہے؟ اقتصادی بد حالی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک مشرقی پاکستان کی پٹ سن سے ستر فیصد زرمبادلہ حاصل ہوا لیکن اس ستر فیصد سے مشرقی پاکستان پر صرف پندرہ فیصد رقم خرچ ہوئی باقی رقم مغربی پاکستان کی ترقی لگائے گئے۔ کیا صوبہ مشرقی پاکستان حکمرانوں کی ترجیح میں نہیں تھا؟ ہمیں ہمیشہ سیاسی طور پر محروم رکھا گیا۔ پہلے تو ہمیں صحیح نمائندگی ملی ہی نہیں ہے۔ اگر کبھی قسمت کی دیوی ہم پر مہربان ہو بھی گئی تو ہمارے لیڈروں کے ساتھ کیا ہوا۔ ہمارے مدبر سیاستدان شہید

سہروردی کو بیروت میں زہریلی گیس سے قتل کرادیا گیا۔ کیوں کہ وہ پاکستان واپس آ کر ایوب خان کی آمرانہ حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جنرل آئی مجید کو صرف بنگالی ہونے کی وجہ سے عراق کے شاہ فیصل ثانی کے قتل میں ملوث کر کے کمانڈر انچیف کے حق سے محروم کروادیا گیا۔ سلمٰی اعوان نے اس گفتگو میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے قبل کے حالات بیان کیے ہیں۔ جو کہ جذبہ حب الوطنی میں آتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک چل رہی تھی۔ فسادات عام تھے اور قتل عام بھی ہو رہا تھا۔ ناول نگار نے دیکھا کہ کچھ لڑکے ہاتھوں میں چاقو اُٹھائے میس میں داخل ہو گئے۔ ایک لڑکے کو چاقو لگا اور خون نکلنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ لڑکے کے پاس آ گئے تو میں کیا کروں گی۔ یہ سوچ کر وہ کمرے میں ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس حوالے سے سلمٰی اعوان لکھتی ہے۔

> ''وہ کمرے میں رکھے کولر کی آڑ میں ہو گئی اس کی آنکھیں پھٹیں جب اس نے اس معصوم اور کمر عمر لڑکے کو چار لڑکوں کے نرغے میں دیکھا۔ اس لڑکے کو جسے اس نے ایک شام برٹش کونسل کی لائبریری میں پڑھتے دیکھا اور اس کی معصوم صورت سے متاثر ہو کر پوچھا تھا کہ وہ کس کلاس میں ہے؟ اس نے شائستگی سے اسے بتایا کہ وہ آئی۔ ایس۔ سی کے سال دوم میں ہے۔ ''تو گویا تم انجینئر بنو گے۔'' وہ مسکرائی۔
>
> ہرگز نہیں! میں پاکستان آرمی جوائن کروں گا۔ میں عزیز بھٹی بننا چاہتا ہوں۔ یہ باعزم آواز تھی۔''(۲۹)

یہ وہ حالات تھے جب مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک زوروں پر تھی۔ عوامی لیگ کے غنڈے سرعام بدمعاشی کر رہے تھے اور وہ جب اور جہاں چاہتے اسلحہ اور چاقو لے کر پہنچ جاتے اور ماحول کو دہشت زدہ کر دیتے۔ یہ لوگ یونیورسٹی کے میس میں چاقو لے کر آ گئے تھے۔ لڑکیاں بھاگ کر باہر نکل گئیں انھوں نے ایک لڑکے کو چاقو سے زخمی کر دیا۔ ناول نگار چوں کہ خود بھی میس میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت خوف زدہ ہو گئی اور سوچنے لگی کہ اگر خدانخواستہ کسی

چاقو والے لڑکے نے میری طرف رُخ کرلیا تو میں ناحق مرجاؤں گی۔ یہ سوچ کر وہ کمرے میں پڑے ہوئے کولر کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک کم عمر لڑکے کو چار لڑکوں نے گھیرا ہوا ہے۔ اس لڑکے کو اس نے ایک شام برٹش کونسل میں پڑھتے دیکھا تھا۔ اور اس کی معصوم صورت سے اس نے متاثر ہوکر پوچھا تھا کہ وہ کسی جماعت کی پڑھائی کررہا ہے۔ تو اس نے جواب دیا تھا کہ وہ آئی۔ ایس۔ سی کے دوسرے سال میں ہے۔ تو کیا تم انجینئر بنو گے۔ تو اس نے جواب دیا تھا کہ نہیں۔ وہ پاکستانی فوج میں بھرتی ہوگا۔ اور عزیز بھٹی بننا چاہتا ہے۔ اس اقتباس میں ناول نگار کا عوامی لیگ کے لڑکوں کا محبِّ وطن لڑکوں پر تشدد کے بارے میں بتانا اور لڑکے کا پاکستانی فوج میں بھرتی ہونے کا عزم جذبہ حب الوطنی ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں حالات حاضرہ پر بحث ہورہی تھی۔ کچھ لوگ علیحدگی کی باتیں کررہے تھے۔ جب کہ محبّ وطن لوگ پاکستان کو متحد رکھنے کی باتیں کررہے تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں اور بحث کر رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک بحث کا نقشہ سلمیٰ اعوان نے کچھ اس طرح کھینچا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''حبیب اللہ وہیں لڑکیوں کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ تلخی سے بولا۔ ''خدا بچائے تم لڑکیوں کے سیکنڈلز سے بلاوجہ ہی طوفان کھڑے کردیتی ہو۔ ہمیں مغربی پاکستان سے نفرت ہے، درست ہے۔ ہم اس سے اپنا دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے پر اب اس کا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ اس لڑکی سے جو وہاں سے آئی ہوئی ہے، انسانیت سوز برتاؤ کیا جائے۔ وہ شلپی کے خاندان کی ذمہ داری ہے۔ اس نے اگر اسے لفٹ دی یا وہ اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تو یہ اس کا فرض تھا۔

اور ہولی کراس کونٹ کی فارغ التحصیل اس لڑکی نے یہ ساری تابیں سنیں اور خود سے بولی۔ ''یہ کیا بکواس کرتا ہے۔ علیحدگی چاہیے انھیں مغربی پاکستان سے۔ کیوں؟ کھانے کو ملنا شروع ہوگیا ہے۔ اس لیے۔''

وہ کھڑی ہوگئی، اس نے اپنا رخ، اس لڑکے کی طرف کیا اور اونچی آواز میں پوچھا
کہ کیا تم یہ واضح کروگے کہ تم مغربی پاکستان سے کیوں علیحدہ ہونا چاہتے ہو؟
حبیب اللہ اور اس کے بیشتر ساتھیوں نے حیرت سے اس نئی شکل کو دیکھا جو اکڑی
کھڑی تھی۔ اس نے طنز سے کہا۔ ''مغربی پاکستانی ایجنٹ کتنے پیسے ملتے ہیں؟''
وہ کون سا کم تھی، اسی تیکھے لہجے میں بولی۔ ''پہلے اپنے بارے میں تو بتاؤ۔ ہندستان
سے تمہارا معاملہ کتنے میں طے ہوا۔'' (۳۰)

حبیب اللہ لڑکیوں کے پاس بیٹھا ہوا اُن کی گفتگو سُن رہا تھا۔ وہ غصے سے بوال۔ خدا ان لڑکیوں کے سیکنڈلز سے بچائے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت بڑا طوفان کھڑا کر دیتی ہیں۔ یہ بات مان لیتے ہیں کہ ہمیں مغربی مغربی پاکستان سے نفرت ہے۔ ہم علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مغربی پاکستان سے آئی ہوئی لڑکی سے انسانیت سوز سلوک کیا جائے۔ یہ ساری باتیں سن کر کراس کونو ویٹ کی فارغ التحصیل لڑکی نے کہا کہ تم یہ کیا بکواس کرتے ہو علیحدگی کا۔ اب روٹی کھانے کو ملنا شروع ہوگئی ہے۔ اب وہ لڑکی کھری ہوگئی اور اُس نے اُونچی آواز میں کہا کہ کیا تم اس بات کی وضاحت کروگے کہ تم مغربی پاکستان سے کیوں الگ ہونا چاہتے ہو؟ حبیب اللہ اور اس کے دوستوں نے طنزاً کہا مغربی پاکستانی ایجنٹ کتنے پیسے ملتے ہیں۔ وہ لڑکی بھی کسی سے کم نہیں تھی کہنے لگی پہلے تو اپنے بارے میں بتاؤ ہندوستان سے تمھارا معاملہ کتنے روپوں میں طے ہوا ہے۔ اس اقتباس میں حبیب اللہ کا کردار غداری کے زمرے میں آتا ہے۔ جب کہ دوسری لڑکی جو کہ کراس کونو ونٹ کی فارغ التحصیل ہے کا کردار حب الوطنی پر مبنی ہے۔ سلمٰی اعوان کا یہ طلبہ کی بحث بیان کرنا بھی حب الوطنی کا ایک اہم عنصر ہے۔

ناول نگار سلمٰی اعوان نے یہاں پر ایک مغربی پاکستان سے آنے والی فیملی کے بارے میں بتایا ہے کہ انھیں یہاں پر آئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے۔ اس جگہ کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ یہاں پر گرمی اور سردی دونوں شدید تھیں۔ انھوں نے صرف اپنی ترقی کیلیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ آرمی فیملی تھی۔ اُن کے گھر میں بھی ہر

وقت سیاسی موضوعات پر بحث ہوتی رہتی تھی۔اور یہ بات بھی سمجھتے تھے کہ فوج کے بارے میں یہاں اچھے تاثرات نہیں پائے جاتے۔اس گھر میں ایسی ہی ایک بحث ہو رہی تھی۔اس کا نقشہ سلمٰی اعوان نے کچھ اس طرح سے کھینچا ہے۔

''نذرُل چچا! یہ لا اُبالی اور لا پروا لڑکی یہاں آ کر بہت جذباتی اور حساس ہو گئی ہے۔آپ کی بھابھی اور بھیا دونوں ہی بہت اچھے ہیں میرے لیے۔ بلا شبہ ان کی محبت پدرانہ و مادرانہ شفقت لیے ہوئے ہے۔وہ دونوں سلجھے ہوئے اور وطن دوست لوگ ہیں۔جو طلباء کی تخریبی بسر گرمیوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔رہے بینو اور فخر، تو ان کے ذہن بیرونی زہر سے قدرے متاثر ہیں۔ پر اتنے نہیں کہ انھیں پاکستان سے ہی نفرت ہوا۔وہ ایک متحد پاکستان پر ایمان رکھتے ہیں۔بلبل صحیح معنوں میں باشعور لڑکا ہے، وہ اگر مغربی پاکستان پر کڑی تنقید کرتا ہے تو مشرقی پاکستان کو بھی نہیں چھوڑتا۔ وہ کہتا ہے۔کہ میں مشرقی مغربی کا قائل نہیں۔یہ مشرق مغرب مل کر میرے ملک کی تکمیل کا باعث بنتے ہیں۔مسائل یہاں کے ہوں یا وہاں کے ہمیں ان پر ہمدردی سے سوچنا چاہیے اور ان پر بے لاگ تنقید کرنی چاہیے۔

پر نذرُل چچا! وہ آپ کا بھتیجا! احتشی الرحمٰن، اس کا بس چلے تو غالباً پل میں پور بو پاکستان کو الگ کر دے۔اس کی سرگرمیاں اتنی حوصلہ شکن ہیں کہ کبھی بے اختیار میں سوچتی ہوں کیا کہ وہ اسی گھرانے کا فرد ہے؟''(۳۱)

نذرُل چچا! یہ لا اُبالی اور لا پروا لڑکی یہاں آ کر بہت Emotional ہو گئی ہے۔اور جذبہ حساسیت بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ بھابھی اور بھیا بھی بہت اچھے ہیں۔اُن کی شفقت پدرانہ اور مادرانہ ہے۔اور وہ دونوں محبِّ وطن دوست لوگ ہیں۔وہ ملک پاکستان کے حقیقی وفادار ہیں اور وہ متحدہ پاکستان پر پورا یقین رکھتے ہیں۔بلبل بھی سمجھدار لڑکا ہے۔اگر وہ مغربی پاکستان پر تنقید کرتا ہے تو مشرقی پاکستان کو بھی نہیں بخشتا۔اُس کا خیال ہے کہ وہ مشرق مغرب کا

قائل نہیں ہے۔مشرق مغرب مل کر ہی پاکستان کی تکمیل کا باعث بنتے ہیں۔مسائل جس صوبے کے بھی ہوں اُن پر بے لاگ تنقید ہونی چاہیے۔ پرنذرل چچا کا بھتیجا بہت دور جا چکا ہے۔اُس کی سرگرمیاں بہت حوصلہ افزا ہیں۔اُس کا بس چلے تو وہ ابھی مشرقی پاکستان کو الگ کر دے۔ یہ ساری گفتگو پاکستان کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔پاکستان آرمی کے لوگ اپنے اہل وعیال سمیت بہت محبّ وطن ہیں۔اوراس اقتباس میں یہ گفتگو وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی اور پاکستان سے محبت والی جماعتیں اور تنظیمیں بھی سرگرم عمل تھیں۔ایک اسلامی تنظیم اسلامی چھاتر وشنگھو کا ایک طالب علم ارسلان احمد ایک یونیورسٹی کی طالبہ سے بات کرنا چاہتا ہے۔لیکن وہ مثبت جواب نہیں دیتی۔تاہم وہ ارسلان احمد کی پوری بات سننے کے بعد اپنی حمایت کا یقین دلاتی ہے۔ان کی گفتگو سلمٰی اعوان نے کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

''آپ ارسلان احمد ہیں۔۔۔آپ ایم۔اے کے سال اوّل میں ہیں تو میں کیا کروں؟

لڑکا جھینپا۔۔۔''وہ دراصل بات یہ ہے''۔۔۔۔اس نے تھوک نگلا۔۔۔''ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری پارٹی میں شامل ہوں۔''

''مائی گڈنس!''۔۔۔اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔۔۔یہ بتایئے آپ لوگوں کو پارٹی بازی کے سوا اور کوئی کام بھی ہے۔؟۔۔۔نہیں بھئی مجھے کسی پارٹی کی ممبر نہیں بننا! کون اس جھمیلے میں پڑے۔یہاں تو بات بات پر چاقو چھریاں چل نکلتی ہیں۔''

''پنجاب سے تعلق رکھتے ہوئے بھی چاقو چھریوں سے ڈرتی ہیں آپ؟''

وہ چل پڑی تھی جب لڑکے کا یہ طنزیہ جملہ سن کر پلٹی۔یہ بات اسے پسند آئی تھی۔ان ہی قدموں پر واپس لوٹتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔''کون سی پارٹی ہے آپ کی؟''

''اسلامی چھاتر وشنگھو''لڑکے نے متانت سے کہا۔

''اسلامی چھاتر وشنگھو'' وہ دھیرے سے خود سے بولی۔

اس نے ایک نظر ڈھاکا یونیورسٹی کی وسیع عمارت پر ڈالی اور پھر اس لڑکے کو دیکھا جو سے پارٹی میں شمولیت کی دعوت دے رہا تھا۔تب اس نے سوچا۔

''میرے وطن کا یہ حصہ جو کبھی کبھی مجھے خود سے ٹوٹتا نظر آتا ہے۔اسے قائم رکھنے کی جو جدوجہد یہ پارٹی کر رہی ہے اس نے تو بہت پہلے مجھے اس سے متاثر کیا ہے۔ہاں وقت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔''

اور اس نے پُر اعتماد آواز میں اس سے کہا۔۔''میں آپ کی پارٹی میں شامل ہوتی ہوں اور یہ یقین دلاتی ہوں کہ میری ذات اس کے لیے یقیناً تقویت کا باعث ہوگی۔پارٹی مجھے سرگرم اور مخلص پائے گی۔انشاءاللہ''(۳۲)

ارسلان احمد اسلامی چھاتر وشنگھو کا کارکن ہے اور تعارف کرواتا ہے کہ وہ انٹرنیشنل ایڈمنسٹریشن میں سال اوّل کا طالب علم ہے۔اور آپ کو اپنی پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔پہلے تو لڑکی انکار کر دیتی ہے لیکن جب اُسے پارٹی کا پتا چلتا ہے کہ تو وہ فوراً شامل ہونے کی حامی بھر لیتی ہے۔کیوں کہ وہ اُس پارٹی کے بارے میں پہلے بھی معلومات رکھتی تھی۔اسلامی چھاتر وشنگھو طلبہ کی بہت ہی متحرک تنظیم تھی۔اس تنظیم کے کارکنان نے سانحہ مشرقی پاکستان کے دوران بڑی قربانیاں دی تھیں۔اس طرح اس لڑکی نے نہ صرف پارٹی میں شمولیت اختیار کی بلکہ یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ تنظیم کی وفادار رہے گی۔اس اقتباس میں تنظیم اسلامی چھاتر وشنگھو کا کردار ایک محبّ وطن تنظیم کا تھا۔اور پاکستان ٹوٹنے سے بچانے میں اس تنظیم نے بڑی قربانیاں دی تھیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں۔تمام تنظیمیں اپنے اپنے مؤقف کا اظہار جلسے جلوسوں کے ذریعے کر رہی تھیں۔چھاتر و لیگ کی لڑکیاں جے بنگلہ۔۔جے بنگلہ کے نعرے لگا رہی تھیں۔جب کہ آمنہ اسلامی

چھاترو سنگھو کی رُکن تھی۔ وہ لڑکیوں کو لے کر لان میں گئی۔اس نے لان میں موجود لڑکیوں کو مخاطب کیا۔اس حوالے سے سلمیٰ اعوان یوں رقم طراز ہیں:

''تو جاؤ نا! اٹھالاؤ اسے، جلدی کرنا، وقت تو ہو رہا ہے۔''۔۔۔ چھاترو لیگ کی لڑکیاں کامن روم کے سامنے کھڑی چیخ رہی تھیں۔۔۔۔''جے بنگلہ۔۔۔۔۔جے بنگلہ۔'' یونین کا روس نواز گروپ بھی چلایا۔۔۔۔شنگرام،شنگرام۔اگیاو دفعہ بھنتی ہوبے۔ بھنتی ہوبے۔''

آمنہ پارٹی کی لڑکیوں کو لان میں لے گئے۔تب وہاں پاکستان جندہ باد،اسلامی چھاترو شنگھو جندہ باد کی آوازیں گونجیں۔

آڈیوٹوریم کی دیواروں پر پوسٹر لگاتی اس لڑکی کی رگ رگ میں سرور آ گیں لہریں دوڑ یں تھیں۔اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا اور نم نظروں سے،اس نے آسمان اور زمین کو دیکھا اور گلوگیر لہجے میں خود سے بولی تھی۔

''معبود! چاند تارے کے علم والا میرا یہ وطن، ہمیشہ قائم رہے۔''

وہ پوسٹر ادھورے چھوڑ کر ان کی طرف بھاگی تھی۔اس نے اپنا بازو ہوا میں لہرایا اور جسم و جان کی پوری قوت سے چیخی تھی۔

''پاکستان زندہ باد''(۳۳)

آمنہ اسلامی چھاترو شنگھو کی کارکن تھی۔اُس نے اپنی پارٹی کی لڑکیوں کو لان میں اکٹھا کیا تو وہاں پر پاکستان زندہ باد، اسلامی چھاترو شنگھو زندہ باد کی آوازیں آنے لگیں۔آڈیٹوریم کی دیواروں پر پوسٹر لگاتے ہوئے بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔اور اس نے بھیگی آنکھوں سے آسمان اور زمین کو دیکھا اور غمگین لہجے میں اپنے آپ سے کہا۔

''معبود! چاند تارے کے علم والا میرا یہ وطن، ہمیشہ قائم رہے۔''اس نے پوسٹر ادھورے چھوڑے اور اپنا بازو ہلاتے ہوئے زور سے چیخ ماری'' پاکستان زندہ باد''۔عوامی لیگ کے طلبہ کے سامنے سینہ سپر ہونے والی اور محبِّ وطن جماعت صرف اسلامی چھاترو شنگھو تھی۔اس تنظیم نے نہ صرف مرد طلباء بلکہ خواتین طالبات کو اپنی تنظیم کا رُکن بنا کر شعور ڈھا کہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔اپنے ہزاروں طلبہ شہید کروائے۔اس تنظیم کی پاکستان کو متحد رکھنے کی کوشش حب الوطنی کے زمرے میں آتی ہے۔

سمیعہ ڈھا کہ یونیورسٹی طالبہ تھی۔وہ دن رات استحکام پاکستان کے لیے کام کر رہی تھی۔وہ عوامی لیگ کے غنڈوں کا مقابلہ بھی کر رہی تھی۔اور ساتھ ساتھ اپنی یونیورسٹی کی لڑکیوں کو علیحدگی کے نقصانات سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ اپنی تقاریر میں طلبا و طالبات کو بتاتی کہ یہ ملک کتنی جدوجہد اور قربانیوں سے حاصل کیا گیا تھا اور اگر خدانخواستہ یہ ٹوٹ گیا تو یہ بہت بڑا سانحہ ہوگا۔سمیعہ کے کردار کے بارے میں سلمٰی اعوان یوں رقم طراز ہیں:

> ''دن چڑھے جب وہ جاگی تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مہینوں کی بیمار ہے اور اس کی ساری طاقت بیماری کا مقابلہ کرنے میں صرف ہوگئی ہو۔گزشتہ دن کے واقعات ایک ایک کرے اسے یاد آئے۔یہ وہ بھی سمجھتی تھی کہ شیلپی اس کے لیے مخلص ہے پر اسے مغربی پاکستان بھجوانے کا حق وہ ہرگز اسے دینا نہیں چاہتی تھی۔
>
> مجھے پاکستان سے پیار ہے۔میں یہاں کام کرنا چاہتی ہوں تا کہ بنگلہ قومیت کے اس دیو کو جو اس گونگی بہری سرزمین کے بے گناہوں کے خون سے لالہ زار بنانے والا ہے، کا مقابلہ کر سکوں۔''(۳۴)

سمیعہ دن طلوع ہونے کے بعد جاگی تو اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہت دنوں کی بیمار ہے۔اور اس کی ساری طاقت بیماری کا مقابلہ کرتے ہوئے صرف ہوگئی ہو۔وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شیلپی اس کے لیے مخلص ہے لیکن وہ اسے مغربی پاکستان بھجوانے کا اختیار نہیں دے سکتی۔میں پاکستان سے پیار کرتی ہوں اور مشرقی پاکستان رہ کر کام کرنا

چاہتی ہوں۔تا کہ بنگلہ قومیت کے حامی جو اس زمین کو خون آلود کرنا چاہتے ہیں اُن کا مقابلہ کرسکوں۔سمیعہ کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے لیکن وہ مشرقی پاکستان میں رہائش پذیر ہے۔اُس کا کردار ایک اچھے محبّ وطن کا ہے۔وہ بحیثیت مسلمان پاکستانی اپنے وطن سے پیار کرتی ہے۔اس کا یہ کہنا کہ وہ مشرقی پاکستان رہ کر کام کرنا چاہتی ہے۔اُس کی حب الوطنی کا سب سے بڑا عنصر ہے۔سلمٰی اعوان کا ناول ''تنہا'' سانحہ مشرقی پاکستان کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ناول نگار تقریباً دو سے تین سال تک پڑھائی کے سلسلے میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں مقیم رہیں۔انھوں نے وہ حالات و واقعات لکھے ہی جو کہ سانحہ مشرقی پاکستان کا سبب بنے۔انھوں نے وہ ادارے اور کردار سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو پاکستان کو متحد رکھنے کی بھرپور کوششیں کرتے رہے۔یہ کردار بلاشبہ جذبہ حب الوطنی کے زمرے میں آتے ہیں۔اس ناول میں مجموعی طور پر ایک اسلامی تنظیم (اسلامی چھاتر وشنگھو) کا نام سرفہرست ہے۔جس کا پاکستان کے لیے پہلا شہید عبدالمالک تھا۔جسے عوامی لیگ کے غنڈوں نے قتل کر دیا تھا۔یہ تنظیم ڈھاکہ یونیورسٹی کے علاوہ مشرقی پاکستان کے دیگر کالجوں میں برسرِ پیکار رہی اور آخر کار عوامی لیگ کو فتح ہوئی اور مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ناول ''تنہا'' کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب اردو ناول کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''سلمٰی اعوان شاید پہلی ناول نگار خاتون ہیں جنھوں نے منگنی اور شادی بیاہ کی رومانی رسوم سے گوٹے کناریوں کی جگمگاہٹ پیدا کرنے کی بجائے ان آنسوؤں کو چنا جو سقوطِ ڈھاکہ کے واقعہ سے عام لوگوں کے دلوں سے نکل کر پلکوں پر جم گئے تھے۔سلمٰی اعوان ناول کو سلسلہ در سلسلہ پھیلانے اور پھر اسے معنی خیز لہجے کی سمت لانے کا فن جانتی ہیں اور وہ بالآخر اس روح کو سطح پر ابھار دیتی ہیں جو زخمی ہے۔اس دھن کو اجاگر کرتی ہیں جو بیمار ہے اور اس جسم کو آشکار کرتی ہیں جو شکستہ اور دولخت ہے۔اس ناول سے وہ لمحے زندہ ہوتے ہیں جنھیں ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔وہ واقعات سامنے آجاتے ہیں۔جنھوں نے پاکستان کا جغرافیہ مسخ کر دیا۔قائداعظم کے پاکستان کا حلیہ تبدیل کر دیا ہے۔سلمٰی اعوان نے یہ ناول لکھ کر الطاف

حسن قریشی سے اسے چھاپ کر ہم سب کو ڈھاکہ پلٹن گراؤنڈ میں لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں ہم سب اپنے اپنے ستون جنرل اوڑہ کو اپنی گردن جھکائے پیش کر رہے ہیں۔ دسمبر اس سانحے کو یاد کرنے کا مہینہ نہیں بلکہ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے کا اور اس ندامت کی تجدید کا مہینہ ہے کہ

اے ارضِ وطن ،ترے غم کی قسم
ترے دشمن ہم، ترے قاتل ہم

سلمیٰ اعوان نے یہ ناول لکھ کر شدید ترین احساس ندامت کا اثبات کیا ہے۔(۳۵)

ڈاکٹر انور سدید نے اسی ناول کے بارے میں بلاشبہ اپنی رائے دی ہیکہ یہ ناول سانحہ مشرقی پاکستان کے مکمل واقعات کی ترجمانی کرتا ہے اور اُن کرداروں کو سامنے لایا جو سانحہ مشرقی پاکستان کا سبب بنے۔ یہ ناول حب الوطنی کے مضبوط کرداروں سے مسلح ہے۔ اس کا اہم کردار سمیعہ ہے جو پنجاب کی رہنے والی ہے لیکن جذبہ حب الوطنی کے تحت مقیم ہے اور پاکستان کو متحد رکھنے کی آخر دم تک کوششیں کرتی ہے۔

زمین (۱۹۸۰ء)

زمین ناول خدیجہ مستور نے لکھا جو ۱۹۸۰ میں شائع ہوا اس ناول میں قیام پاکستان اور بعد کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ناول کے اہم کردار صلاح الدین اور ساجدہ ہیں جن کے ذریعے حب الوطنی کے عناصر سامنے آتے ہیں۔

صلاح الدین نے اسے کہا کہ میرا نام صلاح الدین ہے مگر اماں مجھے صلو کہتی تھی تو۔ سب مجھے صلو کہتے ہیں تم بھی صلو کہا کرو۔ ساجدہ نے سعادت مندی سے اقرار کیا۔ اس کے بعد صلاح الدین خوشی سے ساری داستان سنانے لگا کہ کیسے اس کے گاؤں میں پھلوں کے درخت تھے اور آم کے درخت پر کوئلیں جب آئیں تو وہ انہیں غلیل سے مارتا تھا۔ صلو اپنی باتیں کئے جارہا تھا اور ساجدہ سنتی جارہی

تھی۔ناول نگار یوں رقم طراز ہیں:

''اچھا۔اس نے بے حد سعادت مندی سے اقرار کرلیا تھا۔اس کے بعد تو اس نے خوش ہوکر اسے اپنی ساری رام کہانی سنا ڈالی تھی۔ہم گاؤں سے آئے ہیں وہاں ہماری زمین ہے، وہاں بہت سے درخت ہیں، آموں کے درخت۔آموں پر جب بور آتا ہے تو کوئلیں بولتی ہیں اور جب وہ ہماری امیوں کو کھاتیں تو میں غلیل سے انہیں مار ڈالتا۔'' (۳۶)

صلاح الدین اپنے گاؤں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی گاؤں میں زمین ہے۔ جہاں بہت سے درخت اگے ہوئے ہیں۔آموں کے درخت سب سے زیادہ ہیں۔آموں کو کھانے جب کوئلیں آتی تھیں تو وہ انہیں غلیل سے مارتا تھا۔صلاح الدین شہر میں پڑھنے آیا ہوا ہے جسے اپنا گاؤں یاد آتا ہے۔

ساجدہ اور اس کے گھر والے جب نئے گھر میں آئے تو اس کی ماں نے اس کے باپ سے کہا کہ اس نے کتنی چاہت سے چنبیلی کا پودا لگایا ہے۔محل بنایا ہے مٹی چن چن کر۔ پھر محل بناتے بناتے وہ اتنی تھک گئی کہ ایسا سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں۔مگر سجو کے ابا نے اماں کی جگہ سنبھال لی۔حتی کہ اگر وہ سجو کو کام کرتے یا صفائی کرتے دیکھتے توں نالاں ہوتے کہ وہ پڑھائی پر توجہ دے۔ یہ کام اس کے کرنے کے نہیں ہیں۔اس تبدیل شدہ زندگی کو خدیجہ مستور نے نہایت خوبصورتی سے لکھا ہے:

''نئے گھر میں آکر اماں نے بڑے فخر سے کہا تھا: دیکھا تم نے سجو کے ابا' میں نے ماٹی چن چن کر محل بنایا ہے۔انہوں نے اپنے محل میں موتیے کا پودا لگایا تھا اور چنبیلی بیل دیوار پر چڑھائی تھی، وہ اپنے محل کو طرح طرح سے سجانے میں لگی رہتیں۔مگر محل بناتے اور سجاتے ہوئے وہ اتنی تھک گئی تھیں کہ کچھ ہی دن بعد ساون کی ایک رم جھم برستی رات میں وہ ایسے سکون سے پاؤں پھیلائے سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں۔

شام کو جب ابا دکان سے لوٹتے تو گھوم پھر کر گھر کی ایک ایک چیز کو دیکھتے پھر موتیے
اور چنبیلی کو پانی دیتے۔'' (۳۷)

پاکستان بننے کے ساتھ ایک کش مکش جو شروع ہوئی تھی وہ ابھی جاری تھی۔ ساجدہ کے ابا بھی انتقال کر گئے گا موعرف غلام محمد اس کے پاس آیا اس نے روتے ہوئے اسے بتایا۔ اب وہ اکیلی رہ گئی۔ اب اسے مستقبل کا سیاہ سایہ نظر آ رہا تھا۔

اس کے ابا کے انتقال کے بعد خواتین اس کے مستقبل کے لیے فکر مند نظر آنے لگیں۔ ہر کوئی اپنی مطلب کا رشتہ لے کر آتی۔ ایک خاتون کہنے لگی پاکستان کے لیے میرے بھائی نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ سچ پوچھو تو پاکستان اسی نے بنایا ہے۔ ناول نگار یوں رقم طراز ہیں:

'' اور میرا بھائی ماشاء اللہ بارہ جماعتیں پڑھا ہوا ہے، وہاں جلسے جلوسوں میں پڑ گیا۔ کہتا تھا کہ اب تو پاکستان جا کر ہی پڑھوں گا۔ میں تو کہتی ہوں پاکستان کے لئے اس نے رات دن ایک کر دیئے۔ سچ پوچھو بہن! تو پاکستان بنایا اسی نے، اللہ اس کی لمبی عمر کرے، صورت شکل ایسی کہ دیکھے سے بھوک پیاس اڑے۔'' (۳۸)

ساجدہ کے باپ کے انتقال کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئی۔ اب محلے کی خواتین اپنے اپنے معیار کے مطابق اس کے لئے رشتے ڈھونڈھ کر لا رہی تھی۔ انہی خواتین میں ایک ایسی بھی تھیں جو اپنے بھائی کا پیغام لے کر آئی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اس کا بھائی قیام پاکستان کے لیے اتنا پر جوش تھا کہ اس نے اپنی تعلیم بھی پاکستان کی خاطر چھوڑ دی تھی۔ ایک دوسرے کے دکھوں میں شریک ہونا لوگوں کے آپس میں پیار و محبت کی علامتیں ہیں۔ اس سے لوگوں کے درمیان رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔ اور کسی علاقہ میں بسنے والوں کے آپسی تعلقات کی مضبوطی دراصل وطن کی مضبوطی کی علامت ہے۔ اور ان کی آپس میں محبت اپنے وطن سے محبت کا ثبوت ہے۔ درج بالا پیراگراف میں ساجدہ سے خواتین کی محبت کا اظہار در پردہ ملک پاکستان سے

محبت کا اظہار ہے۔

ناظم سلیمہ سے ملنے اس کے پاس آتا ہے جہاں ساجدہ پہلے سے موجود ہوتی ہے وہ اسے دیکھ کر مزید سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ وہ سلیمہ سے اس کا حال پوچھتا ہے تو سلیمہ طنزا اسے پوچھتی ہے کہ تمہارے پاکستان کا کیا حال ہے۔ جس پر ناظم ہنس پڑتا ہے کہ کیا پاکستان آپ کا نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ آپ لوگوں کا پاکستان صرف میرا ہے اور وہ بھی نام کی حد تک۔ باقی اس میں جو بھی ہے وہ آپ لوگوں کا ہے۔ سلیمہ اسے کہتی ہے کہ میرا کچھ بھی نہیں ہے جو بھی ہے وہ تمہارے باپ، بھائی اور خالہ بی کا ہے۔ ناول نگار یوں رقم طراز ہیں:

''کیا حال ہے تمہارے پاکستان کا؟ سب خیریت ہے نا؟'' اماں بی نے بڑے سرسری انداز سے پوچھا۔

''میرا پاکستان!'' وہ ہنس پڑا کیا آپ کا پاکستان نہیں ہے؟ مگر آپ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان صرف میرا ہے، میرا مقصد ہے کہ نام کی حد تک۔ باقی یہاں جو کچھ ہے وہ سب آپ لوگوں کا ہے۔'' (۳۹)

جہاں پاکستان کا ذکر آتا ہے یا وطن کے بارے میں بات ہوتی ہے یا وطن کے مفاد کی بات ہوتی ہے وہ حب الوطنی کے زمرے میں آتی ہے۔ تمھارے پاکستان کا کیا حال ہے؟ یہ جملہ بھی وطن دوستی کا اظہار ہے۔

صلو کئی سالوں بعد اچانک ساجدہ کے سامنے آ گیا۔ ساجدہ کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ یوں ملے گا۔ حالاں کہ وہ یہ چاہت کرتی رہی تھی کہ صلو اسے ڈھونڈے مگر صلو نے بہت عرصہ لگا دیا تھا۔ وہ کاظم سے ملنے آیا تھا جہاں اس کی ملاقات ساجدہ سے ہوگئی۔ ساجدہ اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں پڑھاتا ہے اور صلو اس کی پوری بات سنے بغیر کہتا ہے۔ بقول ناول نگار:

''میں سرگودھا میں رہتا ہوں' اس نے شاید ساجدہ کا پورا جملہ نہیں سنا تھا۔ وہاں

میری بہت سی زمین ہے، دس مربعوں میں تو صرف باغ ہے، بڑے اچھے مالٹے ہیں میرے باغ کے، خالص ریڈ بلڈ۔ میری بیوی کو بھی جہیز میں پچیس مربع ملے ہیں، ہم دونوں اپنے علاقے کے بڑے زمیندار ہیں۔ سارے افسر ہمارے ہاں آ کر ٹھہرتے ہیں۔'' (۴۰)

انسان جس جگہ رہتا ہے۔ وہ اچھی ہو یا بری اس سے اس کا قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ اور وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ جیسے صلو کرتا ہے۔ سرگودھا کا ذکر اور باغات کا ذکر بھی حب الوطنی کے جہات میں آتا ہے کیونکہ انسان فطری طور پر اپنے شہر، زمین اور گھر سے محبت کرتا ہے۔ یہ تمام جہتیں دراصل اپنے وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

صلو آج بھی وہی باتیں دہراتا ہے جو اس نے پہلی ملاقات میں ساجدہ سے کہی ہوتی ہیں۔

ناظم کو جیل ہوتی ہے تو سب گھر میں افسردہ ہوتے ہیں مگر ساجدہ کا دل فخر سے معمور ہوتا ہے وہ کہتی ہے کہ قیام پاکستان سے قبل بھی ناظم جیل میں رہا ہے۔ کانگریس کے لوگوں نے اسے قید کروایا تھا۔ ناظم کا جیل میں جانا وطن کے لیے تھا۔ ناول نگار لکھتی ہیں:

''گھر میں سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ سوگ کی عجیب سے فضا طاری تھی، اماں بی نے اسے لپٹایا تو رنجیدہ ہونے کے باوجود ان کی آنکھوں میں فخر تھا، انہوں نے بتایا کہ ناظم پاکستان بننے سے پہلے بھی چھ مہینے جیل میں رہا تھا۔ ایک بار کانگریسیوں نے بھی اسے گرفتار کرادیا تھا، مگر وہ ایک ہفتے بعد رہا ہو گیا تھا۔'' (۴۱)

ناظم اپنے ملک کی آزادی کی خاطر چھ ماہ جیل میں گزارتا ہے، اور امّاں بی بڑے فخر سے ناظم کے بارے میں بتاتی ہیں کہ ہمارا بیٹا بہت بہادر اور محبّ وطن ہے۔ اس سے بڑکر اور کیا ہوسکتا ہے کہ کوئی ملکی محبت میں خود کو پابند سلاست ہونے پر مخر اور خوشی محسوس کرے۔ اور دوسرے لوگ اس کو

عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔

چلتا مسافر (۱۹۸۱ء)

الطاف فاطمہ کا ناول ''چلتا مسافر'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں لکھا گیا تھا۔ اس ناول میں وطن سے محبت کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔ انسان جہاں کہیں بھی چلا جائے اُسے اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے جب مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہوگیا تو مغربی پاکستان کے شہریوں میں مشرقی پاکستان کی محبت جاگ اُٹھی۔ الطاف فاطمہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں پہیلیاں کب بجھا رہا ہوں۔ میں تو سیدھی سی بات کر رہا ہوں۔ بیگم، میں تو پاکستان کے استقبال کے لیے اپنا پیادہ بھیج رہا ہوں۔'' ''پاکستان! آپ نے پھر وہی خواب خرگوش دیکھنا شروع کر دیئے۔'' اور پھر وہ بڑی بے زاری سے بولیں، ''اونہہ! آپ نے خواب دیکھنے کے سوا اور کبھی کچھ کیا بھی ہے۔ لیکن یہ خواب اکیلا میں تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔'' وہ منہ اُٹھا کر جیسے خلا میں کچھ دیکھنے لگے۔ آسمان پر بدلیاں جھوم رہی تھیں اور پُروا چل رہی تھی۔'' (۴۲)

میاں بیوی کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے۔ پاکستان سے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ میاں کہتے ہیں کہ میں اُن کے استقبال کے لیے اپنا پیادہ بھیج رہا ہوں۔ بیوی کہتی ہے کہ آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ یہاں پر میاں کا پاکستانی لوگوں کے استقبال کے لیے پیادہ بھیجنا حب الوطنی ہے۔

یہ واقعہ قرار دار پاکستان کا ہے۔ جب مارچ ۱۹۴۰ء میں قرار دار پاکستان منظور ہوئی تھی۔ جب شیر بنگال نے قرارداد پاکستان پیش کی تھی۔ یہ صورت حال الطاف فاطمہ یوں بیان کرتی ہیں:

''پانچ سال پہلے میری قوم نے جو خواب دیکھا تھا، وہ حقیقت میں ڈھل رہا ہے اور ڈھل کر رہے گا۔ تم کہتی ہو میں ایسی باتیں نہ کیا کروں، لیکن بیگم، اگر تم لاہور کے اس اجتماع میں موجود ہوتیں تو تم اس خواب کو فراموش نہ کرتیں۔ جناح صاحب کے چہرے کا وہ سکون، وہ عزم اور ہر ہر صوبے کے مسلمانوں کا وہ جوش اور سب سے زیادہ ولولہ انگیز وہ لمحہ جب شیر بنگال نے سٹیج پر آ کر قراردادِ پاکستان پیش کی اور.....اور.....'' ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔'' (۴۳)

اس گفتگو میں قرارداد پاکستان پر بحث ہو رہی ہے کہ جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ تو شیر بنگال مولوی فضل الحق کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ بہت پُرسکون تھے۔ پانچ سال پرانا خواب حقیقت میں ڈھل رہا تھا۔ قرارداد پاکستان کا ذکر کرنا اور شیر بنگال مولوی فضل الحق کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نکلنا اپنے وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ تحریک پاکستان میں نہ صرف مغربی بل کہ مشرقی علاقوں کے لوگوں نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ قرارداد پاکستان پیش کرنے والے مولوی فضل الحق بھی بنگال سے تعلق رکھنے والے تھے۔ درج ذیل واقعہ الطاف فاطمہ نے تحریک پاکستان کے تناظر سے یوں تحریر کیا ہے۔

''میاں کوئی بات تو ہے جو ہم بہار کے مسلمان مطالبہ پاکستان کی اتنی زور شور سے حمایت کر رہے ہیں۔ تم سمجھتے ہو ہم کوئی بڑا دلچسپ خواب دیکھ رہے ہیں؟'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ تو ہم جانتے ہیں کہ کون سا وقت ہماری تلاش میں ہے۔ بیٹا، ہمیں اور تمہیں بہت بھاری قربانی دینا پڑے گی، اس سب کی۔ مگر کیا کیا جائے۔ بس تم اتنا سوچ لو کہ ہندوستان سونے کی چڑیا ہے انگریز کے لیے۔ وہ اس کو نہ چھوڑنے کی ہر تدبیر کر کے ہارے گا۔ اور اس نے سان پر چڑھا دیا ہم مسلمانوں کو۔ چھری اُلٹی گری تو، اور سیدھی گری تو.....'' (۴۴)

تحریک پاکستان میں بہار کے مسلمانوں نے بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا تھا۔ انگریز ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھتے ہیں۔ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے لیکن ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے بہت بھاری قربانیاں دینی پڑیں گی۔ بہار کے مسلمانوں کا آزادی کی جنگ میں حصہ لینا وطن سے محبت ہے۔ اپنے حقیقی وطن سے محبت کی یادیں کبھی بھی فراموش نہیں ہوتیں۔ درج ذیل واقعہ الطاف فاطمہ نے اسی تناظر میں یوں بیان کیا ہے:

''میں دو ماہ قبل پاکستان پہنچا تھا۔ جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک مرتبہ آپ مجھے کراچی لائے تھے۔ اس وقت کوئی احساس ہی نہ تھا۔ بہت بڑے فرق اور اجنبیت کے باوجود یہ لگتا تھا کہ ایک شہر ڈھاکہ ہے اور ایک کراچی۔ اور اب جب میرا جہاز کھٹمنڈو سے اسلام آباد پہنچا تو میرا احساس مجھے شل کیے دیتا تھا۔ یہ شل ہو جانا کتنا اچھا ہوتا ہے۔ آدمی کچھ سوچتا بھی نہیں، کچھ کہتا بھی نہیں۔''(۴۵)

درج بالا اقتباس میں سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد کی صورت حال بیان کی گئی ہے۔ پرانی یادوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ دو ماہ پہلے پاکستان آیا تھا۔ جب وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا کراچی آیا تھا۔ اُس وقت کوئی اجنبیت نہیں تھی کہ پاکستان کے بڑے شہر دو ہی ہیں یعنی ڈھاکہ اور کراچی۔ اور آج بھی محسوس ہو رہا ہے کہ اب کراچی اور ڈھاکہ دو الگ ملک بن چکے ہیں۔ دو الگ ملکوں کا احساس وطن سے محبت ہے۔ اپنا ملک اور شہر اچھے لگتے ہیں اور ہر انسان کو اپنے ملک، شہر اور گھر سے محبت فطری ہوتی ہے۔ الطاف فاطمہ نے ایسا ہی محبت کا ایک قصہ یوں بیان کیا ہے:

''اسلام آباد واقعی روشنیوں کا شہر ہے۔ بڑی رونق میلے یہاں۔ منسٹروں کے گھر اور گاڑیاں دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اب جس خطے میں آ کر ہم نے قیام کیا ہے، وہ بڑا آسودہ ہے اور بہت باوقار ہے۔ بڑی شان وشوکت ہے۔ لوگ ہنستے

بولتے ہیں۔خوب رج کر کھاتے پیتے ہیں، دیس دیس کی چیزوں کی خریداری کر
تے ہیں اور خوب خوش رہتے ہیں۔''(۴۶)

اسلام آباد بہت خوبصورت شہر ہے۔ یہاں پر بڑی رونق ہے۔ وزراء کے گھر اور گاڑیاں دیکھ کر اُسے بہت خوشی حاصل ہوئی ہے جہاں ہم رہ رہے ہیں بہت آسودہ اور باوقار علاقہ ہے۔اور لوگ بھی خوش ہیں شہر کی خوبیاں بیان کرنا دراصل حب الوطنی ہے۔ جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تو بہت سارے لوگ بہت تنگ ہوئے۔ بیٹا لاہور میں ہے تو باپ ڈھاکہ میں۔اس صورتحال کو الطاف فاطمہ نے یوں بیان کیا ہے:

''اور جب ڈھاکہ یاد آتا ہے تو میں سوچتا ہوں، وہ پرانا شہر تھا اور میں بالکل نئے
شہر میں رہ رہا ہوں۔شاید اس لیے مجھے وہ یاد آتا ہے۔سوچتا ہوں، ایک چکر لاہور
کا بھی لگے۔لاہور پرانا شہر ہے۔لاہور جاؤں گا تو دادو سے کہیے گا کہ داتا صاحب
ضرور جاؤں گا۔کل سے وہ مجھے بہت یاد آرہی ہیں۔کاش! میں ان سے مل کر آیا
ہوتا۔کبھی کبھی میں رات کو سوتا ہوں تو لگتا ہے ان کے پاس گھس کر لیٹا ہوا
ہوں۔''(یہ پڑھ کر مزمل کے ہاتھ لرزنے لگے تھے)۔''(۴۷)

جب مجھے ڈھاکہ یاد آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ وہ پرانا شہر تھا اور میں نئے شہر میں رہ رہا ہوں لیکن ایک سوچ یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ لاہور ضرور جاؤں گا۔اور داتا دربار پر بھی حاضری دوں گا۔ یہاں پر وطن سے محبت دو حصوں میں تقسیم ہوتی نظر آتی ہے یعنی مزمل کو ڈھاکہ اور لاہور دونوں شہروں سے محبت ہے۔ کیونکہ ۱۹۷۱ء سے پہلے دونوں شہر ایک ہی ملک کا حصہ تھے۔لاہور اور ڈھاکہ کا ذکر وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

پریشر ککُر (۱۹۸۳ء)

وطن سے محبت کے اظہار کے کئی طریقے ہیں۔کبھی انسان اپنے علاقے یا ملک کا ذکر کر کے یا کبھی اپنے گھر کا ذکر کر کے وطن دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے پاکستان پہنچے تو پاکستانی عوام اور حکومت نے انہیں آباد کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔صدیق سالک نے یہاں پر مہاجرین کی ہجرت کی پینٹ بنانے کا ذکر یوں کیا ہے:

> ''فطرت،تم قیام پاکستان کے وقت مہاجرین کی ہجرت پینٹ کرو۔ جب لاکھوں عورتیں، مرد اور بچے گرتے پڑتے پاکستان پہنچے۔اُن کے جسموں اور چہروں پر تھکاوٹ کے آثار تھے لیکن آنکھوں میں اُمید کی کرن تھی۔آزادی کی کرن، اپنے نئے گھر کی کرن، ٹھیک ہے سر'' فطرت نے کہا اور لائبریری میں جا کر گُم سُم بیٹھ گیا۔''(۴۸)

فطرت کا باس اسے حکم دیتا ہے کہ تم قیام پاکستان کے وقت مہاجرین کی ہجرت پینٹ کرو۔ یہ ایسی تصویر ہونی چاہئیے کہ جس میں عورتیں، بچے اور مرد گرتے پڑتے پاکستان پہنچتے ہوئے دکھائی دیں۔جن کی آنکھوں میں آزاد وطن میں لئے گھر کی اُمید تھی۔مہاجرین کی تصویر بنانا بھی حب الوطنی ہے۔اس کو دیکھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ لوگ پاکستان کی خاطر اپنے گھر بار چھوڑ کر اڈے آرہے ہیں نہ کسی کو جان کی پرواہ اور نہ کسی کو آرام کی ضرورت نہ کوئی ڈر ہے نہ خوف ہے بس اپنے مقصد کے پیچھے بھاگے جارہے ہیں اور وہ مقصد پاکستانیت یا پاکستان ہے۔اور اس کی محبت ہے۔اس سارے واقعے میں لوگ عقل سے نہیں دل سے کام لے رہے ہیں۔ان واقعات کو دیکھ کر مجھے اقبال کا شعر یاد آیا۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوے تماشا لب بام ابھی

انسان اپنی جائے پیدائش کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ ریشماں کا اصل وطن چک نمبر ۲۳۰ تھا لیکن وہ بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے فیصل آباد آئی تھی۔ صدیق سالک نے اس صورتحال کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

''پھر اس کو اپنی ماں کی یہ بات بار بار یاد آتی رہی کہ وہ فیصل آباد شہر میں صرف اپنے بچوں کا پیٹ پالنے آئی تھی۔ اس کی اصلی جگہ چک نمبر ۲۳۰ تھی جہاں اس کا گھر تھا۔ اس کا سماج تھا اس کے دوست اور دشمن تھے۔ جب تک وہ وہاں واپس جا کر اپنے گھر کا تالا نہیں کھولے گی اور اپنا مقام بحال نہیں کرے گی اس کی رُوح کو سکون حاصل نہیں ہوگا۔ شرفو کو پتہ چلنا چاہئیے کہ اس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر طلوع آفتاب سے پہلے گم ہو جانے والی ریشماں واپس بھی آ سکتی ہے۔ انگلی پکڑ کر چلنے والے چار سالہ یتیم بچے کے ساتھ نہیں، بائیس سالہ گھبرُو فطرت کے ساتھ، جو اس کی عزت و آبرو کا تحفظ بھی کر سکتا تھا اور اس کے لیے لڑ مر بھی سکتا تھا۔'' (۴۹)

ریشماں کا خاوند فوت ہو گیا تھا۔ تو اُس کی جائیداد پر اُس کے خاوند کے بھائی شرفو نے قبضہ کر لیا تھا۔ اُس کا اصلی گھر تو چک نمبر ۲۳۰ تھا۔ وہ اپنے بچوں کی پرورش کے لیے فیصل آباد چلی گئی تھی جب اُس کے بچے جوان ہو گئے تو اُس نے واپس اپنے گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ انسان اپنے گھر یا ملک سے چاہے پچاس سال دور رہے۔ آخر کار اُسے اپنے آبائی گھر کی یاد ضرور آتی ہے۔ اور وہ گاؤں ضرور جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہی چیز اپنے وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ریشماں صرف اپنے بچوں کی پرورش کے لیے پندرہ سال اپنے گھر سے باہر رہی۔ شہر میں اُسے ہر قسم کا آرام تھا، سہولیات تھیں۔ لیکن اپنے گھر میں جانے کی خواہش ہر وقت اُس کے دل میں موجزن رہتی تھی۔ صدیق سالک نے اس کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

''ریشماں نے کہا مجھے یہاں ہر طرح آرام ہے۔ بیگم صاحب تو کہتی ہیں کہ میں زندگی کے باقی دن انہی کے پاس پورے کروں۔ لیکن تمہیں تو معلوم ہے یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ پندرہ سال گزارنے کے باوجود یہ جگہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ ہمارا گھر وہی تین چار کمروں والا کچا کوٹھا ہے۔ جس پر ایک عرصے سے تالا پڑا ہے۔ ہماری کامیابی اس تالے کو کھولنے میں ہے''۔ ''بالکل، 'بالکل' میں تو یہی فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اب آپ کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا وقت آ گیا ہے اب ہمیں واپس گاؤں چلے جانا چاہئیے۔''(۵۰)

ریشماں کہتی ہے کہ مجھے یہاں ہر طرح کی سہولیات اور آرام حاصل ہے۔ بیگم صاحبہ بھی کہتی ہیں کہ تم ساری زندگی ادھر گزارو لیکن اُسے اپنے گھر کی یاد آتی ہے کہ یہ گھر ہمارا نہیں ہے۔ ہمارا گھر گاؤں میں ہے۔ ہمیں اپنے گاؤں ہی جانا چاہئیے۔ اپنے گھر جانا بھی حب الوطنی ہے۔ کئی پاکستانی بیرون ممالک خصوصاً امریکہ، کینیڈا، جاپان، جرمنی اور برطانیہ میں مقیم ہیں وہ خوشحال تو ضرور ہیں لیکن پرسکون نہیں ہیں، انہیں ہر وقت اپنے وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ وہ اپنے وطن واپس آنا چاہتے ہیں لیکن مجبوریوں کی وجہ سے ٹھہرے ہوئے ہیں، یہ وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ یہ جذبہ حب الوطنی ہے۔

فطرت امریکہ میں تھا۔ اسے کئی پاکستانیوں سے ملنے کا موقع ملا۔ وہ وہاں پر مجبوراً رہ رہے تھے لیکن وہ اصل میں اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں، انہیں اپنے وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ یہی حب الوطنی ہے۔ ایک محبّ وطن کے لیے اُس کی بڑی پہچان اُس کا اپنا ملک ہوتا ہے۔ فطرت کے لیے سب کچھ اُس کا اپنا وطن ہے۔ صدیق سالک یوں رقم طراز ہیں:

''سر اس پیشکش کا شکریہ لیکن میری کمٹ منٹ (Commitment) پاکستان اور صرف پاکستان سے ہے۔ میں پاکستان کے بغیر اپنے آپ کو پہچان ہی نہیں سکتا۔

میری شناخت کا واحد حوالہ میرا ملک ہے اور میں اسی کی سرزمین پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤں گا۔ میری تخلیق پر کوئی پابندی نہیں۔''(۵۱)

فطرت نے بہت بڑی آفر ٹھکرا دی اور کہا کہ میرے لیے پاکستان اور صرف پاکستان ہے۔ میری شناخت اور میری عزت اپنے وطن پاکستان سے ہے۔ میں اپنی تخلیقات کو پاکستان کے لیے وقف کر دوں گا۔ محبّ وطن لوگ ہمیشہ اپنے وطن کی خاطر بڑی بڑی پیشکش ٹھکرا دیتے ہیں۔فطرت کا یہ کردار حب الوطنی کے زمرے میں آتا ہے۔

زندہ قومیں ہمیشہ اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ ہمارے محسن قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے۔فطرت کو یہ کام ملا کہ وہ محسن پاکستان کا بہت ہی خوبصورت پورٹریٹ بنائیں۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کا پورٹریٹ بنانا دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے۔صدیق سالک نے اس پورٹریٹ کے بارے میں یوں لکھا ہے:

''انہی دنوں معمول کے کاموں کے ساتھ ساتھ یکے بعد دیگر تین اور کام فطرت کے سپرد کر دیئے گئے کیوں کہ ان کا تعلق بصری فنون سے بننا تھا۔ پہلا کام بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کا پورٹریٹ تیار کرنا تھا۔ اوپر کہیں فیصلہ ہوا تھا کہ قائداعظمؒ کا ایک خوبصورت پورٹریٹ تیار کروا کر کابینہ سے منظور کروایا جائے اور پھر اس کے پرنٹس تمام دفاتر کو مہیا کئے جائیں۔ڈی۔جی صاحب نے فطرت کو بُلا کر ذاتی طور پر یہ کام دیا اور تاکید کی کہ تصویر میں قائداعظمؒ کو لاغر اور کمزور دکھانے کی بجائے انہیں عزم اور قوت کے سمبل کے طور پر پیش کیا جائے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں میں ایک کہنہ مشق قائد کی بصیرت اور دوراندیشی بھی ہونی چاہیے۔''(۵۲)

پاکستانی قوم اپنے محسنوں علامہ محمد اقبال، سرسید احمد خان، چودھری رحمت علی، سر آغا خان، مولوی

فضل الحق اور خصوصاً حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کو بہت یاد رکھتی ہے۔ حکومتی سطح پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کا بہت خوبصورت پورٹریٹ تیار کروا کر تمام دفاتر میں نمایاں جگہوں پر لگایا جائے۔ یہ تصویر ایسی ہونی چاہیئے جس میں قائداعظمؒ کو عزم اور قوت کی علامت کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کی آنکھوں میں ایک عظیم قائد کی بصیرت اور دور اندیشی بھی دکھائی جائے۔ اپنے قائدین سے محبت بھی دراصل وطن کی محبت ہے۔ جو اس ناول میں دکھائی دے رہی ہے۔

وادی لہورنگ (۱۹۸۴ء)

قیام پاکستان کے وقت ہندوستان نے کشمیر پر کشمیری عوام کی رائے کے خلاف غاصبانہ قبضے کی کوشش کی۔ لیکن کشمیری مجاہدین نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور یہ مجاہدین ہندوستان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ طارق اسماعیل ساگر نے اس صورت حال کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

> ''کشمیر یا موت' یہ تھا وہ نعرہ جو سب سے پہلے ان لوگوں نے پونچھ کی دیواروں پر لکھا ہوا دیکھا۔ یہ نعرہ کشمیریوں کا مقدر بن چکا تھا۔ انہوں نے آزاد کشمیر کے لیے ''باوقار موت'' کی شرط کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا..... پونچھ کے گرد و نواح میں حریت پسندوں کی خفیہ تربیت بڑی تیزی سے جاری تھی۔ شیر و اور شرفو دونوں کو حوالدار صاحب نے رائفل چلانا سکھا دیا تھا۔'' (۵۳)

کشمیر یا موت'' یہ وہ نعرہ تھا جو کشمیری مجاہدین نے پونچھ کی دیواروں پر لکھا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی بھی قیمت پر کشمیر کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ پونچھ کے نواح میں حریت پسندوں کی تربیت جاری تھی۔ کشمیری مجاہدین کا آزادی کے لیے سینہ پسر ہونا وطن سے محبت کا ثبوت ہے۔

حریت پسند لوگ کبھی موت سے نہیں ڈرتے۔ کم تعداد میں ہو کر ہزاروں بلکہ لاکھوں پر حاوی ہوتے ہیں یہ لوگ جذبہ شہادت سے سرشار ہوتے ہیں۔ طارق اسماعیل ساگر اس صورت حال کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:

> ''ڈوگرا فوج کی ایک کمپنی ہجیرہ سے راولاکوٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور اسی طرح کی

ایک دوسری کمپنی کے باغ سے راولاکوٹ کی طرف بڑھنے کی بھی اطلاعات ملیں۔ ان دونوں کمپنیوں کا ملاپ راولاکوٹ پر ہونا تھا جہاں کشمیری مجاہدین جذبہ جہاد سے سرشار ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور لاٹھیاں پکڑے آزادی کشمیر کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ان کے اردگرد پھیلی پہاڑیاں پچھلی ڈیڑھ صدی سے ان کے سر بفلک ارادوں اور کوہ شکن ولولوں کی گواہی دیتی آ رہی تھیں، لیکن..... آج ان پر جو سرشاری کی کیفیت طاری تھی، چشم فلک نے اس سے پہلے اس کا نظارہ کب کیا تھا۔'' (۵۴)

کشمیری مجاہدین اپنے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور لاٹھیاں پکڑے ڈوگرہ فوج کے دوگروہوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ آزادی کشمیر کے نعرے لگا رہے تھے۔ اور ان کے چہروں پر خوشی کی کیفیت طاری تھی۔ آسمان کی آنکھ نے اس سے پہلے ایسا نظارہ کب دیکھا تھا۔ مجاہدین کا اپنے وطن کی آزادی کے لیے سرِیکف ہونا حب الوطنی ہے۔

اپنے وطن کی آزادی کے لیے لڑنے مرنے والے مجاہد ہوتے ہیں۔ اور یہ قوم کے ہیرو ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جان کی قربانی دے کر اپنے ملک کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے ملک کو اغیار سے آزاد کرواتے ہیں۔ طارق اسما عیل ساگر نے شیرو مجاہد کی داستان کچھ اس طرح بیان کی ہے:

''شیرو کے منہ سے خون آنے لگا تھا۔ اس نے اپنے قریب زمین پر تھوکا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اسے اپنی بزدلی پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ راہ آزادی میں جان سے گزر جانے والے کا بیٹا تھا۔ حریت اور آزادی کے لیے شہادت پا جانے کی آرزو اس کو ورثے میں ملی تھی۔ اس کی ماں نے دم رخصت اس سے کہا تھا'' بیٹا اگر پیٹھ دکھائی تو میں دودھ کی دھاریں نہیں بخشوں گی۔'' اسے اپنی بزدلی پر طیش اور خود سے شرم آنے لگی تھی۔'' (۵۵)

شیرو کو لڑتے لڑتے منہ سے خون آنے لگا تھا۔ اُسے اپنی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ ایک شہید کا بیٹا تھا۔ اُس کی ماں نے اسے کہا تھا کہ اگر اس نے پیٹھ دکھائی تو وہ اسے دودھ کی دھاریں نہیں بخشے گی۔ شیرو کا اپنی جان پر کھیل کر لڑنا وطن سے محبت کی اعلیٰ مثال ہے۔

وطن سے محبت کرنے والے لوگ دشمنوں کی چالوں کو سمجھ جاتے ہیں۔ایسا ہی ایک واقعہ طارق اسماعیل ساگر یوں بیان کرتے ہیں:

یہ واقعہ تقسیم ہندوستان سے پہلے کا ہے۔اُن دنوں قائداعظمؒ نے اپنی رہائش دلی میں رکھی ہوئی تھی۔کچھ لوگوں کا وفد اُن سے ملنے آیا تھا۔اُن میں زیادہ لوگ مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے تھے۔وفد میں ایک مسلمان فوجی افسر بھی تھا۔اُس نے قائداعظمؒ کو بتایا کہ مہاراجہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق نہیں چاہتا۔اُس نے یہ بھی بتایا شیخ محمد عبداللہ بھی مہاراجہ کا ساتھی ہے۔اس واقع میں مسلمان فوجی افسر کی اپنے وطن سے محبت کُھل کر سامنے آتی ہے۔جب کشمیر میں آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو اُس وقت پاکستان کی فوج کا کمانڈر ایک انگریز تھا۔جو نہیں چاہتا تھا کہ پاکستانی فوج کشمیر میں آزادی کی جنگ لڑے۔تاہم جنرل اکبر خان ایک محبّ وطن کمانڈر تھے۔اُن کا واقعہ طارق اسماعیل ساگر نے یوں بیان کیا ہے:

> ''کشمیر میں جنگ آزادی اور مہاراجہ سے نجات کا جو شعلہ بھڑکا تھا،اس کی تپش کو قائم رکھنا ازحد ضروری تھا۔وقت کا تقاضا تھا کہ پاکستانی افواج آگے بڑھیں اور اپنا جائز اور قانونی حق حاصل کر کے رہیں،لیکن قباحت یہ تھی کہ پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف انگریز تھا اور کافی اعلیٰ افسران بھی انگریز ہی تھے،جن سے کسی مدد کی توقع دیوانے کا خواب تھی۔اس سلسلے میں پاکستانی افواج کے جو محبّ وطن افسران جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک کی حفاظت اور کشمیر کی آزادی کے لیے تل گئے تھے،ان کی کمانڈر اسی ''فورسز پارٹیشن کمیٹی'' کے ممبر کے حصے میں آئی،جس نے تقسیم ملک سے پہلے ہی قائداعظمؒ کو اس خدشے سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ تھے سابق میجر جنرل اکبر خان جو بعد میں طارق بن زیادؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کشمیر کی جنگ آزادی میں جنرل طارق کے نام سے مشہور ہوئے۔'' (۵۶)

کشمیر میں جو جنگ آزادی شروع ہوئی تھی اُسے جاری رکھنا بہت ضروری تھا۔اگرچہ انگریز فوجی کمانڈر یہ نہیں چاہتا تھا کہ کشمیریوں کا ساتھ دیا جائے۔تاہم میجر جنرل اکبر خان نے حالات کو سمجھتے ہوئے کشمیر میں جنگ آزادی کا اعلان کر دیا۔اور کشمیر کا بہت زیادہ علاقہ آزاد کرالیا۔کشمیر میں جنگ کرنا وطن سے محبت ہے۔جب کشمیر میں

آزادی کی جنگ شروع ہوگئی تو وزیراعظم لیاقت علی خان نے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا کہ کشمیری مسلمانوں کی بھرپور مدد کی جائے اور آزادی حاصل کی جائے۔ طارق اسماعیل ساگر نے یہ صورت حال یوں بیان کی ہے:

''اسی روز پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خانؒ نے لاہور میں اکابرین ملت کا ایک نہایت اہم اجلاس اس ضمن میں طلب کیا کہ اب اس نئی اور سنگین پیدا شدہ صورتحال سے کیسے نمٹا جائے۔ دیگر بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری نمائندوں کے علاوہ اس اجلاس میں جنرل طارق نے خصوصی شرکت کی۔ کشمیری مسلمانوں کو جبر و استبداد کے نوکیلے پنجوں سے رہائی دلانے والے سرفروشوں کے کماندار نے حکومت کو واضح لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اب عزت سے زندہ رہنے اور کشمیر کو بھارتی مسلح افواج کی دست برد سے محفوظ رکھنے کا صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ ہے جموں پر قبضہ۔''(۵۷)

جب پاکستانی افواج نے کشمیری مجاہدین کے ساتھ جنگ آزادی شروع کر دی تو حکومت پاکستان نے اکابرین ملت کا ایک اجلاس بلا کر رائے لی تو اُس میں یہ طے پایا کہ اب عزت سے زندہ رہنے اور کشمیر کو بھارتی افواج کی تباہی سے بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ بھرپور حملہ کر کے جموں شہر پر قبضہ کر لیا جائے۔ کشمیر میں پاکستانی افواج کا حصہ لینا اور مجاہدین کی مدد کرنا حب الوطنی کی بہت بڑی مثال ہے۔

اللہ میگھ دے (۱۹۸۶ء)

''اللہ میگھ دے'' طارق محمود کا لکھا ہوا ناول ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۸۶ء میں کاروان ادب ملتان کے تحت ہوئی۔ یہ ناول سانحہ مشرقی پاکستان کے رونما ہونے سے قبل کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اور اُن محرکات و اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن کی وجہ سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا۔ مصنف طارق محمود ۱۹۷۱ء سے چار سال قبل مشرقی پاکستان میں تعلیم کے سلسلے میں مقیم رہا اور وہ مشرقی پاکستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی تمدن کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہے۔ ناول نگار نے ان تمام واقعات اور محرکات کا مدلل انداز میں تجزیہ کیا ہے جن کی جہ سے سانحہ مشرقی

پاکستان رونما ہوا۔اس ناول میں وطن سے محبت کے عناصر مختلف جہات اور واقعات کی صورت میں نظر آتے ہیں۔وہ درج ذیل ہیں۔

ناول نگار تعلیم کے سلسلے میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں مقیم رہا اور وہ اپنے اساتذہ کے لیکچرز کی روئیداد بیان کرنا ہے اور بتاتا ہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ بہت محبِّ وطن تھے اور وہ تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے واقعات بڑی غیر جانبداری سے پیش کرتے اور اُن کا تجزیہ بھی بڑے دلنشین انداز سے پیش کرتے۔طارق محمود اپنے مُعلم ڈاکٹر چودھری کے ایک لیکچر کا تذکرہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''ڈاکٹر چوہدھری پولیٹیکل سائنس کی کلاس لینے آئے کانٹی نیوشنل ہسٹری پر اُن کا لیکچر تھا۔ڈاکٹر چوہدھری کئی غیر ملکی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر رہ چکے تھے۔آئینی تاریخ پر درس وتدریس اور تحقیق کا وسیع تجزبہ تھا۔تحریک پاکستان پر بنگالی مسلمانوں کے رول کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کا تھیسز لکھا۔ڈاکٹر چوہدری آئینی بحرانوں پر سیر حاصل بحث کرتے۔کڑیاں آگے پیچھے چلتی رہیں اور پھر ان کی بصیرت تاریخ کے ایک منجمد فریم پر آ کر رُک جاتی۔قرارداد لاہور۔ایک سے زائد ریاستوں کا قیام!ڈاکٹر چوہدری کی گفتگو ڈاکٹر محمود کی نسبت تحقیق کے زیادہ قریب تھی۔سیاسی،تاریخی اور آئینی ارتقاء کی باریکیاں اور اُن کے محرکات چھن چھن کر سامنے آتے۔پھر وہ بنگال کے بارے میں نہایت شدت سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے۔فیڈریشن کی ایسی توضیح پیش کرتے جو شروع شروع میں بظاہر میری سوچ سے باہر تھی۔پروفیسر چوہدری پھر عجب انداز میں تحریک پاکستان کے دنوں کو یاد کرتے۔''(۵۸)

ڈاکٹر چوہدری سیاسیات کے پروفیسر تھے۔پاکستان کی آئینی تاریخ پر تحقیق کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔انھوں نے اپنی پی۔ایچ۔ڈی ''تحریک پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کا کردار'' کے موضوع پر کی تھی۔وہ پاکستان کے آئینی

بحرانوں پر بڑی مُدلل بحث کرتے اور قرارداد لاہور کے بارے میں بتاتے کہ یہ قرارداد شیر بنگال مولوی فضل الحق نے پیش کی تھی۔ بنگالی مسلمان تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے۔لیکن آج بنگال کے حالات کچھ اور تھے۔

۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دونوں آئینوں میں بنگالی مسلمانوں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔اُن کے حقوق کو پامال کیا گیا۔ بنگالی مسلمانوں کے لیے ملازمتوں کے دروازے محدود کر رہے گئے۔جس کی وجہ بنگالی مسلمانوں میں بغاوت کے عناصر پیدا ہونا شروع ہو گئے ہیں۔تاہم ڈاکٹر چوہدری اپنے لیکچرز میں استحکام پاکستان اپنی کلاسوں میں آئینی بحران اور تحریک پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کے کردار کا جائزہ لینا دراصل حب الوطنی ہے۔اپنے وطن سے محبت کرنے والا انسان ہی اپنے کردار اور رویے سے پہچانا جاتا ہے۔ڈھاکہ یونیورسٹی میں طلبہ کے درمیان بحث ہو رہی ہے۔کہ یونیورسٹی میں ایک مخصوص گروہ کو مخصوص مفاداتی گروپ سپورٹ کر رہا ہے۔یہ لوگ عام طلبہ اور اساتذہ کا سکون برباد کیے ہوئے ہیں۔قانون بھی ان کی بدمعاشی پر خاموش ہے۔ہاسٹل اسلحہ خانے بنے ہوئے ہیں اور یہ لوگ اساتذہ کی بھی تذلیل کر دیئے ہیں۔کیا ان تمام واقعات سے حکومتی ایوان اور لاعلم ہیں اگر انھیں پتا ہے تو وہ خاموش کیوں ہیں۔کیا ایسے واقعات کی حکومت خود تو پشت پناہی نہیں کر رہی۔اس بحث کے حوالے طارق محمود یوں رقم طراز ہیں۔

''قاسم بھائی آخر یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔آخر اس کا حل کیا ہے؟''

''یہاں حب الوطنی کے نام پر ایسے عناصر کو اہم فیصلوں اور پالیسیوں کے ساتھ وابستہ کر لیا گیا ہے۔جن کی دل چسپی محض روٹ، امپورٹ لائسنس اور سرکاری ٹھیکوں کے حصول تک محدود ہو چکی ہے۔ پاکستان کے مغربی اور مشرقی حصے کے درمیان شکوک کی دیواریں تانیں کھڑے ہیں۔بنگال کی صحیح لیڈرشپ کو شرف قبولیت بخشنے کے لیے نجانے کیسے کیسے جتن کرنے پڑیں گے۔بنگال کے حقوق کی بات کرنے والے کو نہ جینے دیتے ہیں اور نہ ہی مرنے دیتے ہیں۔۔۔۔میں کہتا ہوں بنگالیوں کے حقوق کی بات تو صدر گھاٹ پر ناریل

بیچنے والا اور بیت المکرّم کی چھاؤں تلے مونگ پھلی بیچنے والا بھی کرتا ہے۔ کیا تمھاری نظر میں ان کی حب الوطنی بھی شکوک ہے۔ بنگال ایک شدید ردِعمل کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ مغربی پاکستان میں جو ترقی ہو رہی ہے۔ اس کے اثرات ہمارے خطہ کے لیے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تو تم بخوبی جانتے ہو۔''(۵۹)

سانحہ مشرقی پاکستان سے قبل نوجوان طلبہ میں احساس محرومی پیدا ہو چکا تھا اور وہ آپس میں بحث مباحثے کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں ایک مخصوص گروپ حب الوطنی کے نام پر اپنے مفادات حاصل کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ وہ صرف اور صرف روٹ پرمٹ، امپورٹ لائسنس اور سرکاری ٹھیکے حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ بنگال کے حقوق پر بات کرنے والوں کو باغی قرار دیا جا رہا ہے۔ مغربی پاکستان میں ترقی ہو رہی ہے۔ جب کہ مشرقی پاکستان میں ترقی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ وہ حالات تھے جو اس وقت پیدا ہو چکے تھے اور یہ بحث مباحثے کالموں اور یونیورسٹیوں میں ہو رہے تھے۔ کہ اگر ان حالات کو ٹھیک نہ کیا گیا تو خدانخواستہ مشرقی پاکستان الگ ہو سکتا ہے۔ یہ واقعات ان نوجوانوں کی حب الوطنی ہے۔ وہ پاکستان سے محبت کرنے والے نوجوان تھے۔ جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ نوجوان فکرمند تھے۔ اگر مشرقی پاکستان کو اُس کے مکمل حقوق نہ دیے گئے۔ تو بہت بڑا سانحہ ہو سکتا ہے۔ ان نوجوانوں کی یہ پریشانی دراصل حب الوطنی ہے جو پاکستان کو متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں جو حالات پیدا کیے جا رہے تھے۔ وہ علیحدگی کی طرف جا رہے تھے۔

''ناول نگار طارق محمود مشرقی پاکستان میں سرحدی علاقوں کی سیر کر رہا ہے۔ وہ پاکستان اور ہندوستان کی چیک پوسٹ پر پہنچتا ہے۔ جہاں پر ایک پتھر دونوں ممالک کی سرحد کی نشاندہی کر رہا تھا۔ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم اور ہندوستان کا ترنگا جھنڈ قدرے فاصلوں پر ہوا۔ میں لہرا رہے تھے۔ پاک بھارت سرحد کے دونوں طرف کسان اپنے کھیتوں میں کام

کرتے دکھائی دیتے۔ جو اپنے روزمرہ کے کام محنت اور مشقت سے کر رہے تھے۔ اُن کے چہرے پسینے سے شرابور تھے۔ اب وہ اس جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں پر پاکستان اور بھارت کے فوجی جوان اپنی اپنی پوسٹوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ اس ماحول کی منظر کشی طارق محمود نے کچھ اس طرح کی ہے۔

دور ہی سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان پاکستان کے سبز ہلالی پرچم تلے ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میں قدرے حیرت میں تھا۔ بنگال میں ایسے قدر قامت کے کم ہی لوگ دکھائی دیتے شاید مغربی پاکستانی تھا۔ رنگت بتا رہی تھی کہ یہیں کہیں سے تھا۔ اس کی مونچھیں بے بہا انداز چہرے پر پھیلی تھیں۔ اس کا چہرہ خاصا مانوس دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ذہن پر کچھ زور دیا۔ یہ تو وہی شخص تھا جو مجھے حضرت شاہ جلال کے دربار کے باہر ملا تھا۔ اس آدمی سے تو میں نے نذیر اسٹیٹ کا راستہ بھی دریافت کیا تھا۔ اس شخص نے کنکھیوں سے دیکھا اور سر ہلانے لگا۔

''آپ کا نام'' میں نے یونہی پوچھا

''فخر الدین، کب سے ہو'' ''سرجب پاکستان بنا تھا۔ بارڈر فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ کبھی میسور کبھی راجشاہی اور کبھی رنگ پور'' گزشتہ ایک برس سے تامابیل کے علاقے میں ہوں'' (۶۰)

ناول نگار مشرقی پاکستان میں پاک بھارت، سرحد پر پہنچتا ہے تو اسے دور ہی سے لمبا تڑنگا نوجوان نظر آتا ہے۔ جو پاکستانی پرچم تلے اپنے عسکری فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ وہ شکل اور قد و قامت سے بنگالی نہیں لگتا تھا۔ لیکن پوچھنے پر پتا چلتا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان ہی کا باشندہ ہے اور وہ قیام پاکستان اب تک بارڈر پر اپنی ڈیوٹی کر رہا ہے۔ اُس کا نام فخر الدین تھا۔ اور وہ بہت چست و چالاک اور محبّ وطن فوجی معلوم ہوتا تھا۔ اس اقتباس میں ناول

نگار کی پاک بھارت سرحد کی سیر اور سرحد پر پاکستانی سبز ہلالی پرچم دیکھنا دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ اُس وقت کے حالات یہ تھے کہ پورا مُلک فوج کی کڑی نگرانی میں تھا۔ عسکری اور دوسرے سرکاری ادارے پوری طرح آرمی کے کنٹرول میں تھے لیکن سول ادارے مثلاً سکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں بنگلہ دیش کی تحریکیں چل رہی تھیں۔

سانحہ مشرقی سے قبل ڈھاکہ یونیورسٹی میں طلبہ کے درمیان سیاسی موضوعات پر بحث ہو رہی ہے کہ مشرقی پاکستان کے وسائل مغربی پاکستان کی ترقی پر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ اور طلبہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ آخر آزادی کے بعد ہمیں کیا ملا۔ نہ تو ہمارے حقوق دیئے جا رہے ہیں ورنہ ہی ہم پر اعتماد کیا جا رہا ہے۔ ہمیں غدار سمجھا جا رہا ہے۔ جب کہ ہم محبّ وطن ہیں۔

قراردادِ لاہور شیر بنگال مولوی فضل الحق ہی نے پیش کی تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد ہمیں ہمیشہ پیچھے رکھا گیا۔ اس بحث کے بارے میں طارق محمود یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ سب ثانوی باتیں ہیں۔ تم دونوں صوبوں کے درمیان بڑھتے ہوئے اقتصادی بعد کے بارے میں کیا کہنا چاہو گے۔ ڈد پیریٹی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ ایک خوفناک احساس ہے۔ جو تم کو اس خطہ کے باسیوں سے بالکل بیگانہ کر دے گا۔ لوگ بھول جائیں گے کہ تم کون تھے۔
>
> زندہ قومیں ہر مسئلے کا حل تلاش کر لیتی ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم لوگ سر جوڑ کر اس گرداب سے نکلنے کی کوشش کریں۔ کیا میں تمھاری طرح یہاں کے المیوں کو اسی شدت سے محسوس نہیں کرتا۔(۶۱)

یہ گفتگو دو یونیورسٹی کے طلبہ کے درمیان ہو رہی ہے۔ اور یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے بارے میں بحث کر رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں مایوسی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہ مایوسی بہت

خطرناک ہے۔اوراس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔مندرجہ بالا اقتباس میں وطن سے محبت کا ایک پہلو یہ ہے۔کہ زندہ تو میں تمام مسائل حل کر لیتی ہیں۔کیا ہم لوگ ان تمام مسائل کا حل نہیں نکال سکتے۔یقیناً ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔دراصل ۱۹۷۱ء سے پہلے علیحدگی کا لاوا پک رہا تھا۔محبّ وطن اور غدار لوگ سب اپنا اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ کیوں کہ دنیا کے ہر مسئلے کا حل نکالا جا سکتا ہے۔اگر مشرقی پاکستان کے حقوق پورے نہیں کیے جا رہے تھے تو بات چیت یا پھر ہڑتالوں اور جلسے جلوسوں کے ذریعے حقوق حاصل کیے جا سکتے تھے۔الگ ریاست بنانا کوئی دانش مندی نہیں تھی۔بہر حال متحدہ پاکستان کے حامی آخر دم تک کوشش کرتے رہے کہ پاکستان نہ ٹوٹے۔پاکستان کو متحد رکھنے والے لوگ ہی محبّ وطن تھے۔

مشرقی پاکستان کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے۔کچھ محبّ وطن لوگ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کا حوالہ دے کر بتا رہے تھے۔کہ یہ قرارداد بنگالیوں نے پیش کی تھی۔اور پاکستان بنانے میں ان کا بہت اہم کردار تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ دونوں حصوں کا اکٹھا رہنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔اسی طرح کی ایک سیاسی بحث کے بارے میں طارق محمود یوں رقم طراز ہیں۔

''آپ اپنے رہنماؤں سے کہہ دو۔ابھی سے مناسب پیش بندی کریں۔بات بہت دور تک نکل جائے گی۔

''گڑبڑ کا اندیشہ ہے۔''

''میرا خدشہ ہے کچھ عناصر علیحدگی پسندوں کے ہاتھ ضرور مضبوط کریں گے۔اس صوبہ میں ابھی تک کیسی کو کھلے عام علیحدگی کا نعرہ لگانے کی جسارت نہیں ہوئی۔لیکن حالات کا رخ دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے۔ہم وقت بڑی تیزی سے گنوا رہے ہیں۔ارباب اختیار کی ذرا سی لغزش ہمیں ایسی صورت حال سے دوچار کر سکتی ہے۔

''صورتِ حال تو سامنے آ چکی ہے''قیوم نے کہا

''تم نہیں جانتے''
میٹنگوں میں ایسے منصوبے کی تفصیلات پر ابھی سے غور وخوض شروع ہو چکا ہے۔
ایسے گروہوں کی حکمت عملی یہی ہے کہ حکومت پر زیادہ سے زیادہ دباؤ رکھا جائے اور ایسے غلط اقدام کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ اگر یہی صورتِ حال جاری رہی تو Parting of ways ہمارے قریب ہوتی جائے گی۔(۶۲)

طارق محمود مندرجہ ذیل اقتباس میں محبّ وطن لوگوں کے درمیان ہونے والی بحث کے بارے میں بتاتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں کچھ عناصر علیحدگی پسندوں کی پوری حمایت کریں گے۔ اگرچہ مشرقی پاکستان میں کسی کو الگ صوبہ بنانے کا نعرہ لگانے کی جسارت نہیں ہوتی۔ تاہم حالات کا تجزیہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ حالات ہاتھ سے نکلتے ہوئے جارہے ہیں۔ اور ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اربابِ اختیار کی ذراسی غلطی ہمٰں بہت دور تک لے جاسکتی ہے۔ علیحدگی پسند اپنی میٹنگوں میں اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ حکومت پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالا جائے اور اسے غلط کام کرنے کے مواقع دیے جائیں۔ دراصل یہ بحث آنے والے وقت کے بارے میں ہے۔ اور یہ بحث دراصل وطن سے محبت ہے۔ یہ لوگ محبّ وطن تھے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی نہیں چاہتے تھے۔ کہ اگر ان حالات پر کنٹرول نہ کیا گیا تو بہت بڑا سانحہ رونما ہوسکتا ہے۔ ان لوگوں کی سوچ حب الوطنی پر مبنی ہے۔

پاکستان جب ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آیا تھا تو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے رہنماؤں نے مل کر کوشش کی تھی۔ اور یہ وطن بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد ہندوستان نے مشرقی پاکستان میں ہندو اساتذہ کے ذریعے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم طلبہ کو مغربی پاکستان کے خلاف اُبھارنا شروع کر دیا۔ اور یہ لاوہ پکتا رہا۔ طارق محمود نے دراصل انہیں حالات کو قلم بند کیا ہے۔ اور ان کے اس ناول ''اللہ میگھ دے'' میں پاکستان کو متحد رکھنے والے افراد محبّ وطن ہیں۔ علیحدگی پسند غدار ہیں۔ پاکستان کو متحد رکھنے والے مسلمانوں کا کردار حب الوطنی پر مبنی ہے۔

''اللہ میگھ دے'' ایک ایسا ناول ہے جس میں سانحہ مشرقی پاکستان سے پہلے کے حالات وواقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مصنف چوں کہ خود ڈھاکہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہا۔ اور اُس دور میں علیحدگی کی تحریکیں اپنے زوروں پر تھیں۔ ناول نگار نے یہ تمام واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور انھیں اپنے الفاظ میں کہانی کی شکل میں بیان کیا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے ان واقعات کو بیان کرنا دراصل حب الوطنی کی بہت بڑی مثالیں ہیں۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی کتاب ''آزادی کے بعد اردو ناول'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ ناول طارق محمود کا سابق مشرقی پاکستان اور اب بنگلہ دیش کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی اتھل پتھل کے حوالے سے مذکورہ بالا موضوع پر لکھے جانے والے ناولوں میں شمار کیا جائے گا۔ اس کی سنِ اشاعت ۱۹۸۶ء ہے۔ ناول میں طلبہ کی اس سیاست کا بیان ہے جو یونیورسٹی کے نیوسیل سے نکل کر سڑکوں پر آ کر حقوق کے مطالبوں پر ختم ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ ایک خون آشام دور کے بعد سقوطِ ڈھاکہ کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ گو کہ ناول میں سقوطِ ڈھاکہ کا بیان نہیں لیکن اس طرف جانے والے کا لُٹے پٹے رستوں کی نشان دہی ضرور کرتا ہے۔'' (۶۳)

ڈاکٹر ممتاز احمد خان کا ناول ''اللہ میگھ دے'' کے بارے میں عمومی رائے ہی ہیکہ اس میں سابقہ مشرقی پاکستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ خصوصاً ڈھاکہ یونیورسٹی کی طلبہ سیاست کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ کہ اُس وقت عوامی لیگ کے طلبہ بھارت کی پُشت پناہی میں علیحدگی کی تحریک چلائے ہوئے تھے۔ اور محبّ وطن طلبہ کو راستے سے ہٹانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ ان طلبہ کو شیخ مجیب الرحمٰن کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اور شیخ مجیب الرحمٰن بھارتی ایماء پر الگ ملک کی تحریک چلائے ہوئے تھا۔ ۱۹۷۱ء سانحہ مشرقی پاکستان سے پہلے عوامی لیگ کے سیاستدانوں نے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کے ذہنوں میں یہ بات پیدا کر دی تھی۔ کہ مغربی پاکستان ہمارے وسائل کھا رہا ہے۔ مغربی پاکستان میں ترقی ہو رہی ہے جب کہ مشرقی

پاکستان میں ترقی کا نام ونشان نہیں ہے۔ جب یہ طلبہ جوان ہوکر یونیورسٹیوں میں پہنچے تو ان کے دُھن پُختہ ہو چکے تھے۔مغربی پاکستان کے خلاف بویا ہوا بیج تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔اور ۱۹۷۱ء سے پہلے کے تین چار سال بہت مشکل حالات تھے چوں کہ طارق محمود اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔اس لیے وہ تمام حالات دیکھ رہے تھے۔عوامی لیگ کے طلبہ کا مکمل کنٹرول تھا۔وہ اپنی مرضی سے یونیورسٹی کے تمام معاملات پر کنٹرول رکھے ہوئے تھے۔اور محبّ وطن طلبہ تنظیموں مثلاً ''اسلامی چھاترو شنگھو'' کے حامی طلبہ پر اکثر تشدد کرتے رہتے تھے اور وہ محبّ وطن طلباء کو قتل کرنے سے بھی نہیں کتراتے تھے۔ بہت سارے محبّ وطن طلبہ قتل کیے جا چکے تھے طارق محمود نے جو دو سالوں میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں دیکھا وہ کہانی کی شکل میں تحریر کر دیا۔طارق محمود کا سانحہ مشرقی پاکستان سے پہلے کے واقعات اور محرکات کا بیان کرنا حب الوطنی کی بہترین مثالیں ہیں۔

اب ناول ''اللہ میگھ دے'' کے بارے میں ایک اور عمومی رائے دیکھتے ہیں۔شاہد نواز اپنی کتاب ''پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ'' میں ''اللہ میگھ دے'' کے بارے میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> ''سقوطِ ڈھاکہ پر لکھے جانے والے ناولوں میں طارق محمود کا ناول ''اللہ میگھ دے'' قدرے منفرد ناول ہے۔ ہر طور پر براہِ راست سقوطِ ڈھاکہ کے حالات و واقعات کی عکاسی کی بجائے اس سانحے کے رونما ہونے والے کچھ عرصہ پہلے کے پس منظر پر مشتمل ہے۔ناول کا پلاٹ، کردار، واقعات اور جزئیات نگاری انتہائی فنی پختگی کا کمال ہے۔ مذکورہ ناول سقوطِ ڈھاکہ پر لکے گئے تمام ناولوں کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر لکھی گئی بہت سی تاریخی دستاویزات سے بھی زیادہ دقیع ہے۔ ہمارے ہاں عمومی طور پا جو ناول لکھے گئے وہ مغربی پاکستان کے پس منظر میں رہنے والے ناول نگاروں نے لکھے۔اور ناول لکھتے وقت کہانی کا پس منظر اور جزئیات لیے ہوئے ہے۔ناول کا مرکزی کردار عمر مغربی پاکستان کا باشندہ ہے۔ مگر وہ جس کہانی کو پیش کر رہا ہے وہ دراصل ان چار سالوں کی کہانی ہے جب وہ مشرقی

پاکستان میں مقیم تھا۔'' (۶۴)

شاہد نواز کی رائے یہ ہے کہ اس ناول میں سقوطِ ڈھاکی کے براہِ راست واقعات کی بجائے پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ کہ آخر اس سانحہ کے پیچھے کون سے ہاتھ تھے۔ کون لوگ پاکستان کے دشمن تھے۔ جو پاکستان کو متحد نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان دنیا کے نقشے پر وارد ہوا تو یہ اسلامی دنیا کی سب سے بری ریاست تھی اور اسلامی دنیا اس ملک کو بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ لیکن چوں کہ انڈین کانگریس آزادی کے بعد اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اسے بہت زیادہ تکلیف تھی کہ آخر پاکستان کیوں بنا۔ پاکستان نہیں بننا چاہیے تھا۔ ہندوؤں نے پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ اور وہ اس دن کا انتظار کر رہے تھے کہ جس دن پاکستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ مشرقی پاکستان میں چوں کہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی اکثریت ہندو تھی۔ اُن ہندوؤں نے مسلمان طلبہ کو مغربی پاکستان کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا۔ طلبہ کی اس طرح تربیت ہوئی کہ جب وہ جوان ہو کر یونیورسٹیوں میں پہنچے تو ان کا دھن مغربی پاکستان کے بارے میں پختہ ہو چکا تھا۔ اور وہ مغربی پاکستان کو اپنا دشمن خیال کرنے لگ گئے تھے اور دوسری طرف ہماری فوج اور سیاستدانوں نے بھی بنگالی مسلمانوں کو نیچ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ بنگالیوں کو اُن کے مکمل حقوق نہیں دیئے جا رہے تھے۔ ملی بجٹ کا زیادہ تر حصہ مغربی پاکستان پر خرچ ہو رہا تھا۔ اور مشرقی پاکستان میں ترقی برائے نام تھی۔ ایک اور واقعہ بھی بڑا مشہور ہوا تھا کہ ایک دفعہ شیخ مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان آئے تو انھوں نے کہا تھا کہ مجھے اسلام آباد کی سڑکوں سے مشرقی پاکستان کی پٹ سن کی خوشبو آ رہی ہے۔ بہر حال یہ بہت سارے محرکات اور پس منظر تھا جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا۔ اور رہی سہی کسر ہمارے سیاستدانوں نے نکال دی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے امتحانات میں بری اکثریتی پارٹی عوامی لیگ تھی۔ اور قانوناً اقتدار عوامی لیگ کے سپرد کیا جانا چاہیے تھا لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور شیخ مجیب الرحمٰن کو حکومت دینے سے انکار کر دیا۔ بھارت اپنا پتا استعمال کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ جب بھٹو نے کہا کہ ''اُدھر تم اِدھر ہم'' تو انڈیا نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان پر حملہ کر دیا۔ بھارت کی بھرپور پلاننگ کی وجہ سے ۲۱ دسمبر

۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور ایک بہت بڑی اسلامی مملکت دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔
طارق محمود نے اپنے ناول ''اللہ میگھ دے'' میں یہ سارا پس منظر بیان کیا ہے۔ کہ آخر کیا وجہ تھی، کیا حالات تھے، ان کے پیچھے کون تھا، طارق محمود کا سقوط ڈھاکہ کا پس منظر بیان کرنا حب الوطنی کا بہت بڑا ثبوت ہے کیوں کہ کوئی محبّ وطن اپنے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔

صدیوں کی زنجیر (۱۹۸۸ء)

ایک معروف مقولہ ہے کہ وطن کے خار بھی پردیس کے پھولوں سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ گھر کا مجموعی ماحول فضا اور موسم یہ ساری چیزیں انسان کے دل و دماغ میں رفتہ رفتہ کچھ اس طرح کے اثرات چھوڑتی ہیں کہ انسان مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور پھر وہ چاہے کہیں بھی چلا جائے گھر کی یادوں کے حصار سے باہر نہیں جا سکتا۔ رضیہ فصیح احمد اس حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> ''گاؤں کا گھر چھوٹا سا مگر خوب صورت تھا۔ باغ میں سیکڑوں درخت اور پودے تھے۔ لگان بلاش کی بیلیں، چنبیلی کے جھاڑ، لیچی، آم اور جامن کے پیڑ، ناریل اور کیلے کے درخت سب رات کی بارش کی مار سے سنبھلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ گھر کے پچھلے صحن کے باہر خادمائیں گہری اودی، نیلی اور سبز کاہی ساڑیاں لپیٹے برتن دھونے، پانی بھرنے اور مچھلی صاف کرنے میں مصروف تھیں۔'' (۶۵)

یہاں پر گھر کی محبت کی بات ہو رہی ہے کہ گاؤں کا گھر اگرچہ بہت چھوٹا لگتا تھا۔ لیکن بہت خوبصورت تھا۔ ایک چھوٹا سا باغ بھی تھا۔ جہاں پر سینکڑوں درخت اور پودے تھے۔ چنبیلی کے جھاڑ، لیچی، آم، جامن کے پیڑ، ناریل اور کیلے کے درخت بارش میں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اپنے گھر سے محبت بھی دراصل وطن سے محبت ہے۔

اردو ناول میں منظر نگاری کے کئی ایسے نمونے ملتے ہیں کہ جن میں کرداروں کے مکالمے حب الوطنی

کی تصویر نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات یہ مکالمے محض تصویریں نہیں رہتیں بل کہ ایک قلم کی طرح متحرک مناظر بن کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ رضیہ فصیح احمد یوں رقم طراز ہیں:

''سنار گاؤں کتنا سندر ہے۔ سچ مچ تمھیں لگے گا جیسے تم شکنتلا ہو اور ظاہر راجا دشنیت ہے۔ سڑک کے دونوں طرف شیشے لگے خوب صورت پرانے گھر ہیں۔ بل کھاتے رنگین ستون اور سرنگوں کی طرح ایک کے بعد ایک کمرہ۔ سڑک سے ذرا سا ہٹ کر ہمارا گھر ہے مگر درختوں میں چھپا ہوا۔ ہمارے جھونپڑے پر دھوپ کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ باشا کے اوپر آم اور جام کے درخت ہیں۔ چاروں طرف کمر نگا، پے پے، پیارا اور جل پائی کے درخت سُرمی چندن کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ سامنے ہرا پوکھر ہے مانو انگوٹھی میں جڑا زمرد۔ وہاں میری ایک میتا (ہم نام) رہتی ہے جس کا باپ مچھلیوں کے جال بنایا کرتا ہے۔ اس کی کوٹھری اور درختوں کے بیچ پھیلے جال سب درختوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ گاؤں کی ہندو عورتیں آرتی اتار کر پھولوں کی پنکھڑیاں اسی پوکھر میں بہاتی ہیں۔ سارا دن مینا، کوئل، طوطے اور چڑیوں کی آواز کہیں نہ کہیں سے آتی رہتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے مقابلے میں ڈھاکا تو مجھے بالکل خشک اور بنجر نظر آتا ہے، جیسے مغربی پاکستان۔'' (۶۶)

مندرجہ بالا پیراگراف میں سنار گاؤں کی بات ہو رہی ہے کہ یہ گاؤں بہت خوبصورت ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پشتوں سے بنے ہوئے خوبصورت گھر بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ سڑک سے زرا دور ہمارا گھر ہے۔ جو درختوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ ہمارا گھر تو ڈھاکہ سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ ڈھاکہ بھی ایسا ہی ہے جسے مغربی پاکستان۔ یہاں پر بھی گھر، مکان اور علاقے سے محبت کا اظہار ہے۔ اور یہ چیزیں بھی وطن سے محبت کا اظہار ہیں۔

قوموں کی زندگی میں کچھ دن ایسے آتے ہیں کہ حب الوطنی کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔ پاکستان میں بھی یوم آزادی اسی جوش وخروش سے منایا جاتا ہے کہ جن کے تحت قوم کا ہر فرد اپنے آپ کو وطن کی محبت کے فروغ کا ذریعہ خیال کرنے لگتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ناول صدیوں کی رنجیر'' میں بھی پاکستان کے ابتدائی دور کے ایک ایسے ہی جشن آزادی کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو!

''۱۴ اگست کا جشن آزادی دیکھنے کے لیے عمر خان اور اکبر خان پشاور چلے آئے۔ آنے والوں کے مسائل بڑے اور گمبھیر تھے۔ ان کو بسانا دو چار دن کی بات نہیں تھی۔ نئے خون نے آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی۔ وہ جشنِ آزادی میں شامل ہونا اور کسی بڑے کام کے بعد آرام کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ پشاور میں تمام بڑے بڑے بازار سبز جھنڈیوں سے سجے ہوئے تھے۔ خصوصاً قصہ خوانی بازار، جہاں ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو انگریز سپاہیوں نے ٹینکوں سے حملہ کیا تھا اور سینکڑوں نہتے لوگوں کو مارا تھا۔ دکانوں پر سبز جھنڈیاں پاکستان کے پھریرے اور برقی قمقمے لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ مفت کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ سرکاری دفاتر پر قومی جھنڈے لہرائے گئے تھے۔ سرکاری عمارتوں پر چراغاں کیا گیا، فوجی لاریاں پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونجتی ادھر سے اُدھر پھر رہی تھیں۔ ریڈیو پشاور قومی نغمے بجا رہا تھا۔ صبح سحری کے وقت تک بازاروں میں اس قدر بھیڑ تھی کہ کھوئے سے کھوا چھل رہا تھا۔ یہ ۲۷ رمضان کی رات تھی۔'' (۶۷)

چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا تھا۔ عمر خان اور اکبر خان پشاور آ گئے تھے۔ وہ جشن آزادی کے پروگرام میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ قصہ خوانی بازار پشاور سبز جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا۔ سرکاری عمارتوں پر چراغاں تھا۔ ہر طرف پاکستان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ یہ ساری صورت حال وطن سے شدید

محبت کا اظہار ہے۔ اور یہی حب الوطنی ہے۔

ایک محبّ وطن شخص کے لیے ترک وطن کا فیصلہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ بل کہ یوں سمجھ لیا جائے کہ ترک وطن میں اُسے اپنی موت نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ناول کا ایک پارا ملاحظہ ہو!

''عمر خان اور اکبر خان گاؤں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے علاقے میں جو چند ہندو اور سکھ گھرانے تھے، وہ جا چکے ہیں۔ البتہ ایک سکھ راج کا بیٹا دلدار سنگھ ابھی موجود تھا۔ اس بات نے خاصی سنسنی پھیلا رکھی تھی، کیوں کہ وہ یہاں رہ پڑنے کی کوئی خاص وجہ نہیں بتاتا تھا۔ کبھی کہتا تھا کہ وہ اپنا گھر فروخت کر کے جائے گا اور کبھی کہتا تھا وہ اس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، آخر یہ اس کا وطن ہے۔'' (۶۸)

جہاں انسان پیدا ہوتا ہے۔ جوان ہوتا ہے۔ اُس علاقے سے اُسے بہت محبت ہو جاتی ہے۔ دلدار سنگھ کا یہاں پر اپنا گھر تھا۔ وہ ہندوستان اس لیے نہیں جانا چاہتا تھا کہ یہ اُس کا اپنا گھر تھا۔ محبّ وطن لوگ ہمیشہ اپنے علاقے اور گھر سے محبت کرتے ہیں۔ دلدار سنگھ کا ہندوستان میں نہ جانا وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ حب الوطنی کے فروغ میں پرنٹ میڈیا کا کردار ہمیشہ کلیدی رہا ہے۔ اخبارات لوگوں کے ذہن بناتے ہیں۔ مفکرین اور قائدین کے ارشادات کی تشریح کر کے عام لوگوں کے ذہنوں تک اُن کی فکر پہنچانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

رضیہ فصیح احمد نے خطبہ آلہ آباد کی توضیح میں ''انقلاب'' اخبار کا تذکرہ یوں کیا ہے:

''علامہ اقبال کے الٰہ آباد کے خطبے کی تائید کرنے والا کوئی اخبار تھا تو یہ ''انقلاب کے بعد اس میں مستقل پاکستان پر مضامین شامل ہوتے تھے جن میں سے اکثر حاکم قلمی ناموں سے لکھے تھے۔ انگریزوں کی مخالفت میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔'' (۶۹)

''انقلاب'' اخبار علامہ اقبال کے خطبے کی تائید کرنے والا واحد اخبار تھا جس میں پاکستان پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ان مضامین میں انگریزوں کے خلاف بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔''انقلاب'' اخبار کا علامہ اقبال کے خطبے کی تائید کرنا دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

قوم کے افراد کے لیے اُن کے رہنما کی موت ایک ایسا شدید دھچکا ثابت ہوتی ہے کہ جس کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا۔قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے عرصے میں قوم کو قیام پاکستان کی منزل سے ہم کنار کیا مگر قیام پاکستان کے ایک سال بعد میں چل بسے اُن کی موت کے واقعہ کو رضیہ فصیح احمد نے یوں بیان کیا ہے:

> ''جن دنوں قائداعظم کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح نہیں بلکہ آہستہ آہستہ پھیلی تھی۔دیہاتوں اور دور دراز کے علاقوں میں لوگ اس خبر پر یقین کرنا نہیں چاہتے تھے۔جب کرتے تھے تو اس سے ہراس پھیلتا تھا۔اب کیا ہوگا؟ جیسے بہت بڑا غم تھا جیسے سارا سائبان نیچے آ گرا ہو۔''(۷۰)

قائداعظم محمد علی جناحؒ پاکستان کے بانی اور مسلمانوں کے عظیم رہنما تھے۔۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قوم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اگلے جہان سدھار گئے۔ لوگوں کو قائد کی وفات کی خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔لوگ کہتے اب پاکستان کا کیا ہوگا؟ یہ پاکستانی قوم کے لیے بہت بڑا غم تھا۔ پاکستان قوم کا قائداعظمؒ اور اُن کی وفات پر غم کا اظہار دراصل وطن سے محبت ہے۔

نادار لوگ (۱۹۹۶ء)

نادار لوگ عبداللہ حسین کے آزادی اور اس کے بعد لکھے گئے ناولوں میں ایک ہے۔عبداللہ حسین جیسے ناول نگار اپنے علم سے انصاف کرتے شاہکار ناول لکھتے ہیں۔حب الوطنی کی مختلف جہتوں کے ساتھ

انصاف کرتے ہوئے ناول نگار نے انتہائی خوبصورتی سے گاؤں کی محبت، اس کے گلی کوچوں کھیت کھلیانوں سے محبت کو بیان کیا ہے۔ اس میں وہ ایسے ہی ایک شخص یعقوب کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ آغاز میں وہ یوں تعارف کرواتے ہیں۔

''سب سے پہلے اسے اپنے آبائی گاؤں کا ایک رخ نظر آیا۔ یہ گاؤں کا ماتھا تھا جس کے ساتھ اس کی گہری اور طویل آشنائی تھی کہ اس طرف اس کے کھیت پڑتے تھے۔ صبح اور شام، اپنی پچاس سالہ زندگی کے ایک ایک دن .....صرف جنگ کے تین سال چھوڑ کر..... یعقوب اعوان نے کھیتوں سے گھر کو لوٹتے ہوئے گاؤں کا یہ رخ دیکھا تھا۔ یہ رستہ اس کے اپنے گھر کی مانند تھا جہاں اسے نظر کی حاجت نہ ہوتی تھی۔ گھپ اندھیرے میں وہ اندر اور باہر چل پھر سکتا تھا۔ بستر مرگ پر سب سے اول اسے یہ منظر دکھائی دیا جس کی کچی دیواروں کا نقشہ ایک جھلی کی مانند اس کے دماغ پہ پھیلا تھا۔ یعقوب اعوان پچاس برس کی عمر کو پہنچا تھا کہ وہ گاؤں جس میں وہ پیدا ہوا تھا اس سے چھٹ گیا تھا۔ پچھلے آٹھ برس کے عرصے میں اس نے اپنے گاؤں کی یہ شکل صرف ایک بار دیکھی تھی، اور وہ بھی محض ایک رات کے اندھیرے میں۔ چوروں کی مانند، تاریکی کے اندر وہ اس گاؤں میں داخل ہوا تھا جو اب ایک مختلف سرزمین پہ کھڑا تھا، اور راتوں رات نکل آیا تھا۔ اس گمشدہ منظر کے ساتھ یعقوب اعوان کے سامنے پھر اپنے باپ کا چہرہ ابھرنا شروع ہوا۔''(۱۷)

یعقوب اعوان نے پچاس سال اس گاؤں میں گزارے ہیں اور اب جب وہ واپس آیا ہے تو رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح۔ اور آج اسے اپنا گاؤں بالکل مختلف لگا۔ حب الوطنی یعنی اپنے وطن اپنے گاؤں سے انیست اور لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ اندھیرے میں اسکی گلیوں میں چل سکتا تھا مگر شومئی قسمت

کہ آج اسے آٹھ سال کے ہجر کے بعد یوں آنا پڑا۔

تقسیم کے بعد یعقوب کو احساس ہوا کہ وہ گاؤں جو اس کا اپنا تھا اب وہ ایک دوسرا ملک بن چکا تھا۔ جہاں اس کا جانا ناممکن تھا۔ اب یہاں اس نے قدم جمانے کی غرض سے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ کچھ ہی عرصے کے تگ ودو کے بعد اسے شجاع آباد میں بارہ ایکڑ زمین الاٹ ہوگئی۔ اور ساتھ ہی ایک ٹوٹا پھوٹا گھر بھی مل گیا۔ عبداللہ حسین رقمطراز ہیں:

''بٹوارے کے تین ہی ماہ کے بعد جب اس کے دل میں یقین ہوگیا کہ بیس میل دور اس کا آبائی گاؤں ایک دوسرا ملک تھا جہاں اس کا واپس جانا ناممکن ہو چکا تھا، یعقوب اعوان نے قدم جمانے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی۔ چھ ماہ کے اندر اسے نور پور کے قریب موضع شجاع آباد میں ساڑھے بارہ ایکڑ زمین اور ایک ٹوٹا پھوٹا گھر الاٹ ہوگیا تھا۔''(۷۲)

یعقوب کو پہلے ہی ہجر کا صدمہ تھا اور اب وہ گاؤں جس میں اس نے اپنی ساری زندگی گزاری تھی صرف ۱۲ کوس دور تھا مگر اب کسی اور ملک کا حصہ۔ یہ درد صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو خود کسی ہجر اور وصال کے دور سے گزرا ہو۔ اب یعقوب نے یہاں قدم جمانے کے لیے کوششیں کیں تو اسے ساڑھے بارہ ایکڑ زمین اور ایک گھر الاٹ ہوگیا تھا۔

ایک اور کرب کی داستان سرفراز اور اعجاز کی تھی۔ جو ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے ہیں۔ سرفراز آٹھ سال کا ہوگیا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو یاد کرتے روتا ہے تو اعجاز اسے حوصلہ دیتا ہے۔ پھر روتے ہوئے سرفراز قومی ترانہ گنگنانے لگتا ہے جو وہ روز اسکول میں پڑھتے تھے۔ سرفراز اسے گھر پر ہی گاتا رہتا تھا۔ اس صورت حال کو ناول نگار یوں قلم بند کرتے ہیں:

''اب سو جاؤ۔ شاباش، اعجاز اس سے متواتر باتیں کر رہا تھا۔ تم تو اب بڑے

ہو گئے ہو۔کل تم آٹھ سال کے ہو گئے تھے۔کل میں نے مٹھائی لے کر دی تھی ناں؟ تم اب جوان ہو گئے ہو۔آج پاکستان کی سالگرہ بھی ہے۔ پاکستان بھی آج آٹھ سال کا ہو گیا ہے تم پاکستان سے بڑے ہو۔تمہیں پتا ہے،تم پاکستان سے پورا ایک دن بڑے ہو، دیکھا؟ بڑے آدمی نہیں رویا کرتے۔ چلو اب سو جاؤ..... شاباش.....''

اعجاز کو اور کچھ نہ سوجھا تو قومی ترانہ گنگنانے لگا۔ یہ سرفراز کو بھی زبانی یاد تھا۔ ہر روز صبح سویرے،سکول لگنے سے پہلے ،ساری جماعتیں میدان میں جمع ہو کر،اور اگر بارش ہو تو سکول کے برآمدوں میں،سارے ماسٹروں سمیت،سب مل کر قومی ترانہ گایا کرتے تھے،اور سرفراز اکثر اسے گھر پہ بھی گاتا رہتا تھا۔

پاک سرزمین شاد باد　　کشور حسین شاد باد

تو نشان عزم عالی شان　　ارض پاکستان

مرکز یقین شاد باد..... ''　　(۷۳)

قومی ترانہ اعجاز اور سرفراز پڑھتے ہیں کیوں کہ پاکستان کی سالگرہ ہے اور سرفراز کی بھی۔ جب سرفراز روتا ہے تو اعجاز اسے کہتا ہے کہ تم پورے ایک دن پاکستان سے بڑے ہو اور بڑے آدمی رویا نہیں کرتے۔عبداللہ حسین کے ناولوں میں حب الوطنی اور ہجر کی داستانیں یوں مدغم ہیں کہ قاری خود کو اس کرب سے گزرا ہوا محسوس کرتا ہے۔

شجاع آباد کے سکول کو ہائی اسکول کا درجہ دے دیا گیا ہے اور سرفراز اور اعجاز وہیں سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔اسکول کے بارے میں ناول نگار یوں لکھتے ہیں:

''شجاع آباد کا میونسپل پرائمری سکول سن باون سے مڈل سکول کا درجہ اختیار کر چکا

تھا۔ ہیڈ ماسٹر محمد نواز چیمہ ایک پرانے استاد اور منشی فاضل کے ذریعے سے، بی۔ اے کے ڈگری یافتہ تھے۔ بارہ بجے کے قریب انہوں نے اردو، حساب اور ڈرائنگ کے ماسٹر محمد اعجاز اعوان کو، جو اپنی تعلیم اور طوالت ملازمت کے لحاظ سے غیر رسمی طور پر سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تصور کئے جاتے تھے، اپنے دفتر میں طلب کیا۔ ہیڈ ماسٹر محمد نواز چیمہ ایک نہایت تجربہ کار، ہوشیار اور وضعدار آدمی تھے۔ سکول میں سخت انتظام رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماسٹروں سے شفقت کا سلوک روا رکھتے تھے۔ انہوں نے اعجاز کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا۔'' (۷۴)

ہیڈ ماسٹر محمد نواز چیمہ ایک پرانے استاد تھے محمد اعجاز اعوان سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تصور کئے جاتے تھے۔ نواز چیمہ ایک تجربہ کار اور وضع دار استاد تھے۔ اسکول میں سخت انتظام رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اساتذہ سے ہمدردانہ سلوک رکھتے تھے۔ ناول نگار اسکول کی یادوں کو بیان کرتے ہیں۔ اپنے سکول اور اساتذہ کی تادبھی دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

اعجاز اور سرفراز اب اپنی اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں مصروف ہیں مگر ان کی دوستی قائم ہے۔ سرفراز اپنی یونٹ واپس پہنچتا ہے تو اعجاز کو خط لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اسے لکھتا ہے کہ کچھ لوگ مہمان بن کر گاؤں آ رہے ہیں وہاں ان کے لیے تمام سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ وہ تمام انتظامات کی تفصیل لکھتا ہے۔ ان تمام انتظام کی تفصیل عبداللہ حسین نے اس طرح بیان کی ہے:

''سرفراز واپس اپنی یونٹ میں پہنچا تو اس کے دل میں ایک ہی خیال تھا۔ گو دو ہفتے کے بعد وہ ایک دن کی چھٹی پہ گھر جانے والا تھا، مگر کیفیت یہ تھی کہ اس وقت تک انتظار کرنا اس کے لئے محال ہو چکا تھا۔ آتے ہی وہ اعجاز کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ نو دس مہینے میں، اس نے لکھا، اس کے کچھ دوست احباب مہمان بن کر گاؤں آنے والے

تھے۔ گھر کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اگر سارا گھر پکا نہیں بن سکتا تو کم از کم صحن اور باہر کی دیواروں پر اینٹیں چنوائی جانی چاہئیں۔'' (۷۵)

ناول نگار اس قدر خوش اسلوبی سے حالات و واقعات بیان کرتے ہیں کہ گویا اس ماحول میں رہ کر اور اس دور سے گزر کر آ رہے ہیں۔ عبداللہ حسین انتہائی حساس طبیعت کے مالک تھے اور ہجرت نے ان کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا ہے کہ ان کی تصانیف میں برملا ملک، گاؤں جگہوں اور یادوں سے محبت کا اظہار ملتا ہے۔

قیام پاکستان کے ساتھ بہت سے لوگ ایسے بھی اس پاک دھرتی پر آئے تھے جو پاکستانیت کا لبادہ اوڑھے ہندوستان کے مفادات کا تحفظ کرنے آئے تھے۔ انہیں بہت سے لوگوں میں ایک کردار بدرالدین بھی تھا۔ بدرالدین کے ساتھ پاک فوج کے افسر سے مکالمے کو عبداللہ حسین نے یوں بیان کیا ہے:

''ہمارے کوئی مسائل نہیں ہیں،'' عقب سے ایک افسر نے جذباتی آواز میں کہا۔

''صرف ایک مسئلہ ہے، کہ ہندوستان نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا، جس کا ثبوت آج مل چکا ہے۔ اور اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے آپ جیسے منافقوں کی خدمات خریدی جا رہی ہیں۔ بدرالدین چوہدری کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ایک گارڈ دھمکی آمیز انداز میں بولنے والے افسر کی جانب بڑھا، جس کو اس کے دوسرے ساتھیوں نے کھینچ کر بٹھا دیا۔ بدرالدین نے کچھ کہنا چاہا، مگر ایک دو بار ہکلا کر رہ گیا۔ وہ دوبارہ بات شروع کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار ہی کر رہا تھا کہ افسروں کے مجمعے میں جگہ جگہ سے ''غدار، ٹریٹر، گو بیک،'' کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ گارڈ مستعد ہو گئے۔ انہوں نے صورت حال جانچ کر بدرالدین کو نرغے میں لیا اور اسے واپس لے چلے۔ ان کے جانے بعد پندرہ بیس افسر غصے کی حالت

میں میدان کے اندر کھڑے باتیں کرتے رہے، پھر بکھر کر اپنی اپنی بیرک میں چلے گئے۔ ''(۷۶)

حب الوطنی کے جذبے سے سرشار فوجی افسر غدار بدرالدین چوہدری کو برا بھلا کہتا ہے اور کہتا ہے کہ تم جیسے لوگ ملک کی جڑوں کو کاٹتے ہیں۔تم غدار ہو اور ملک سے غداری کر کے ہندوستان سے وفاداری کر رہے ہو۔

سقوط ڈھاکہ لوگوں کے دلوں پر گہرے اثرات مرتب کر گیا۔ان گنت سوال آج بھی جواب کے منتظر ہیں۔ وہ کونسی وجہ تھی کہ جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کو الگ ملک بنایا گیا۔ پاکستان کو دولخت کیا گیا۔ ان تمام وجوہات کو جانچنے کے لیے سپریم کورٹ کا ایک بینچ تشکیل دیا جاتا ہے۔اس کی تفصیل عبداللہ حسین نے اس طرح بیان کی ہے:

''پاکستان کے دو ٹکڑے کیوں کر ہوئے؟ وہ کون سی وجوہات تھیں جن کی بناء پر پاکستانی فوج کو مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے پڑے؟ ان وجوہات کا تعین کرنے کی خاطر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے سمیت تین سینئر ترین ججوں پر مشتمل ایک کمیشن آف انکوائری مقرر کی گئی۔ اپنی تفتیش اور تحقیق کے طور پر کمیشن اس فیصلے پر پہنچی کہ یہ محض ایک عسکری شکست نہ تھی بلکہ ایک سیاسی اور اخلاقی ہار تھی۔ دو مارشل لاؤں کے دوران پاکستان کے فوجی حکمران اخلاقی طور پر اس قدر گر چکے تھے اور اتنے بدعنوان ہو چکے تھے کہ ان میں جنگ لڑنے کی سکت نہ تھی۔''(۷۷)

کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ اخلاقی گراوٹ اس وقت شروع ہوئی جب افسران انیس سو اٹھاون کے مارشل لاء کی انتظامیہ میں ملوث ہو گئے۔اس صورت حال پر اس وقت انتہائی شکل اختیار کر لی جب مارچ ۱۹۶۹ء میں جنرل یحیٰی خان نے دوسرا مارشل لاء نافذ کر دیا۔کمیشن کی رائے میں مشرقی پاکستان

کے اندر حالات اس وقت سنگین نوعیت اختیار کر گئے جب پچیس مارچ کو یحییٰ خان نے وہاں ملٹری ایکشن شروع کر دیا۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے محرکات کا جائزہ لینا وطن سے محبت کا ثبوت ہے۔

سرفراز کو اپنا گاؤں یاد آتا ہے۔ وہ بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ اور اپنی ٹانگیں اور بازو زور سے ہلانے لگتا ہے۔ اسے اپنی وردی اور حیثیت کا خیال نہیں رہتا پھر اچانک اسے خیال آتا ہے کہ وہ اپنے دفتر میں موجود ہے۔ مگر وہ اس چیز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوبارہ کھو جاتا ہے۔ عبداللہ حسین لکھتے ہیں:

> ''اس کے دل میں مسرت کا ایک طوفان تھا جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ چند منٹ تک یہی حرکت کرتے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مانوس منظر ابھر آیا۔ گاؤں میں گدھے اپنے گاڑیاں کھینچنے سے آزاد ہو کر یوں مٹی میں لوٹتے ہوئے چاروں ٹانگیں اٹھائے خوشی سے انہیں ہوا میں چلایا کرتے تھے۔ سرفراز بے اختیار ہنس پڑا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ گدھے کی مانند ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا شروع کر دے۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ یہ اس کا دفتر تھا۔ ایک لحظہ کے اندر وہ اپنی دنیا میں واپس پہنچ گیا۔ اسے اپنی حرکات پر ذرہ برابر شرمندگی کا احساس نہ ہوا، صرف اپنی حیثیت کا خیال آیا۔ اس نے اپنی وردی پہ لگی گرد کو جھاڑا، دروازے پہ جا کر ہولے سے چٹخنی اتاری، اور ایک پٹ وا کر کے واپس اپنی کرسی پہ آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس چند منٹ کے وقفے کے دوران کسی نے اس کا دروازہ نہ کھٹکھٹایا تھا۔''(۷۸)

سرفراز وردی پہنے ہوئے اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا ہے اور بہت خوش ہے۔ اسے اپنے گاؤں کا قدرتی منظر یاد آ رہا ہے جہاں پر گدھے آزاد ہو کر اپنی تھکاوٹ دور کر رہے ہیں۔ سرفراز کو اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس اپنی دنیا میں آ جاتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اُسے کسی نے دیکھا

نہیں ۔گاؤں اوراس کے منظر سے محبت بھی وطن دوستی ہے ۔

اس باب میں ۱۹۷۱ء سے لے کرسن ۲۰۰۰ء کے ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کی عکاسی کی گئی ہے ۔عبداللہ حسین کے ناولوں باگھ،نشیب ، بانو قدسیہ کے ناولوں راجہ گدھ، خدیجہ مستور کے ناول زمین ،، انتظار حسین کے ناول بستی ،عبداللہ حسین کے ناول نادارلوگ میں سے حب الوطنی کے حوالے سے لکھے گئے اقتباسات کی وضاحت کی گئی ہے ۔

اس دور کے ناولوں میں حب الوطنی کا ایک الگ اورمنفرد تناظر اور جہت نظر آتی ہے اسی دور میں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ بھی پیش آیا اسی وجہ سے اس دور کے ناولوں میں ایک الگ حب الوطنی کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس کے باوجود قیام پاکستان کے بعد کی صورتحال اور پیچھے رہ جانے والی یادیں ان ناولوں پر غالب رہی ہیں ۔

باگھ اگرچہ ایک رومانوی داستان ہے ۔اس کے بغر مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ پاکستان سے محبت کے تناظر میں لکھا گیا ہے ۔اس باب میں حب الوطنی کی جو جہات سامنے آئیں ہیں ۔ان میں اپنے ملک سے محبت ،گھر کی یاد، دوست احباب کو یاد کرنا ، وطن کی محبت میں سب کچھ چھوڑ کر مشن کے لیے نکلنا اور بیرون ملک مقیم لوگوں کا وطن کے لیے درد اوراحساس حب الوطنی کی مثالیں ہیں ۔

قبل اس کے کہ اس دور کے اہم ارتقائی مراحل کا ذکر کیا جائے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس دور کی کیا فکری جہتیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر اس صدی کی آخری تین دہائیوں کے ادب کی بنیاد رکھی گئی ۔ چند محرکات اور واقعات بھی اہم ہیں جو اس دور میں رونما ہوئے ۔ان واقعات میں سب سے نمایاں واقعہ ۱۹۷۱ کی پاک بھارت جنگ ہے جس کے نتیجے میں نوے ہزار کے قریب پاکستانی فوجی اورسویلین ہندوستان کی قید میں گئے اور پاکستان کا ایک بازو کٹ گیا ۔اسی عرصے میں پاکستان میں جمہوریت فروغ پذیر ہوئی اور جلد ہی اُس کو مارشل لاء کے شکنجے میں جکڑ لیا ۔ مارشل لاء کا یہ سلسلہ ایک دہائی کو محیط رہا اور پھر جمہوری حکومتوں

کے آنے جانے کا سلسلہ چل پڑا۔ محلاتی سازشوں کے زیر اثر اسمبلیاں ٹوٹتی رہیں اور اس دور کے آخری دو سالوں میں ایک دفعہ پھر پاکستان کو مارشل لاء کا منہ دیکھنا پڑا۔

یہ تمام محرکات اور اسباب حب الوطنی سمیت ادب کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوئے اور جو ادب تخلیق کیا گیا اس کو اگر حُب الوطنی کے زاویے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں پاکستان کی سلطنت کے دولخت ہونے کا تذکرہ، خوابوں کے ٹوٹنے کی صورت میں نظر آتا ہے۔ مارشل لاء کے زیر اثر اردو ناولوں میں بغاوت کا ایک عنصر بھی شامل ہے اور ردعمل کی بھی کیفیت موجود ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی وہ مجموعی حُب الوطنی جو سارے ہندوستان کو گھیرے ہوئے تھی اور ۱۹۴۷ء میں جس نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی صورت میں اپنا اظہار کیا وہ اب ایک محدود صورت میں صرف مغربی پاکستان تک منطبق ہو کر رہ گئی تھی۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس ملک کے لاکھوں باشندوں نے روزگار کے لیے دنیا کے دیگر ممالک کا سفر کیا۔ مقامی افراد کی معاشی حالت تبدیل ہونے لگی اور ان کے افکار میں جدید عالمی خیالات و افکار میں جدید عالمی خیالات و افکار آنے لگے یہی وجہ ہے کہ جب ہم اس دور کے اردو ناولوں کے کرداروں کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ گذشتہ دور کے ناولوں سے فکری وسعت کے اعتبار سے زیادہ نمایاں ہیں۔

اس دور کے منتخب ناولوں میں راجہ گدھ، زمین، نادار لوگ، وادی لہورنگ، چلتا مسافر، صدیوں کی زنجیر، جنت کی تلاش، پریشر ککر اور جانگلوس وغیرہ شامل ہیں۔ ان ناولوں میں وطن سے محبت کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ یہ رنگ مختلف کرداروں اور واقعات کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً راجہ گدھ میں خطہ پوٹھوار، گاؤں چندرا، منٹگمری ہال اور سندھ طاس کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہ تمام جہات دراصل پاکستان سے محبت کا اظہار ہیں کیوں کہ انسان جس علاقے میں پیدا ہوتا ہے اور جہاں جہاں سفر کرتا ہے۔ اُن

علاقوں سے محبت ایک فطری چیز ہے۔

ان ناولوں میں حُب الوطنی کی جو تصویر سامنے آتی ہے ان میں نفسیاتی مسائل کا بھی تذکرہ ہے زمین کی محبت کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔ گاؤں اور شہر کی زندگی کے کئی مناظر دکھائی دیتے ہیں پریشر ککر کی صورت میں ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے فنکاروں پر کیا گزری۔ ان ناولوں میں مختلف طرح کے مناظر کی عکس بندی کی گئی ہے جس میں وادی لہور نگ کے تذکرے بھی موجود ہیں۔ ان ناولوں میں فرد، گھرانے، خاندان اور معاشرے کے تمام افراد کو درپیش آنے والے حالات و واقعات کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

ان ناولوں میں حُب الوطنی کے عناصر کی جو تشخیص ہوئی ہے وہ حُب الوطنی اب مختلف مراحل سے گزر کر ایک خاص رنگ میں ڈھل چکی ہے۔ اُس رنگ کو تمام ناول نگاروں نے اپنے اپنے رنگ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ فکری اعتبار سے چوں کہ معاشرے کے تمام ادیب ایک عہد کی لڑی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن میں بہت سے فکری پہلو مشترک ہوتے ہیں۔ اس دور میں ناول نگاروں کے مشترک فکری پہلوؤں کی شناخت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سنجیدگی، بغاوت، وسعت اور کرب کی کیفیات کے باوجود حب الوطنی کی جہت نمایاں نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رحیم گل، جنت کی تلاش، رابعہ بک ہاؤس، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۸۷

۲۔ ایضاً، ص۔ ۱۰۲

۳۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص۔ ۲۲

۴۔ ایضاً، ص۔ ۵۱

۵۔ ایضاً، ص۔ ۵۵

۶۔ ایضاً، ص۔ ۸۷

۷۔ ایضاً، ص۔ ۸۹ تا ۹۰

۸۔ ایضاً، ص۔ ۱۰۰

۹۔ ایضاً، ص۔ ۲۸۵

۱۰۔ عبداللہ حسین، باگھ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۔ ۹

۱۱۔ ایضاً، ص۔ ۲۲ تا ۲۳

۱۲۔ ایضاً، ص۔ ۲۰۵

۱۳۔ ایضاً، ص۔ ۲۲۸

۱۴۔ ایضاً، ص۔ ۲۳۹

۱۵۔ ایضاً، ص۔ ۲۷۴

۱۶۔ شوکت صدیقی، جانگلوس، رکتاب پبلی کیشنز گلستان جوہر کراچی، جولائی ۲۰۱۳ء، ص۔ ۱۴

۱۷۔ ایضاً، ص۔ ۳۴۰

۱۸۔ ایضاً، ص۔ ۳۷۸

۱۹۔ ایضاً،ص۔۵۲۷

۲۰۔ ایضاً،ص۔۵۶۳

۲۱۔ سلمیٰ اعوان،تنہا،دوست پبلی کیشنز اسلام آباد،۲۰۰۹ء،ص۹

۲۲۔ ایضاً،ص۱۱

۲۳۔ ایضاً،ص۴۳

۲۴۔ ایضاً،ص۴۵

۲۵۔ ایضاً،ص۵۶

۲۶۔ ایضاً،ص۵۶تا۵۷

۲۷۔ ایضاً،ص۱۳۲

۲۸۔ ایضاً،ص۱۸۶

۲۹۔ ایضاً،ص۱۹۶

۳۰۔ ایضاً،ص۲۰۳تا۲۰۴

۳۱۔ ایضاً،ص۲۵۲

۳۱۔ ایضاً،ص۲۹۶

۳۲۔ ایضاً،ص۳۶۹

۳۳۔انور سدید،ڈاکٹر،اردو ناول کے رنگ،لاہور،مقبول اکیڈمی،۲۰۱۴ء،ص۱۹۸تا۱۹۹ء

۳۴۔ خدیجہ مستور،زمین،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۰،ص۸

۳۵۔ ایضاً،ص۔۲۰

۳۶۔ ایضاً،ص۔۳۳

۳۷۔ ایضاً،ص۔۹۶ تا ۹۷

۳۸۔ ایضاً،ص۔۱۸۲

۳۹۔ ایضاً،ص۔۱۲۹

۴۰۔ الطاف فاطمہ،''چلتا مسافر''، جمہوری پبلی کیشنز ایوان تجارت روڈ لاہور، ۲۰۱۶ء،ص۔۲۴

۴۱۔ ایضاً،ص۔۲۵

۴۲۔ ایضاً،ص۔۵۸

۴۳۔ ایضاً،ص۔۲۸۲

۴۴۔ ایضاً،ص۔۲۸۳

۴۵۔ ایضاً،ص۔۲۸۶

۴۶۔ صدیق سالک، پریشر کُکر، الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، جنوری ۲۰۱۳،ص ۱۱۸

۴۷۔ ایضاً،ص۔۱۲۰

۴۸۔ ایضاً،ص۔۱۲۱

۴۹۔ ایضاً،ص۔۱۵۸

۵۰۔ ایضاً،ص۔۲۹۲

۵۱۔ ساگر طارق اسماعیل، وادی لہورنگ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ،۴۰ اردو بازار لاہور،۱۹۸۴ء،ص۔۱۹

۵۲۔ ایضاً،ص۔۲۳

۵۳۔ ایضاً،ص۔۳۱

۵۴۔ ایضاً،ص۔۴۰

۵۵۔ ایضاً،ص۔۱۲۰

۵۶۔ طارق محمود،اللہ میگھ دے،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۸ء،ص۱۷

۵۷۔ ایضاً،ص۱۷۰تا۱۷۱

۵۸۔ ایضاً،ص۱۹۵

۵۹۔ ایضاً،ص۲۰۹

۶۰۔ ایضاً،ص۲۵۴

۶۱۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،آزادی کے بعد اردو ناول،انجمن ترقی اردو پاکستان،گلشن اقبال کراچی،۲۰۰۸ء، ص۲۷۵

۶۲۔ شاہد نواز، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ،شعبہ اردو،سرگودھا یونیورسٹی سرگودھا،۲۰۱۸ء،ص۱۹۰

۶۳۔ رضیہ فصیح احمد،صدیوں کی زنجیر،اکادمی بازیافت،کراچی،سن اشاعت ۲۰۰۵ء،ص۔۷۰تا۷۱

۶۴۔ ایضاً،ص۔۱۰۸

۶۵۔ ایضاً،ص۔۳۲۲

۶۶۔ ایضاً،ص۔۳۲۸

۶۷۔ ایضاً،ص۔۳۲۹

۶۸۔ ایضاً،ص۔۳۳۵

۶۹۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۴ء،ص۴۵

۷۰۔ ایضاً،ص۔۱۷

۷۱۔ ایضاً،ص۔۹۷

۷۲۔ ایضاً،ص۔۹۴

۷۳۔ ایضاً،ص۔۳۴۹

۷۴۔ ایضاً،ص۔۴۶۵

۷۵۔ ایضاً،ص۔۷۳۷تا۷۳۸

۷۶۔ ایضاً،ص۔۷۴۴

باب چہارم:
تیسرا دور (۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۵ء) کے منتخب ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر

الف:

اکیسویں صدی کے آغاز کا سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامہ

اکسویں صدی کے شروع میں ہی دنیا میں نئی بحث چھڑ گئی اور دہشت گردی کا نیا لفظ زبان زد عام ہو گیا۔ امریکہ کے ٹریڈ ٹاور پر ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو حملہ کیا گیا جس کے نتیجے میں بہت زیادہ تباہی ہوئی اور پوری دنیا میں دہشت گردی عام ہو گئی۔ سیاسی طور پر بین الاقوامی سطح پر بہت سی تبدیلیاں ہوئیں اور نئے اتحاد بنے۔ اسی دہشت گردی کی وجہ سے امریکہ کو اپنی مرضی کے ممالک پر حملے کا جواز مل گیا اور امریکہ طاقت کی دوڑ میں سرفہرست ہو گیا۔

امریکہ میں دہشت گردی کے واقعہ نے تمام ممالک کے سماجی و سیاسی شعور کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ سماجی و سیاسی منشور اسلامی ممالک کے لیے دردسر بن گیا۔ دنیا کے تمام مسلمانوں کو دہشت گرد کہا جانے لگا اور مسلم ممالک دہشت گردوں کی پناہ گاہ تصور ہونے لگے۔ اس تمام تر صورت حال سے پاکستان براہِ راست متاثر ہوا۔ پاکستان پر امریکہ اور دیگر عالمی طاقتوں نے مل کر دباؤ ڈالا اور پاکستان سے فوجی اڈے لے کر افغانستان پر حملے شروع کر دیئے۔ کل کے طالبان جو محبّ وطن تھے اور امریکہ ان کا سرپرست تھا۔ آج وہی طالبان امریکہ کو خطرہ محسوس ہونے لگے اور ٹریڈ ٹاور کے واقعہ کو بنیاد بنا کر امریکی فوجیں افغانستان پر حملہ آور ہو گئیں اور افغانستان ایک بار پھر بارود اور خون میں نہا گیا۔ اس جنگ کا گہرا اثر ایک بار پھر پاکستان کی معاشی، سماجی اور سیاسی حیثیت پر پڑا۔ دنیا کے دوسرے بڑے ممالک اور امریکہ نے پاکستان سے غیر مشروط تعاون کا مطالبہ کر دیا۔

افغانستان میں ابھی جنگ جاری تھی کہ طاقت کے نشے میں مدہوش امریکی صدر بش نے عراق پر بھی حملہ کر دیا اس طرح جنوب اور مشرق وسطیٰ میں بدامنی پیدا ہو گئی۔ امریکہ نے عراق پر اس امکان پر حملہ کیا کہ عراق جوہری پروگرام پر کام کر رہا ہے اور جوہری ہتھیار بنا رہا ہے جبکہ حملے کے کچھ ہی دنوں بعد امریکہ کو یہ محسوس ہوا کہ عراق کے پاس جوہری پلانٹ نہیں ہے۔ امریکہ کا عراق پر حملہ کرنا دراصل عراق کے تیل کے وسیع ذخائر پر قبضہ کرنا تھا تاہم

امریکہ کوعراق اورافغانستان دونوں ممالک میں بدترین شکست ہوئی اوراب اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لیےاپنی تازہ دم فوج افغانستان اورعراق میں بھیجتا رہتا ہے۔اس جنگ میں امریکہ کواپنے عوام کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن معمولی دولت کے حصول کے لیےتگ ودوکررہا ہے۔

اکیسویں صدی کے شروع میں چین ایک نئی عالمی طاقت کے طور پرابھرا ہے جوکہ اقتصادی لحاظ سےامریکہ کے برابر ہے چین اس صدی کی نئی عالمی طاقت ہےاور بہت کم عرصے میں بڑے ممالک کی صف میں شامل ہوگیا۔چین نے ہمیشہ ہر برے وقت میں پاکستان کی پذیرائی اورحوصلہ افزائی کی ہے۔چین کے پاکستان سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہیں۔جنہیں دیکھ کرامریکہ نے بھارت سے رابطے تیز کردیئے ہیں۔

افغانستان اورعراق پرامریکی حملے کے بعدمشرق وسطی میں مزیدعدم استحکام پیدا ہوگیا اوران ممالک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اورآج تک لیبیا،یمن،شام،مصروغیرہ میں امن کی صورت حال دگرگوں ہوتی جارہی ہےتمام عرب ممالک میں سیاسی بےچینی عام ہے۔عوام اورحکومتوں کے درمیان کم ترین رابطے کی وجہ سے عدم اعتمادی ہےاور یہی چیزیں لوٹ ماراور بغاوت کوہوادے رہی ہیں جس کے نتیجے میں روزانہ ہزاروں افرادشہیداورزخمی ہورہے ہیں۔

سماجی وسیاسی ڈھانچےٹوٹ پھوٹ رہے ہیں ان سب کے پیچھےعرب حکمرانوں کی اقتداراوردولت کی ہوس ہےامریکہ کی مدد کی بدولت حکمران سیاسی دوراندیشی سے نابلداورناواقف دکھائی دے رہے ہیں۔مگر یہ ان کی بھول ہے کہ امریکہ صرف اپنے مفادات کی خاطران کی مدد کررہا ہےاور جیسے ہی اس کے اپنے مفادات پورے ہوجاتے ہیں تووہ ان ممالک کوخون آشام حالت میں چھوڑ کر بھاگ جاتا ہےاوران حکمرانوں کی حالت معمرقذافی جیسی ہوجاتی ہے۔

سائنس اورٹیکنالوجی نے ۲۱ویں صدی میں بہت ترقی کی ہےاوراس ٹیکنالوجی میں سرفہرست ملک چین ہے معاشی لحاظ سے چین دنیا کا طاقتورترین ملک ہے۔اس صورت حال کے پیش نظر دیگر عالمی طاقتیں امریکہ کے بجائے چین کوآنے والے وقت میں سپر پاور دیکھ رہی ہیں اپنی منفرد خارجہ پالیسی کی وجہ سے چین نے بہت سے ممالک سے اچھے تعلقات استوارکررکھے ہیں اور خطے میں امن کی کوششوں میں اپنا کرداراداکررہا ہے۔یہاں پراس بات کا ذکر ضروری ہے کہ دنیا کی تمام بڑی عالمی طاقتوں میں چین کوآنے والے چندسالوں میں واحدسپر طاقت کی صورت میں

دیکھا جارہا ہے۔اقتصادی طور پر چین نے امریکہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔

چین کا لونگ روڈ بنانا ۲۱ ویں صدی کی اہم پیش رفت ہے۔چین کے اپنے صوبے خنجراب سے گوادر تک سڑک بنانے کے لیے اقتصادی راہداری کے نام سے کام شروع کیا ہوا ہے اس کام کی تکمیل کے لیے چین نے پاکستان میں تقریباً ۶۵ ملین ڈالر کا سرمایہ لگایا ہے۔اس کام سے بہت سے مما لک خصوصاً بھارت کو ناگواری محسوس ہوئی ہے۔یہ مما لک پاکستان اور چین کی ترقی کے حوالے سے منفی پراپیگنڈہ کر کے اس معاہدے کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔پاک چین اقتصادی راہداری کے مقابلہ میں بھارت، افغانستان اور ایران نے ایک مزید راہداری بنانے کے بات چیت کی ہے اور تینوں مما لک نے ایران کی بندرگاہ ''چابہار'' کے مقام پر فری پورٹ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔

پاک چین راہداری سے بہت سے مما لک کو معاشی طور پر فائدہ ہوگا۔اس راہداری کو روس اور مشرق بعید کے مما لک تک لے جانا اس منصوبے کا اگلا مرحلہ ہے۔بیرونی طاقتیں پاکستان کے مختلف علاقوں میں ملک کا امن تباہ کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں کیونکہ یہ معاہدہ ان کے مفادات کے خلاف ہے۔

اس صدی کے دو عشروں میں سائنسی وفنی ترقی اوج کمال کو پہنچی ہے۔یہ صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے لیکن اس کے برعکس امن وامان کی مجموعی صورت حال خراب ہے سائنس کی ترقی کی وجہ سے جہاں انسانی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوئی ہیں وہاں بین الاقوامی سطح پر بڑے مما لک دولت کے نشے میں بدمست ہاتھی بنے، چھوٹے اور خاص طور پر مسلم مما لک میں دخل اندازی کرتے ہوئے معصوم شہریوں کی جان ومال کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔اس وقت دنیا میں غیر جانبدار فیصلے کرنے والا اور چھوٹے مما لک کو تحفظ فراہم کرنے والا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے۔

۲۱ ویں صدی کے چند ہی سالوں میں انسان نے سائنسی ترقی کی کئی منازل طے کر لی ہیں لیکن بین الاقوامی امن کی صورت حال بہت خراب ہے۔اگر چہ اس عرصے میں ترقی وخوشحالی ہوئی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ لوگوں کو اقتدار اور دولت کے جال میں پھنسا دیا گیا ہے۔یہ بات یاد رہے کہ صرف چند مما لک کی ترقی اور خوشحالی سے عالمی امن قائم نہیں ہوسکتا۔اعتماد اور انصاف کی فضاء پیدا کیے بغیر ترقی وخوشحالی کے دیرپا نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

سماجی وسیاسی سطح پر اعتماد اور رواداری امن کے قیام کے لیے ضروری ہیں۔لیکن جس طرح چھوٹے مما لک

میں خانہ جنگی اور بدامنی ہے وہ دن دور نہیں جب ایسی ہی صورت حال عالمی طاقتوں کے اندر پیدا ہو جائے گی۔

سائنسی ترقی کے مقابلے میں گذشتہ ڈیڑھ دہائی میں بدامنی وتباہی کئی گنا زیادہ ہوئی ہے جس سے اس ترقی کے ثمرات کم ہوئے ہیں اور ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سماجی وسیاسی ہم آہنگی اور تمام ممالک کے حقوق کے تحفظ اور ان کی عزت اور برابری کے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔

ب:

تیسرے دور کے پاکستانی اُردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا عمومی جائزہ

دنیا کے کسی بھی خطے کے سیاسی حالات ہوں یا جنگی انسان کے قلوب واذہان پر ضرور اثرات مرتب کرتے ہیں یہ اثرات محبت اور نفرت دونوں صورتوں میں ہوسکتے ہیں۔ایسی تمام اثرات اور خیالات جن کا تعلق زمین کی محبت سے ہو حب الوطنی کی ذیل میں آتے ہیں اس باب میں ان سب امور وحالات کا تجزیہ کیا گیا اور خلاصہ یہی ہے کہ حُب الوطنی کے فروغ میں حالات وواقعات اور محرکات کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

صفر سے ایک تک (۲۰۰۹ء)

مرزا اطہر بیگ کا ناول ''صفر سے ایک تک'' پہلی بار ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔اور بہت مقبول ہوا۔اس کی دوسری اشاعت ۲۰۱۲ء میں ہوئی۔اس ناول میں وطن سے محبت کے درج ذیل اقتباسات ملتے ہیں:

ہر انسان کو پہلے اپنا گھر، پھر محلّہ، پھر گاؤں یا شہر اور آخر میں اپنا ملک بہت اچھا لگتا ہے۔درج ذیل اقتباس میں مرزا اطہر بیگ نے لاہور شہر سے محبت کے حوالے سے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ''آخر زلیخا نے گُھورنے کی بجائے بات کی ''دیکھو مسٹر ذکی یہ بہت آسان ہے۔جو کہا جاتا ہے.....میرا مطلب ہے اگر تم نے ترجمہ درست کیا ہے۔.....کہ لاہور لاہور ہی ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ لاہور کا مقابلہ صرف لاہور سے ہی کیا جا سکتا ہے۔یہ بے مثال اور منفرد ہے۔'' (۱)

زلیخا اور ذکی کے درمیان لاہور شہر کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔زلیخا نے کہا کہ لاہور لاہور ہی ہے یعنی لاہور بہت ہی خوبصورت شہر ہے۔یہ شہر دنیا میں بے مثال اور منفرد ہے۔اس کا مقابلہ صرف لاہور ہی سے کیا جا سکتا

ہے۔لاہور شہر کی خوبیاں بیان کرنا وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

لاہور ایک ایسا شہر ہے جسے دیکھنے والے کی زندگی میں نئے دور کا آغاز ہو جاتا ہے۔اس طرح کی صورتحال کو مرزا اطہر بیگ نے یوں بیان کیا ہے:

> ''تو ہم ایسا کہہ سکتے ہیں مسٹر ذکی کہ لاہور اس لحاظ سے بے مثال ہے کہ اسے پہلی دفعہ دیکھنے والا کچھ ایسے انوکھے تجربات سے گزرتا ہے کہ گویا اُس کی ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے اور جس کسی کو بدقسمتی سے اسے دیکھنے کا موقع نہیں مل پاتا اُسے ایسا نیا جنم کبھی نہیں مل سکتا۔''(۲)

کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔یعنی جو شخص پہلی بار لاہور جاتا ہے اُس کی پیدائش اُس وقت سے ہوتی ہے۔یعنی کہ لاہور شہر کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ اسے پیدا ہونے سے مشروط کر دیا گیا ہے۔اور جس شخص نے لاہور نہیں دیکھا اُسے نیا جنم نہیں مل سکتا۔لاہور دیکھنے سے نئے جنم کا آغاز ہو جاتا ہے۔لاہور شہر سے اس قدر محبت کا اظہار بھی وطن سے محبت ہے۔

گامو میرے بڑے بھائی کی ملازمہ تھی۔وہ آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارت کرتی اور پھر پاس بیٹھ کر جسم دباتی تھی۔وہ جس علاقے میں پیدا ہوئی تھی۔وہ علاقے بھی مجھے دکھاتی۔اس صورت حال کو مرزا اطہر بیگ نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ''وہ اُس شہر پیدائش کی گلیوں میں سے مجھے ساتھ لئے گزرتی تھی۔مکانوں کے دروازے کُھل جاتے تھے اور مکینوں کے لیے وہاں پیدائش اور پیدائش سے بڑھ کر اور کچھ نہ تھا۔وہ اس شہر پیدائش کے انوکھے مناظر اپنی اُسی سرسراتی ہوا جیسی آواز میں مجھے سناتی اور دکھاتی چلی جاتی تھی۔''(۳)

گامو کی جس شہر میں پیدائش ہوئی تھی۔وہ مجھے ساتھ لے کر ان گلیوں میں سے گزرتی تھی۔گھروں کے دروازے کھل جاتے تھے لیکن مکینوں کے لیے پیدائش اور پیدائش سے بڑھ کر کوئی چیز نہ تھی۔وہ اپنے شہر پیدائش کے انوکھے مناظر سناتی اور دکھاتی جاتی۔گامو کا مصنف کو اپنے شہر پیدائش کے بارے میں بتانا وطن سے محبت کا اظہار

ہے۔

ہر انسان کو جہاں اپنے ملک سے محبت ہوتی ہے وہاں اپنے گاؤں اور مکان سے بھی محبت ہوتی ہے۔ مرزا اطہر بیگ لکھتے ہیں:

''ہم دونوں ہنسے پھر وہ یک دم سنجیدگی سے کہنے لگے''میں نے اپنے کاغذ بھی تو پکے کرنے ہیں ذکی۔ یہ مکان میرا ہے۔ رجسٹری ہے۔ بھالیکے میں کچھ رہائشی اراضی ہے۔ میرے نام۔ کاغذات ہیں۔لیکن ان سالاروں کا کوئی اعتبار نہیں۔''(۴)

ذکی یہ میرا مکان ہے۔ رجسٹری بھی میرے نام ہے۔ گاؤں بھالیکے میں کچھ رہائشی زمین بھی ہے۔ کاغذات میرے نام ہیں۔لیکن سالاروں کا کوئی اعتبار نہیں کیا پتا وہ میرے مکان اور میری زمین پر قبضہ کر لیں۔ ہر انسان کو فطری طور پر اپنے آبائی گھر اور زمینوں سے پیار ہوتا ہے۔ اور وہ اکثر اُن کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ اپنے مکان اور رہائشی زمین کا تذکرہ وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

انسان جہاں رہتا ہے۔ اُس علاقے سے محبت ایک فطری عمل ہے۔ اور وہ اپنے علاقے کے حالات و واقعات بیان کر کے اپنے علاقے سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح کی صورت حال مرزا اطہر بیگ کچھ اس طرح بیان کرتے نظر آتے ہیں:

''علاقے کی ایک اور گرم رات تھی اور ان گرم بے نیند راتوں کے خواب دیکھنے کے لئے ڈیرے کی چھت کی برساتی علاقے کا ایک محفوظ مقام تھی۔ بڑا پیڈسٹل فین بھالیکے کے اطراف میں دور دور تک پھیلے دیہات میں کٹی گندم کے کھیتوں کی خوشبو کو تیز ہوا کے ساتھ کھینچ لاتا تھا اور تیز چلتے سانسوں کی ہوا میں ایسے شامل کرتا تھا کہ سانس لینے والوں کو گندم اپنے جسموں سے اُگتی محسوس ہوتی تھی۔۔۔ میں آدھی رات ادھر آدھی رات اُدھر چھت پر جایا کرتا تھا۔ مگر کمرے میں رہنے کے دوران ائیر کنڈیشنر کم ہی استعمال کرتا تھا اُس روز کی مکینکی اور فٹ فٹایا کے دوران اے۔سی چالو ہی رہا۔'' (۵)

ذکی اپنے گاؤں میں مقیم تھا۔ رات کو بہت گرمی تھی۔ وہ رات کا منظر بیان کرتا ہے کہ گھر میں ایک بہت

بڑا اپیڈسٹل فین تھا۔ جوار دگرد گندم کے کھیتوں سے گندم کی خوشبو بھی ساتھ کھینچ لاتا اور یہ خوشبو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ گاؤں کی رات اور گرمی کا ذکر وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ذکی کو اچانک اُس کا دوست زبیر مل جاتا ہے۔ زبیر کہیں جا رہا ہوتا ہے۔ وہ ذکی کو اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا لیتا ہے۔ اس صورت حال کو مرزا اطہر بیگ نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ''اچھا۔ تو پتہ ہی نہیں چلا۔ تو جا رہے ہو۔ میں تمہیں کہیں ڈراپ کر دوں''۔ اس نے بڑے خلوص سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ اُس کے پاس موٹر سائیکل ہے۔ ستمبر کی شام موٹر سائیکل پر بیٹھ کر لاہور کی ہوا لگوانے کا سنہری موقع تھا میں نے فوراً پیشکش قبول کر لی اور موٹر سائیکل چلتے ہی مجھے اپنے فیصلے کے صائب ہونے کا احساس ہوا۔'' (۶)

ذکی کے دوست زبیر نے اسے کہیں ڈراپ کرنے کی دعوت دی جو ذکی نے قبول کر لی۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اُس کے پاس موٹر سائیکل ہے۔ ستمبر کی شام موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سیر کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شام کو لاہور کی سیر کا ذکر کرنا وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ج:

تیسرے دور کے پاکستانی اُردو ناولوں میں حب الوطنی کے عناصر کا خصوصی جائزہ

کاغذی گھاٹ (۲۰۰۲ء)

''کاغذی گھاٹ'' ایک علامتی ناول ہے۔ جہاں امیدوں کی کشتیاں کنارے لگتی ہیں مگر مایوسی و ناامیدی کی موجیں ان کو بہا کر لے جاتی ہیں۔ اور کاغذی یا کاغذ کا گھاٹ اپنی بنیادوں پر کھڑا رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہ ناول ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس کی خالق خالدہ حسین ہیں۔ اس ناول میں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں اور سانحہ مشرقی پاکستان کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ان تمام واقعات اور کرداروں سے حب الوطنی کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

انسان جس علاقے میں پیدا ہوتا ہے۔ بڑا ہوتا ہے، اس علاقے سے اُسے فطری محبت ہوتی ہے۔ اُس علاقے کی گلیوں، مکانوں اور در و دیوار سے محبت ہو جاتی ہے۔ اگر انسان کسی بھی مجبوری کے تحت اس علاقے کو چھوڑنا

پڑے تو اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اپنے گھر اور شہر کی محبت بھی حب الوطنی کی ایک سمت ہے خالدہ حسین نے ایسی ہی ایک صورتِ حال کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

''سرکاری ریسٹ ہاؤس میں؟'' بڑے ابا کو پھر چپ لگ جاتی۔ انھیں دست نگری کا شدید احساس ہوتا۔ کبھی وہ خیال ہی خیال میں ان کی انگلی پکڑے اس گلی میں پہنچ جاتی۔ مگر دہلیز پار کرتے کرتے رک جاتی۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کے اندر داخل ہو کر کبھی باہر نہ نکل پائیں گے۔ یہ مکان تو جادو بھری باہیں تھیں جو اپنے پیاروں کو سمیٹ لیتا ہے۔ وہ سر جھٹک کے واپس لاہور پہنچ جاتی۔ زمین کی محبت کتنا دکھ دیتی ہے۔ اگر کہیں اس سے بچھڑ جاؤ تو۔ بالکل جیسے کوئی امّاں سے بچھڑ جائے اور ان سے بچھڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ گھر تو ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے۔'' (۷)

اسی اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ یہ فیملی سرکاری ریسٹ ہاؤس آنے سے پہلے اپنے خالی گھر میں رہتی تھی۔ انھیں اپنے گھر اور علاقے سے بہت زیادہ محبت تھی بڑے ابّا تو ریسٹ ہاؤس میں میں خاموش ہو کر بیٹھ جاتے۔ انہیں اپنا گھر چھوڑنے کا بہت دکھ تھا۔ وہ سوچتے رہتے کہ اُن کا مکان تو جادو بھری باہیں رکھتا تھا۔ جو اپنے پیاروں کو اپنی آغوش میں لے لیتا۔ زمین سے جدائی ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بچہ اپنی ماں سے بچھڑ جائے۔ اور انسان کا گھر تو مستقل رہائش کے لیے ہوتا ہے اور اسے گھر سے بہت محبت ہوتا ہے اور گھر سے محبت کا مطلب وطن اور علاقے سے محبت ہوتی گھر وطن سے محبت کی ایک اکائی ہے۔

تحریکِ پاکستان اپنے جوبن پر تھی۔ تقسیم کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ ۱۳ اور ۱۴ اگست کی درمیانی شب کو ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے گا اور دو آزاد ریاستیں بھارت اور پاکستان دنیا کے نقشے پ رظاہر ہو جائیں گی۔ عائشہ بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی پھرتی تھی۔ اور اپنے خستہ لہجے اور رسیلی زبان میں لال قلعے اور تاج محل کی کہانیاں اپنی دوستوں کو سناتی۔ عائشہ قطب صاحب پر لکھی قرآنی آیات دکھاتی اور یہی اس کا سرمایہ تھا۔ نیا ملک بننے کی خوش دیدنی تھی۔ خصوصاً مسلمان پاکستان بننے سے بہت زیادہ خوش تھے۔ اسی صورت حال کو خالدہ حسین نے کچھ اس طرح بیان کیا۔

''درختوں کی ٹہنیوں پر سبز کاغذ کے پرچم سجائے وہ بھی اپنے گھر اور کبھی کبھی وارث روڈ کے سارے بچوں کے ہمراہ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتی، مارچ کرتی پھری تھی اور

بس وہ جادوئی رات بھی اس کی اپنی تھی جب وہ سب کے سب سانس روکے مارکونی کے اس قدیم ریڈیو کے گرد بیٹھے تھے جس سے آدھی رات کو پہلی بار یہ ریڈیو پاکستان ہے، کی آواز آئی تھی اور ایک دم ساری دنیا بدل گئی تھی۔

اس نے دیکھا صحن میں پھیلا اندھیرا وہ نہ تھا نہ ہی ایک بے چاری پیلی سی بتی اور چنبیلی اور بوگن ویلا کے پتے لہراتی ہوا بھی وہ نہ رہی تھی۔ در و دیوا کے ہیولے سب کے سب بدل گئے تھے۔ وہ وہیں پر اسی مقام پر تھی کہ ''یہ ریڈیو پاکستان ہے، کی آواز نے اس کو کسی اور ہی دنیا میں لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں کی ہوا اور تھی اور سانسوں کا ذائقہ اور تھا۔ اب سب لوگ نئے نئے نظر آ رہے تھے جیسے کہیں سے دُھل دُھلا کے آئے ہوں۔ مصطفیٰ علی ہمدانی کی وہ آواز صدیاں پلٹنے والی تھی۔ وہ آواز جو اس کو کبھ مارکونی ریڈیو کی ہم شکل محسوس تھی جس میں رعب و دبدبہ تھی تھا اور دوستی اور جاں سوزی بھی۔ وہ آواز آج ، ایک انجانی سمت تخلیق کر گئی تھی۔''(۸)

عائشہ بھی اپنی سہیلیوں کے ہمراہ سب پرچم تھامے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتی پھرتی اور پھر وہ رات بھی آ گئی یعنی ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کی رات۔ اس رات کو بارہ بج کر ایک منٹ پر تخلیق پاکستان کا اعلان ہونا تھا۔ گھر کے سب لوگ کان لگائے ریڈیو سن رہے تھے کہ اچانک ریڈیو سے یہ آواز آئی۔ یہ ریڈیو پاکستان ہے۔ یہ آواز مصطفیٰ علی ہمدانی کی تھی۔ جس سے صدیا پلٹنے والی تھیں۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے مصطفیٰ ہمدانی کی آواز۔ یہ ریڈیو پاکستان ہے۔'' سنناد راصل وطن پاکستان سے محبت کا اظہار ہے جس کا ابھی اعلان ہوا تھا۔

یہ اقتباس ایک سرکاری ملازم کے گھر کے ماحول کے بارے میں ہے۔ تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ عام لوگ اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ سیاسی کارکنان دن رات ایک بنے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین قیام پاکستان میں حائل رکاوٹیں ختم کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ جب کہ کانگریسی لیڈر آزادی کی تحریکیں تو چلائے ہوئے تھے لیکن وہ اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ کانگریسی لیڈروں کی یہ سوچ تھی کہ آزادی کے بعد پورے ہندوستان پر کانگریسی کی حکومت ہوتی چاہیے لیکن مسلمان لیڈوں کے ساتھ ساتھ عام سرکاری ملازمین بھی پاکستان کا قیام چاہتے تھے۔ خالدہ حسین ایک سرکاری گھرانے کے ماحول کا جائزہ کچھ اس طرح لیتی ہیں:

''گھر میں کہیں ان انقلابی نظموں اور سوچ کا سایہ تک نہ تھا۔ وہاں ایک پرسکون، نظم وضبط والی زندگی تھی۔ گھر گھڑی کی سوئیوں کی طرح چلتا تھا۔ وقت پر جاگنا، وقت پر سونا، کھانا، نمازیں، تلاوت، رشتہ داروں، احباب کا آنا جانا، شام کی چائے پر مہمانوں کی تواضع۔ کبھی کبھی ابّا کی منڈلی جمع ہو جاتی اور رات بھر محفل جمی رہتی۔ مگر یہ سب کے سب سرکاری افسر تھے اور حکومت وقت کے خلاف کچھ کہنا سننا اس گھر کا کلچر نہ تھا۔ بغاوت کے ذائقے سے یہ گھر نا آشنا تھا۔ بس یہاں پر قائد اعظم پرستی ہوتی تھی اور اقبالؔ سے محبت کی جاتی تھی اور حفیظ جالندھری اور فیضؔ کا نام سننے میں آتا تھا۔ اور اس کی شورش بربط و نے اتنی بار پڑھی جاتی کہ اُسے زبانی یاد ہو گئی۔''(۹)

چونکہ اس گھر کے تمام افراد حکومت کے ملازم تھے۔ اس لیے اُن کے گھر میں انقلابی نظموں اور سوچ کا وجود نہیں تھا وہ لوگ پُرسکون ماحول میں ایک اچھے نظم وضبط کے ساتھ رہ رہے تھے۔ گھر ایک مقررہ ٹائم ٹیبل کے مطابق چلتا تھا۔ جلدی سونا اور صبح جلدی جاگنا، نماز، تلاوت، ناشتہ سب کاموں کے اوقات مقرر تھے۔ چوں کہ اس گھر کے تمام افراد سرکاری ملازم تھے اس لیے حکومت کے خلاف بات کرنا یا سننا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ بغاوت نام کی چیز اس گھر میں نہیں تھی۔ لیکن اس گھر کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ لوگ قائداعظم اور علامہ محمد اقبال سے بہت محبت کرتے تھے۔ فیض احمد فیض اور حفیظ جالندھری کی نظمیں سنتے تھے۔ اس اقتباس میں قائداعظم اور علامہ محمد اقبال سے محبت وطن سے محبت کا ایک جزو ہے۔

اینا کے ابّا بہت بڑے سرکاری آفیسر تھے۔ اُن کے پاس بے شمار سرکاری کاریاں اور نوکر چاکر تھے۔ سرکاری مالی اُن کے گھر کے لان میں کام کرتا تھا۔ جس سے ہر وقت وہاں پھول کھلے رہتے تھے۔ اُس کے ابّا کبھی کبھی سرکاری دوروں میں اپنے گھر والوں کو بھی لے کر جاتے۔ جہاں پر سرکاری ملازمین اُن کی خدمت کے لیے موجود ہوتے۔ پھر وہ لمبے سفر پر نکل جاتے۔ اینا کے ابّا سفر کے دوران کھیتوں اور زمینوں کے بارے میں بتاتے۔ یہ بات قیام پاکستان کے فوراً بعد کی ہے۔ خالدہ حسین اس حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

''یہ گندم، یہ کپاس، یہ زمین پر جو سفید سفید چونا نظر آتا ہے، شور ہے۔ پاکستان کی بہت زیادہ اراضی سیم اور تھور کی زد میں آ چکی ہے۔ زمین کے اس طرح ناکارہ ہونے پر اس کا دل اداس ہو جاتا۔ زمین کی نمی نمکیات کو سطح پر لا کر بنجر کر دیتی ہے۔ وہ سوچتی ساری نقصان کی

باتیں سرحد سے اس طرف ہی کیوں ہوتی ہیں۔اس کو اپنا دل ہی شورزدہ زمین نظر آنے لگتا جس کی سطح پر شکست اور ازلی خسارے کا زہریلا نمک پھیل رہا تھا۔ پاکستان اتنا کمزور کیوں ہے۔ پھر نحیف ونزار قائداعظم کا سراپا اس کی نظروں میں گھوم جاتا۔قائداعظم اور پاکستان دونوں ایک سے ہیں۔کاش قائداعظم اتنے کمزور نہ ہوتے۔کاش وہ بہت توانا، بہت مضبوط ہوتے اور وہ ان کی صحت کے لیے کڑھنے لگتی مگر پھر ریڈیو پر ان کی شیر ایسی آواز گونجتی۔اسے یقین ہوجاتا وہ تو بہت زور والے ہیں وہ نہیں مریں گے۔

وہ تو ہر پیارے کی موت کیلیے خوفزدہ رہتی تھی۔مگر پھر بڑی بڑی دلیلیں لاکر نچنت ہو جاتی کہ یہ لوگ مرنہیں سکتے کیوں کہ ان کے مرنے کی کوئی منطق ہی نہ بنتی تھی۔مگر قائداعظم تو ہر منطق کے خلاف، ہر دلیل کو رد کرتے ہوئے مر گئے۔ان کی موت سے ایک دن پہلے بڑے بھیا کے کمرے میں لگی ان کی تصویر،فریم کے اندر خود بخود ٹیڑھی ہوگئی۔''(۱۰)

اینا کے ابّا بتا رہے ہیں کہ گندم اور کپاس کے کھیتوں میں جو سفیدی نظر آرہی ہے یہ شور ہے۔ پاکستان کی بہت زیادہ زمین سیم اور تھور کی زد میں آچکی ہے۔زمینکے ناکارہ ہونے پ راینا کا دِل پریشان ہوجاتا۔وہ سوچتی رہتی ۔یہ نقصان صرف پاکستان ہی میں کیوں ہوتا ہے۔انہی سوچوں میں اس کی آنکھوں کے سامنے قائداعظم کا کمزور جسم گھوم جاتا ہے۔کاش وہ مضبوط اور توانا ہوتے۔قائداعظم کی موت سے اسے بہت دکھ ہوا۔اینا کا پاکستانی زمینوں میں شور اور قائداعظم کی وفات پر رنجیدہ ہونا حب الوطنی کا بڑا ثبوت ہے۔

اینا کو یونیورسٹی گراؤنڈ میں لاکھوں انسانوں میں گھِرا قائداعظم کا کمزور سراپا یاد آیا۔وہ ہر پیارے کی موت کے لیے خوف زدہ رہتی تھی اور بڑی بڑی شخصیات کے بارے میں یہ سوچتی کہ ایسے لوگ نہیں مر سکتے۔وہ خصوصاً قائد اعظم کی وفات کے بارے میں سوچتی کہ وہ نہیں مر سکتے۔حالاں کہ قائداعظم کی وفات سے ایک دن پہلے بڑے بھائی کے کمرے میں قائداعظم کی تصویر فریم کے اندر خود بخود ٹیڑھی ہوگئی تھی۔اب اینا کو یونیورسٹی گراونڈ میں لاکھوں لوگوں کے ہجوم میں قائداعظم کا کمزور سراپا یاد آیا۔سلمٰی اعوان یوں رقم طراز ہیں:

''لوگ قائداعظم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ درختوں، بجلی کے کھمبوں، عمارتوں کی منڈیروں پر آدم ہی آدم مسلسل نعرے۔ دور سے قائداعظم کا ہڈیوں بھر پروفائل ہی نظر آیا۔وہ حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔تنکا سے قائداعظم اس

روز ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہے تھے مگر آواز میں ہی گرج تھی۔

مگر کروڑوں کی محبت بھی انہیں نہ بچا سکی۔ اس روز بڑے بھیا نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا لیا تھا۔ بڑے ماموں کیپیٹے کے ساتھ ان کی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ کیوں کہ اس نے بتایا تھا کہ قائداعظم زیارت سے کراچی پہنچنے سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ راستے میں انہیں بروقت طبی امداد ہرگز نہ ملی تھی۔ بڑے بھیا کے لیے ایک بے بس، دوسروں کے رحم و کرم پر قائد کا تصور قابل برداشت نہ تھا۔ تب کچھ بھی قابل برداشت نہ لگتا تھا۔ در و دیوار پر عجب اداسی ٹپکتی تھی۔ ایسی دنیا کتنی بے رونق اور سپاٹ تھی جس میں وہ نحیف و نزار شخص نہ تھا جس سے لوگ اتنی بے پناہ محبت کرتے تھے تو پھر محبت بھی لوگوں کو دیر تک زندہ رکھنے کا نسخہ کیمیا نہ تھی۔ وہ کیا شے تھی جو لوگوں کو ان تمام پیارے، بے حد خوبصورت لوگوں کو ہمیشہ زندہ رکھ سکتی تھی۔ وہ اس کے دوٹوک جواب کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ بس موت کی خاموش دہشت اندر ہی اندر اس کے دل میں بیٹھتی جا رہی تھی۔ یہ زندگی کا ایک غیر ضروری، انتہائی ناوقت اختتام جو تلوار کی طرح سر پر لٹکتا ہی رہتا ہے اور سایہ کی طرح پیچھا کرتا ہے۔ اور ہونے کا احساس شدید کرنے والا اور نہ ہونے کا فی نومی نا اس کے احساس میں بری طرح جڑ پکڑ چکا تھا اور کسی فلم کی پس منظر موسیقی کی طرح ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔'' (۱۱)

یونیورسٹی گراؤنڈ میں لاکھوں لوگ قائداعظم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ درختوں، کھمبوں اور گھروں کی چھتوں پر ہر طرف انسان ہی انسان تھے۔ دور سے قائداعظم کی ہڈیوں بھری کمزور سی تصویر ہی نظر آئی۔ تاہم اس دن قائداعظم ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہے تھے۔ کروڑوں لوگوں کی محبت بھی قائداعظم کی جان نہ بچا سکی۔ قائد اعظم زیارت سر کراچی پہنچنے سے قبل ہی وفات پا چکے تھے۔ ہر طرف اداسی ہی اداسی تھی۔ اینا کا قائداعظم کی وفات پر غمگین ہونا اور ان کے جلسے کے بارے میں خیال آنا بھی حب الوطنی ہے۔ کیوں کہ قائداعظم پاکستان کے بانی تھے۔ وہ محسن پاکستان تھے۔

مونا افروز کی بہترین دوست تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو افروز کے ہر دکھ کا مداوا کرتی تھی۔ دنیا کا روشن ترین پرچم جس پر درانتی کا نشان ہو مگر ان کے گھر میں کارکسزم اور کمیونزم اور سوشلزم کو الحاد سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ابا کسی انقلابی تصور کے روادار نہ تھے۔ وہ اپنی تمام تر توانائیاں تحریک پاکستان میں خرچ کر چکے تھے اور اب بڑے مطمئن

بیٹھے تھے۔ وہ بے حد قابل اور دیانتدار سرکاری ملازم تھے۔ وہ ملازمت کے دوران تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے تھے۔ اُن کی سوچ بھی یہی تھی کہ برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقوں کو آزادی دے دی جائے۔ پاکستان بن جانے کے بعد وہ بہت مطمئن تھے۔ مونا اپنے ابا سے کچھ معلومات شیئر کرتی ہے۔ خالدہ حسین یوں رقم طراز ہیں:

''جاگیردارانہ نظام پنجے گاڑ رہا ہے اور زمیندار امیر سے امیر تر اور کسان غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اسلامی مساوات کہاں ہے جو پاکستان کی اساس ہونے والی تھی۔ چوں کہ یہ نظام درست نہیں اس لیے ان ازموں میں سے کسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ سرخ انقلاب کی ضرورت ہے ہمیں۔ اور کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ ترے ماتھے پہ یہ آنچل خوب ہے لیکن تو اس آنچل کا پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا۔ یہ شعر اس نے بآواز بلند ہرگز نہیں پڑھا۔''(۱۲)

دراصل مونا بہت حساس اور محبِّ وطن لڑکی ہے۔ اس کے والد بھی تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن رہے۔ اُس کی تربیت ایسے ماحول میں ہوتی ہے کہ وہ کسی چیز کے فوائد اور نقصانات بہت جلدی محسوس کر لیتی ہے۔ جب اسے پتا چلتا ہے کہ پاکستان میں جاگیردارانہ نظام مضبوط ہو رہا ہے۔ زمیندار امیر سے امیر تر اور کسان غریب سے غریب تر ہو رہا ہے۔ اس بات پر وہ بہت کڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ اسلامی مساوات کہاں ہے۔ جس کی اساس پر پاکستان بنا تھا۔ چوں کہ جاگیردارانہ نظام درست نہیں ہے لہٰذا یہاں پر صرف اور صرف اسلامی نظام معیشت لاگو ہونا چاہیے۔ اور ہمیں سرخ انقلاب کی ضرورت ہے۔ مونا کسی شاعر کے ایک شعر کا حوالہ دیتی ہے۔

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل خوب ہے لیکن
تو اس آنچل کا پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مونا کا پاکستان میں جاگیردارانہ نظام سے نفرت حب الوطنی کا عنصر ہے۔

تحریکِ پاکستان کے دوران اور قیام پاکستان کے قائداعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا تھا کہ پاکستان کی قومی اور دفتری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ ہمیں ترقی کرنے کے لیے تمام جدید علوم کے تراجم اردو میں کرنے ہوں گے لیکن بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد جاگیردار اور بیوروکریٹ طبقہ اردو زبان کے خلاف ہو گیا۔ یہ طبقہ نہیں چاہتا تھا کہ اردو پھلے پھولے۔ اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات میں انگریزی میں مہارت نہ رکھنے والا طبقہ اس زبان کو اپنا مقام دلوانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس حوالے سے خالدہ حسین یوں رقم طراز ہیں۔

''اردو کا مسئلہ بڑی گمبیر تا اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اردو بولو، اردو پڑھو، اردو لکھو کی تحریک بڑے زوروں سے چل نکلی تھی۔ بڑے بڑے بازاروں کے سائن بورڈ انگریزی سے اردو میں منتقل کرنے کی ترغیب دلائی جا رہی تھی۔ جب تک تعلیم اور دفتری زبان اردو نہیں ہو گی اس قوم کا تشخص مشکوک رہے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ایسا کون سا بڑا مسئلہ ہے۔ قائداعظم نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ اردو ہماری قومی زبان ہوگی اور ادھر کے تو پچانوے فیصد گھرانے بچوں سے اردو بولتے تھے اور یہ بچے پنجابی بولنے سے قاصر ہو چکے تھے۔ اردو سے کس کو محبت نہیں۔ مگر انگریزی کا اپنا سحر ہے۔ اردو کے لیے انگریزی کو ختم کرنا ضروری نہیں۔ ''یہی سامراجی سوچ ہے۔'' شاہجہاں نے کہا'' (۱۳)

قائداعظم کی وفات کے بعد اردو زبان کا مسئلہ بڑی اُلجھن اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اردو کے حامی اردو پڑھو اور اردو لکھو کی تحریک چلائے ہوئے تھے۔ شہروں اور بازاروں کے سائن بورڈ اردو میں لکھنے کی ترغیب دلائی جا رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک تعلیم اور دفتری زبان اردو نہیں ہوگی پاکستانی قوم کا تشخص مشکوک رہے گا۔ یہ شاہجہاں کی سوچ تھی۔ قائداعظم نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان زبان اردو ہوگی۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔ اب تو یہ حالت ہے کہ ہمارے پچانوے فیصد بچے اردو اور پنجابی بولنے سے قاصر ہیں۔ کیا اردو سے کسی کو محبت نہیں رہی۔ انگریزی کا اپنا جادو ہے لیکن اردو کے نفاذ کے لیے انگریزی ختم کرنا ضروری نہیں۔ شاہجہاں کا اردو زبان کے نفاذ کے لیے محبت کا اظہار حب الوطنی ہے۔ کیوں کہ اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان بھی کہا جاتا ہے۔

خالدہ حسین نے یہاں پر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے واقعات تحریر کیے ہیں۔ یہ جنگ پاکستانی لوگوں نے بڑے جوش اور ولولے سے لڑی تھی۔ عام لوگوں نے فوج کے ساتھ مل کر دشمن کو تباہ و برباد کیا۔ چونڈہ کے مقام پر بھارتی ٹینکوں کے سامنے لیٹ کر دشمن کے ٹینکوں کو تباہ کیا۔ اس وقت تفریح کا واحد ذریعہ ریڈیو تھا۔ ریڈیو سے عوام اور فوجی بھائیوں کا حوصلہ بڑھایا جا رہا تھا۔ ایسی صورتِ حال کو خالدہ حسین نے یوں بیان کیا ہے۔

''ریڈیو پر لہو گرمانے والے نغمے صبح و شام۔ اب ان کے علاوہ کبھی کوئی گیت اچھے نہیں لگیں گے۔ سب کا خیال تھا۔ جاگ اٹھا ہے سارا وطن۔ جنگ کھیڈنئیں ہوندی زنانیاں دی۔ کیا کوئی نئی متھ تخلیق ہو رہی ہے۔ ہمارے عہد کی، وہ جو اہم تھا اب غیر اہم ہو چکا تھا۔ پُر تکلف کھانے موقوف، ساری دالیں ملا کے حلیم ایسی ڈش تیار ہوتی جو سب ذوق و شوق کے

ساتھ کھاتے۔ مارکیٹ میں اشیاء کی قیمتیں کم ہو رہی تھیں۔ سب ایک دوسرے کے لیے فکر مند۔ کہیں آس پاس کوئی بھوکا نہ ہو۔ اس آواز میں کیا جادو تھا۔ کیا کرشمہ۔ تاریخ کو قصہ کہانی محسوس کرنے والوں کے لیے تاریخ زندہ ہونے کے امکانات کا ایک در کھل رہا تھا۔ الفاظ بھی تقدیر کا ایک روپ ہیں۔

''دشمن نہیں جانتا اس نے کس قوم کا للکارا ہے!''

بہت اندر، نیچے سروں میں افروز کہہ رہی تھی۔ گیدڑ بھبکی، مگر دل طبلِ جنگ بجا رہا تھا۔ شاید شاعت محض وہم نہیں حقیقت ہے۔ صفدر میر کڑک رہا تھا۔ گیدڑ وشیر ہوشیار ہے۔ آؤ ہم سب مل کر رجز پڑھیں۔ یہ ایک خواب نما طلسماتی فضا تھی جس میں عہد رفتہ لوٹ آیا تھا۔ مقتول عزت نفس دھیرے دھیرے سانس لینے لگی تھی۔ معجزے رونما ہونے لگے تھے۔ لوگ چھتوں پر چڑھ کے لڑاکا طیاروں کی ڈاگ فائٹ دیکھ رہے تھے۔ جہاز گرا تو 'بوکاٹا' کے نعرے لگے۔ لاہوری واقعی پاگل ہیں۔''(۱۴)

جنگ کے دوران ریڈیو پاکستان سے صبح شام ملی اور قومی نغمے نشر ہو رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب ان نغموں کے علاوہ کوئی دوسرا نغمہ اچھا نہیں لگے گا۔ شوکت علی کا گایا ہوا نغمہ ''جاگ اُٹھا ہے سارا وطن'' بہت مقبول ہوا۔ جنگ کے دنوں میں پُر تکلف کھانے موقوف ہو گئے تھے۔ دالیں ملا کر حلیم تیار کی جاتی جو سب شوق سے کھاتے۔ مارکیٹ میں اشیاء کے نرخ کم ہو رہے تھے۔ سب لوگ ایک دوسرے کے لیے فکر مند نظر آ رہے تھے۔ کہ کہیں اردو گرد کوئی بھوکا نہ رہے۔ دشمن نہیں جانتا تھا کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ اب لوگ اتنے نڈر ہو چکے تھے کہ گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر طیاروں کی ڈاگ فائٹ کا نظارہ کرتے۔ جنگ کے دوران ریڈیو سے نشر ہونے والے نغمے اور پاکستانی لوگوں کا حوصلہ مند رہنا اور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا حب الوطنی ہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگِ آزادی کی قیادت صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان خود کر رہے تھے۔ پاک فوج کے شاہینوں نے بھارت کے لڑاکا ہوائی جہاز جو اڈوں پر کھڑے تھے۔ تباہ کر دیئے۔ بھارت نے یہ بات تسلیم کی کہ پاکستان جیسی بہادر فوج کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ جب پاکستانی فوجی سڑکوں سے گزرتے تو عوام اُن کا حوصلہ بڑھانے کے لیے سڑکوں پر نکل آتے۔ زخمی فوجیوں کے لیے تحائف بھیجے جا رہے تھے۔ اتنی سخت جنگ کے باوجود پاکستانی عوام اور فوج بہت مطمئن تھے۔ ایسی صورتِ حال کو خالدہ حسین نے کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:

''پھر بھی زندگی کے معمولات قائم تھے۔ ہسپتالوں میں فوجیوں کے لیے خون کا عطیہ دینے والوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں۔ وہ بھی وجیہہ کے ساتھ خون دینے گئی معلوم نہیں۔ اس کا خون کسی کی رگوں میں دوڑا ہوگا۔ وہ سوچتی رہی، ریڈیو پاکستان پر وہ کچھ عرصہ کے لیے اپنی چھوٹی چھوٹی تحریریں نشر کر رہی تھی۔ ان سترہ دنوں میں بھی یہ معمول قائم رہا۔ ایک روز وہ اسٹوڈیو سے نکل رہی تھی کہ ملکہ ترنم کے ساتھ آمنا سامنا ہو گیا۔ دراز قد، اونچا سا جوڑا بنائے، بالکل مدھم رنگ کی ساڑی، ''اے پتر ہٹاں تے نئیں وِکدے۔'' دھا پان چھوٹے سے غلام مصطفیٰ تبسم کڑیل جوانوں کی رگوں میں دھمال ڈال رہے تھے۔ خطہ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام۔ جذبات کا ریلا تھا کہ سب کو بہائے لیے جا رہا تھا۔ شہر جیتی جاگتی ہستیاں بن گئے تھے۔ سرگودھا، سیالکوٹ، چھمب جوڑیاں میں پیش قدمی، کھیم کرن میں پاکستان کا جھنڈا لہرا تھا۔ سیالکوٹ میں ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ سپاہی اپنے جسموں سے بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے آگے لیٹ رہے تھے۔'' (۱۵)

جنگ میں شدت کے باوجود پاکستانی لوگوں کی زندگی رواں دواں تھی۔ زخمی فوجیوں کو خون دینے کے لیے ہسپتالوں میں خون کا عطیہ دینے والوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ مونا بھی وجیہہ کے ساتھ ہسپتال میں خون دینے گئی۔ اس کی تحریریں ریڈیو پاکستان پر نشر ہو رہی تھیں۔ جنگ کے سترہ دنوں میں یہ معمول قائم رہا۔ ایک دن اس کی ملاقات ملکہ ترنم نور جہاں کے ساتھ ہوگئی۔ غلام مصطفیٰ تبسم بھی اس کے ساتھ تھے۔ خطہ لاہور تیرے جانثاروں کو سلام''، ایہ پُتر ہٹاں تے نہیں وِکدے''، جنگ کھیڈنئیں ہوندی زنانیاں دی، جیسے ملی نغمے قوم کا خون گرما رہے تھے۔ سرگودھا، سیالکوٹ، چھمب جوڑیاں سیکٹر میں پاک فوج کی پیش قدمی اور چونڈہ ضلع سیالکوٹ میں بھارتی ٹینکوں کے سامنے ہمارے سپاہیوں نے سینے پر بم باندھ کر اُن کا راستہ روک دیا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ پاکستانی افواج اور اعوام کا پاکستان کے لیے جنگ لڑنا، وطن پر قربان ہونا اور عام لوگوں کا فوج کے لیے خون کے عطیات دینا حب الوطنی کی بہترین مثالیں ہیں۔

مونا ایک دن یونیورسٹی کی لائبریری میں جا رہی تھی کہ اچانک اس کی ملاقات شاہجہاں سے ہوگئی۔ شاہجہاں انقلابی خیالات کی مالک تھی اور وطن پرستی اُس دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ جمہوریت کی قائل تھی۔ اور وہ یہ چاہتی تھی کہ تمام صوبوں کو مساوی حقوق اور خود مختار ملے اور صوبے زیادہ سے زیادہ خود مختار ہوں۔ پنجاب کے لوگ

بڑے مطمئن ہیں۔ جب کہ ہمارا میڈیا بکاؤ مال ہے یا آمرانہ حکومتوں کے سامنے مجبور ہے۔اور پاکستان کی یہ حالت ہے کہ ایک ڈکٹیٹر کے بعد دوسرا ڈکٹیٹر بڑے دھڑلے سے آرہا ہے۔اور کوئی بھی اس کے خلاف بولنے یا لکھنے سے قاصر ہے۔اب ایسے حالات میں کیا ہوسکتا ہے۔شاہجہاں کی گفتگو کو خالدہ حسین نے کچھ اس طرح قلم بند کیا ہے۔

''مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔تمھیں تو تب خبر ہوگی جب یہ جولا مکھی پھو تپڑے گا اور سب کچھ فنا ہو جائے گا۔تمھارا ٹی وی خوبصورت بنگلہ عورتوں سے امی بھاشو سیکھتا رہے گا۔اس کے پیچھے پھنکارتی نفرت نہیں دیکھے گا۔تمھارے دارالحکومت میں سرشام سفارتی دعوتوں میں جادو جگاتی بنگالی ساڑھیاں اور پھولوں مہکتے سیاہ جوڑے اور کاجل بھری آنکھیں ہی حقیقت نہیں۔بنگال کا جادو صرف پوٹھوہار میں سر چڑھ کے بول رہا ہے۔اصل بنگال میں بھوک اور ننگ ہے مغرب پاکستان کیخلاف شدید نفرف۔خصوصیاً فوج جو غاصب کا روپ دھارے وہاں دندناتی پھر رہی ہے اور جسے ''فتنہ'' کچلنے کا حکم جاری کر دیا گیا ہے۔ملک کے دونوں بازو خود تضادی کی کیفیت میں مبتال ہیں۔یہ دوسروں والا ایک ابنارمل بچہ ہے اس کو سرجری کی ضرورت ہے یا پھر انتہائی نگہداشت کی جو ممکن نظر نہیں آتی۔بولتے بولتے اس کی ناک پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے وہ پہلے سے خاصی دبلی ہو چکی تھی اور چہرے کے نقوش بہت تیکھے اور نمایاں تھے۔خصوصاً کاجل بھری آنکھیں۔''(۱۶)

مونا اور شاہجہاں کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مشرقی پاکستان کے حالات بہت خراب ہو رہیہ تھے۔اگر ان حالات پر توجہ نہ دی گئی تو ایک دن یہ لاوا پھٹ جائے گا اور سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا۔بنگلہ ٹی وی صرف بنگلہ عورتوں کے شوز ہی دکھا رہا ہے۔اس کے پیچھے مغربی پاکستان سے نفرت ہی نہیں تو اور کیا ہے۔دارالحکومت ڈھاکہ میں سرشام سفارتی دعوتوں میں بنی سنوری اور آنکھوں میں کاجل لگائے بنگلہ عورتیں اپنے حسن کا جادو جگاتی نظر آتی ہیں۔یہ یقیناً کسی برے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔اصل بات یہ ہے کہ بنگالی میں بھوک اور افلاس بہت زیادہ ہے۔جس کی وجہ سے مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی ہے۔مشرقی پاکستان کے حالات پر بحث کرنا وطن سے محبت کا بہت بڑا عنصر ہے۔محبّ وطن پاکستانی لوگ سانحہ مشرقی پاکستان سے پہلے یہ بات بھانپ چکے تھے کہ اگر ایسے ہی حالات رہے تو مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو جائے گا۔

اس ناول ''کاغذی گھاٹ'' میں ۶۵ء کی جنگ کے واقعات کے ساتھ ساتھ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ

اور سانحہ مشرقی پاکستان کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ جب پاکستان افواج نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال دیئے ہمارے نوے ہزار فوجیوں کو بھارتی فوج نے قید کر دیا۔ پھر ہم نے بنگلہ دیش تسلیم کر لیا تو محبّ وطن طبقہ بہت مایوس ہو گیا۔ یہ لوگ نیم جان ہو چکے ہیں۔ اور ان لوگوں کا وجود بنگلہ دیش کو ماننے سے قاصر ہے۔ تاہم ہم پھر زندگی اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔ اس صورتِ حال کو خالدہ حسین نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''ہر چھ ستمبر کو یوم دفاع منایا جانے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ فخر و مباہات کے وہ تمام معرکے داستانوں میں ڈھل گئے۔

چھ ستمبر کے ساتھ ساتھ تمھیں ۱۲ دسمبر بھی تو منانا چاہیے۔'' افروز نے کہا تھا، مگر اپنی تاریخ سے سبق سیکھنا ہمارے ضمیر میں نہیں۔''

وہ یومِ دفاع کے میلے میں گھوم رہی تھیں۔ لاہور کی فضائی بیس پر دشمن کا گرائے جانے والا ایک طیارہ اور اپنے غازی لڑاکا طیارے سجے کھڑے تھے۔ شدید دھوپ اور گرمی میں آنکھیں چندھیائے جا رہی تھیں۔ فضائی فوج کے خوبصوت جوان لوگوں کو جہاز دکھا اور تفصیلات بتا رہے تھے۔ ایم ایم عالم نے ہی حملے میں دشمن کے پانچ جہازوں کو مار گرایا تھا۔ مگر وہ ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں میں بنک لوٹ کر لانے والے اور ہتھیار ڈالنے کی تقریب کا اہتمام کرنے والے اس کی بکل کا چور ایک لمحے کے لیے بھی خوش نہیں ہونے دیتا تھا۔''(۱۸)

چھ ستمبر کا دن یومِ دفاع کا دن ہے۔ اب یہ دن بھی دوبارہ منانے کا اہتمام کیا جانے لگا۔ مونا کی دوست افروز نے کہا تھا کہ ہمیں ۶ ستمبر کے ساتھ ساتھ ۱۲ دسمبر بھی منانا چاہیے۔ چھ ستمبر تو یوم دفاع ہے۔ اور ۱۲ دسمبر سقوطِ ڈھاکہ کا دن ہے۔ اس دن کو بھی منانا چاہیے۔ تاکہ ہم اس دن کی یاد تازہ کر کے تاریخ سے سبق سیکھیں۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم تاریخ سے کوئی سبق نہیں دیکھتے۔ مونا یومِ دفاع کا میلہ دیکھ رہی تھی۔ لاہور پر حملہ کرنے والی بھارتی طیارہ اور دوسرے پاکستانی غازی طیارے کھڑے تھے۔ ہوائی فوج کے جوان لوگوں کو بتا رہے تھے کہ ایم ایم عالم نے اپنے ایک ہی حملے میں دشمن کے پانچ جہاز تباہ کر دیئے تھے۔ تاہم ڈھاکہکی وہ تقریب جس میں پاکستانی افواج نے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا وہ محبّ وطن پاکستانیوں کو بھی چین نہیں آنے دیتی۔ اس اقتباس میں چھ ستمبر یوم دفاع منانے کی تقریب کے ذکر کے ساتھ ۱۲ دسمبر کے سانحہ مشرقی پاکستان کا ذکر بھی آتا ہے۔ اصل میں یہ دو محبّ وطن

دوستوں کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔یعنی سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد ۶ ستمبر یوم دفاع کی تقاریب دوبارہ شروع ہو جاتی ہیں۔ان تقاریب میں پاکستان کے ان طیاروں کی نمائش کی جاتی ہے۔جنھوں نے دشمن کو تباہ و برباد کیا تھا۔لیکن اس گفتگو میں سانحہ مشرقی پاکستان کی بات بھی ہوتی ہے کہ ہمیں ۶ ستمبر کے ساتھ ساتھ ۱۶ دسمبر کو بھی منانا چاہیے اور اس دن سے سبق سیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے کون سے حالات تھے جن کی وجہ سے ہمارا بازو ہم سے الگ ہو گیا۔اگر ہم کچھ عرصہ پہلے اُن حالات کو سنجیدگی سے لیتے تو یقیناً ایسے سانحہ سے بچ سکتے تھے۔یوم دفاع ۶ ستمبر منانے کا ذکر اور ۱۶ دسمبر سانحہ مشرقی پاکستان کا ذکر حب الوطنی پر مبنی ہے۔کیوں کہ ہمیشہ حب الوطن انسان ہی کو ملک کے نقصان سے دُکھ اور افسوس ہوتا ہے اور ملک کو جنگ جیتنے کی خوشی ہوتی ہے۔۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی سترہ روزہ جنگ میں پاکستان نے بھارت کا بھرپور مقابلہ کیا تھا۔اور بھارت کا بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان کیا تھا۔ہماری فضائی فوج کے طیارے سرگودھا سے اُڑتے تھے اور سیدھے بھارت کے بہت اہم ہوائی اڈے کو نقصان پہنچاتے اُن کے وہاں پر کھڑے طیاروں کو تباہ و برباد کر کے بہ حفاظت واپس سرگودھا آ جاتے۔چونڈہ کے مقام پر جب بھارتی ٹینکوں کی ایک بڑی تعداد حملہ آور ہوتی تو ہمارے بہادر فوجی جوانوں نے اپنے سینوں پر بم باندھے اور ٹینکوں کے نیچے لیٹ گئے۔نتیجہ کے طور پر بھارت کے تمام ٹینک تباہ ہو گئے اور جو بچ گئے وہ اپنے ہی جوانوں اور ٹینکوں کو روندتے ہوئے واپس چلے گئے۔حب الوطنی کی اس سے بڑی اور مشکل تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔

ناول ''کاغذی گھاٹ'' میں ۱۹۶۵ء کی جنگ ۱۹۷۱ء اور سانحہ مشرقی کے محرکات اور وجوہات سے بھی پردہ اُٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں کے بعد کے حالات بھی پیش کیے گئے ہیں۔اس ناول کے بارے میں شاہد نواز اپنی کتاب پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ میں یوں رقم طراز ہیں۔

''پاک بھارت جنگ شروع ہوئی تو پاکستانی معاشرہ ایک دم جیسے کایا کلپ کا شکار ہو گیا۔وہی لوگ جو ایک دوسرے کے دشمن اور مختلف اکائیوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔یکجا ہو گئے۔یہ منظر نہایت حیرت انگیز تھا۔بلاشبہ جنگ محاذ جنگ کے ساتھ ساتھ نفسیاتی سطح پر بھی لڑی جاتی ہے۔اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۶۵ء کی جنگ میں پاکستانی حکمران مخصوص حالات اور شہر کے ذریعے عوام کو نفسیاتی طور پر مضبوط اور یکجا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔''

پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء سے پہلے ملک بہت سارے سیاسی اور معاشی مسائل کا شکار تھا۔آئے روز پڑتالیں اور جلسے جلوس سڑکوں پر نکل رہے تھے۔اگرچہ فوجی حکومت تھی لیکن پھر بھی حالات سازگار نہیں تھے۔لیکن جونہی ۶ ستمبر کی

درمیانی شب کو جب بھارت نے پاکستان پ رحملہ کر دیا تو سب سے پہلے ہماری بہادر افواج نے اُن کو بھر پور جواب دیا اور اُن کا لاہور کی طرف پیش قدمی روک دی۔ میجر راجہ عزیز بھٹی شہید جیسے سپاہیوں نے دشمن کو ناکوں چنے جبوا دیئے۔ اور اس وقت کے صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ریڈیو پاکستان پر پاکستانی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج دشمن ملک نے ہمارے ملک پر حملہ کر دیا ہے۔ اور دشمن کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اُس نے کِس قوم کو للکارا ہے۔ پاکستانی فوج اور پاکستانی عوام دنیا کی بہادر ترین اقوام میں شمار ہوتی ہیں۔ اُس وقت تفریح کا واحد ذریعہ ریڈیو تھا۔ ریڈیو پاکستان کے لاہور، کراچی، پشاور اور ڈھاکہ کے اسٹیشنوں سے دن رات صدرِ پاکستان کا خطاب نشر ہوتا تھا۔ اور عوام کو حوصلہ مند رہنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو پاکستان سے ہمارے قومی شاعروں کے لکھے ہوئے ملی اور جنگی ترانے بھی عوام اور فوج کا لہو گرماتے رہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے ملکہ ترنم نور جہاں اور شوکت علی کے ملی نغموں نے نہ صرف پاکستان بلکہ بھار میں بھی اپنی ڈھاک بٹھا دی۔ نور جہاں کا پنجابی گانا ''ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وِکدے'' بہت مشہور ہوا۔ اور شوکت علی کا گایا ہوا گانا ''جاگ اُٹھا ہے سارا وطن'' بہت مقبول ہوا۔ ناول نگار خالدہ حسین نے اپنے اس ناول میں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے واقعات اور اُس کے بعد حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اس ناول میں انھوں نے واہگہ بارڈر پر عزیز بھٹی شہید کے کارنامے بھی بیان کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے چونڈہ کے مقام پر بھارتی ٹینکوں کو تباہ کرنے کا حال بھی بیان کیا ہے۔ جہاں پر ہمارے فوجی اور سِول لوگ اپنے سینوں پر بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے نیچے لیٹ گئے تھے اور بھارتی ٹینک نہ صرف تباہ ہو گئے بلکہ جو بچ گئے وہ واپس بھاگتے ہوئے اپنے ہی ٹینکوں اور فوجیوں پر چڑھ کر اُن کی مزید تباہی و بربادی کا سبب بنے۔ مجموعی طور پر اس ناول میں حب الوطنی کے بہت سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ جن میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا ماحول اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کا ذکر ہے۔

حاصل گھاٹ (۲۰۰۳ء)

حاصل گھاٹ، بانو قدسیہ کے ان ناولوں میں سے ہے جس میں انہوں نے آزادی کے بعد درپیش مسائل کی عکاسی کی ہے۔ حاصل گھاٹ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول بانو قدسیہ نے ہجرت کرنے والوں کے نام کیا ہے۔

ناول کے شروع میں مرکزی کردار اپنے گھر کا جغرافیائی محل وقوع بتاتا ہے جو امریکہ میں نئی امریکی طرز

زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

''ہمارا نوساختہ گھر پہلی منزل پر ہے۔ گیراج سے نکلتے ہی لش لش چمکتی پکی سڑک ہے۔ یہ سڑک سرکاری نہیں۔ اس ایریا کی ہاؤسنگ نے اسے تعمیر کیا ہے، لیکن اپنی پختگی، صفائی، ستھرائی میں یہ کسی بھی ہائی وے کو مات کرتی ہے۔ امریکہ کا عمومی معجزہ جینز سڑکیں اور سوپر مارکیٹ ہیں۔ یہاں یورپ جیسے میوزیم، گرجا گھر اور ثقافتی عجائب گھر اپنی جغرافیائی شکل میں نہیں ہیں۔''(۱۹)

یعنی ہمارا نوساختہ گھر عمارت کی پہلی منزل پر ہے گھر کے باہر صاف اور چوڑی سڑک ہے۔ جس کو علاقے کی ہاؤسنگ اسکیم نے تعمیر کروایا ہے۔ صفائی کے لحاظ سے یہ سڑکیں ہائی وے کے ہم پلہ ہیں۔ سوپر مارکیٹ ہیں، گرجا گھر، ثقافتی عجائب اور میوزیم یورپ جیسے ہیں۔ گھر اور گھر کے ماحول کی منظر نگاری وطن سے محبت کی ایک جہت ہے۔ جو اس ناول میں نمایاں نظر آتی ہے۔

امریکہ ابھی ابھی آزاد ہوا ہے اسی لیے امریکی جب یورپ کی پرشکوہ تہذیب سے بسی بستیوں کو دیکھتے ہیں تو بے مہر اطالوی، فرانسیسی، جرمن باشندے انہیں ہیچ اور نودولتے سمجھ کر درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ پرانی تہذیبوں کے ٹھیکے دار لمبے تڑنگے، ڈھیلے ڈھالے ان کو ابرو اٹھا کر دیکھنے کے عادی تھے۔

نہ جانے قدرت نے ان سے بدلہ لینے کی ٹھانی کہ پھر انہیں اونچے شملے والوں کو اس چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا پڑا کہ اب امریکی جامعات، بازاروں، دفاتر غرض سارے شعبہ ہائے زندگی میں تارکین وطن کا ایک ریلا بہہ رہا ہے۔

ان سطور میں ناول نگار گاؤں سے تعلق کو نہایت خوبی سے بیان کرتی ہیں کہ گاؤں میں رہنے والا فوک وزڈم سے مالا مال ہوتا ہے۔ جنگلوں میں رہنے کے باعث آدمی کا ذہن تروتازہ رہتا ہے۔ اس میں تازگی، معصومیت اور بے ساختگی ہوتی ہے۔ یعنی ایک کسان کا جسم جاندار ذہنیت کو جنم دیتا ہے۔ بانو قدسیہ یوں رقم طراز ہیں:

''ہمارا گھرانہ گاؤں سے آیا تھا۔ اپنے ساتھ ہم گاؤں والوں کی خود اعتمادی بھی لائے تھے۔ درختوں، کھیتوں، جنگلوں میں رہنے کے باعث پرندوں جانوروں کی ہم جنسیت کی وجہ سے گرائیں کا ذہن تروتازہ ہوتا ہے۔ وہ تجربے سے سیکھتا اور فوک وزڈم پر بھروسہ کرتا

ہے۔ اس میں وہی معصومیت، اکھڑ پن، سادگی اور بے ساختگی بھی ہوتی ہے جو گاؤں والوں کے رسم ورواج اور لوک ریت میں نظر آتی ہے۔ کھیتوں میں گھومتے پھرے دیہاتی تازہ سبزی، گنے، بیر، پیلو، کروندے غرض کہ ہر تازہ چیز کو بہ آسانی منہ مار سکتا ہے۔ چوں کہ کسان کی خوراک دودھ، دہی، مکھن، لسی، تازہ غلے اور گڑ شکر کا مجموعہ ہوتی ہے، اس لیے اس کا توانا جسم جاندار ذہنیت کو جنم دیتا ہے۔ وہ چلے چلتے اکھان بناتا اور زندہ رکھتا ہے۔ پینڈو کی زندگی اس کے تجربے اور مشاہدے کی عکاس ہوتی ہے۔ اس نے ان تمام فصلوں پھل، ترکاریوں کا عینی مشاہدہ کیا ہوتا ہے جس کا وہ ذکر کرتا رہتا ہے۔ شہری انسان کا علم کتاب، میڈیا اور سنی سنائی کا مرہون منت ہوا کرتا ہے۔ کئی بار شہری کو اپنے شہر کا جغرافیائی نقشہ بھی معلوم نہیں ہوتا اور ان اشیاء کی واقفیت بھی نہیں رکھتا جن کا خرچ اس کی جیب پر بار ہوتا ہے لیکن وہ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے نہیں ٹلتا اور اپنے اکتسابی علم کی شیخی بگھارنے سے باز نہیں آتا۔'' (۲۰)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ گاؤں سے تعلق ہونے کے باعث انسان میں خوش اعتمادی آتی ہے۔ درختوں، کھیتوں اور جنگلوں میں رہنے کے باعث ذہن تروتازہ رہتا ہے۔ ایک کسان نے مختلف پھلوں اور سبزیوں کا عینی مشاہدہ کیا ہوتا ہے لہذا وہ نہایت آرام سے ان کا ذکر کرسکتا ہے جب کہ شہر میں بسنے والے کو تو اکثر شہر کا نقشہ تک معلوم نہیں ہوتا۔ شہری انسان کا علم کتابوں، میڈیا اور سنی سنائی باتوں کا مرہون منت ہوتا ہے۔

یہاں، پر آپا چودھرائن اور ساندہ میں اپنے گھر کا ذکر کرتے ہوئے ناول نگار بیان کرتی ہیں کہ ساندہ میں رہتے ہوئے ہم نچلی منزل پر رہائش پذیر تھے جہاں تین کمرے تھے۔ جن میں ایک بیٹھک تھی۔ ایک کمرے میں آپا چودھرائن رہتی تھی جو ہم پر رعب جھاڑتی تھیں۔ بانو قدسیہ یوں رقم طراز ہیں:

''جب ہم ساندہ میں رہا کرتے تھے تو نچلی منزل میں ہمارا قیام تھا اور اوپر والی منزل کے اکلوتے کمرے میں شاہد بھائی رہا کرتے تھے۔ نیچے صرف تین کمرے تھے۔ ایک تو بیٹھک تھی جس میں بید کی کرسیوں کو لٹھے کی چولیاں پہنا کر پردہ پوش شکل دی گئی تھی۔ ایک

کمرہ ابوامی کا تھا جس میں زیادہ وقت ابوا کیلے رہا کرتے۔ دوسرے کمرے میں آپیا چودھرائن تھیں اور ہم تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کو سانٹا مارکرسٹ ڈاؤن سٹینڈ اپ کرایا کرتی تھی۔ وہ میرے ہوش سے پہلے کی استانی تھیں۔ ان کو یہ زعم تھا کہ ساری کائنات سے بہتر جانتی ہیں۔''(۲۱)

حب الوطنی کی ایک جہت اپنے گھر کو یاد کرنا ہے اور اس کا ذکر کرنا ہے۔ یہاں ناول نگار اسی جہت کا ذکر کرتی ہیں کہ ساندہ کی دومنزلہ عمارت میں اوپر والی منزل پر شاہد بھائی رہتے تھے جب کہ نچلی منزل پر ۳ کمرے تھے۔ ایک کمرے میں آپا چودھرائن رہتی تھی جو بہت پرانے دور کی استانی تھیں اور انہیں یہ وہم رہتا تھا کہ وہ کائنات میں سب سے زیادہ علم رکھتی ہیں اور وہ سب سے بہتر جانتی ہیں۔

اسی طرح بہت سی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے بانو قدسیہ مزید لکھتی ہیں کہ آپا سے چھوٹنے کے لیے ہمیں رفعت آپا سلا دیتی تھیں رفعت آپا بڑی تھی اور بڑے ہونے کے ناطے انہیں بہت سے حقوق حاصل تھے جو ہمیں حاصل نہیں تھے۔ وہ یوں رقم طراز ہیں:

''ساندہ کلاں کا یہ گھر پرانا تھا۔ اس میں کئی برسوں سے سفیدیاں نہ ہوئی تھیں۔ ہمارے کمرے کی سفیدی جا بجا سے اکھڑی ہوئی تھی۔ آپا کے ڈر سے میں آنکھیں تو بند کر لیتا لیکن نیند کوسوں دور ہوتی۔ میری دائیں جانب کھڑکی میں سے سٹریٹ لائیٹ آتی تھی، اس کی روشنی سیدھی اس دیوار پر پڑا کرتی جس طرف ظفر سوتا تھا۔ اسی دیوار پر سفیدی کچھ اس طرح اکھڑی تھی کہ ایک چیتا اندھیرے میں لپکتا نظر آتا۔ مجھے اس چیتے کے اصل ہونے کا یقین تھا۔ وہم وگمان کی دنیا کا چیتا دیکھتے ہی دیکھتے رنگ اختیار کر لیتا۔ اس کی آنکھیں زرد شعلے برسانے لگتیں..... چہرے کی چتیوں کا سفید اور سیاہ رنگ واضح ہو جاتا..... مجھے چیتے کی آواز بھی آنے لگتی۔ آہستہ آہستہ ٹوٹی پھوٹی دیوار کی سفیدی سے بنی ہوئی یہ وہم وگمان کی شبیہ مجھے حقیقتاً رضائی یا چادر سے چہرہ ڈھانپنے پر مجبور کر دیتی۔''(۲۲)

ساندہ کلاں میں جو ہمارا گھر تھا اس میں کوئی برس سے سفیدی نہیں کروائی گئی۔ جب رفعت آپ سلاتیں تو

بچے آپا چودھرائن کے ڈر سے آنکھیں بند کر لیتے مگر نیند ان آنکھوں کا مقدر نہ ہوتی۔ دائیں جانب کھڑکی سے باہر اسٹریٹ لائیٹ روشن تھی جس کی روشنی کمرے کی دیوار پر پڑتی اور دیوار چیتے کا ایک سایہ بن جاتا جو دیکھتے دیکھتے اصلی محسوس ہونے لگتا حتی کہ اس کی آوازیں بھی آنے لگتیں۔ جو اسے لحاف کے اندر دبک جانے پر مجبور کر دیتی۔

بانو قدسیہ نہایت خوبصورتی سے بچپن کی یادوں کو لکھتی ہیں جو کہ حب الوطنی کی ایک جہت ہے۔ ان سطور میں ناول نگار مشرق اور مغرب کی درمیان دوری اور فاصلے کو سورج کے ذریعے دیکھتی ہیں کہ کیسے پاکستان میں سورج طلوع ہوتا ہے تو امریکہ میں رات ہوتی ہے اور امریکہ میں صبح نمودار ہوتی ہے تو پاکستان میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ بانو قدسیہ رقم طراز ہیں:

> ''میرے دماغ کی سکرین پر امریکہ اور پاکستان دونوں باری باری اور کبھی ساتھ ساتھ بھی چلتے ہیں۔ میرے اردگرد کپلنگ کا مقولہ گھومتا رہتا ہے کہ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق، یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔ سوچتا ہوں مل بھی کیسے سکتے ہیں؟ مشرق میں جب سورج چڑھتا ہے، مغرب میں عین اسی وقت آغاز شب کا منظر ہوتا ہے۔ سورج انسان کے دن اور رات کو متعین کرنے والا ہے۔ پھر جب ایک کی رات ہو اور دوسری جگہ سورج کی کرنیں پھیلی ہوں تو بھلے ہی سارے فرق مٹا ئیے، ایک مخلوق سوتی ہے دوسری جگہ بیدار ہوتی ہے۔ فاصلے کم ہونے میں نہیں آتے۔ مشرق کے لوگوں کی رنگ اور مغربی لوگوں کی جلد دوسرا فاصلہ ہے جسے عام انسان پاٹ نہیں سکتا۔''(۲۳)

یہاں بانو قدسیہ نہایت مہارت سے ان الفاظ سے سوچ کو زبان بخشتی ہیں جو کسی بھی غریب الوطن شخص کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ یعنی وہ سوچتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔ دونوں الگ ہیں، مختلف اور جدا۔ یعنی سورج جب مشرق میں افق پر نمودار ہوتا ہے تو مغرب میں اندھیرا پھیلنے لگتا ہے اور جب مغرب میں نکلتا ہے تو مشرق میں اندھیرا۔ یعنی سورج طلوع ہونے سے ایک قوم سوتی ہے تو دوسری جاگ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے یہ قومیں کبھی ایک جیسی نہیں ہو سکتی ہیں۔ تضاد رہے گا۔ امریکہ اور پاکستان کے دن اور رات کا ذکر یعنی کبھی پاکستان میں دن اور امریکہ میں رات۔ ایک قوم سو رہی ہوتی ہے تو دوسری جاگ رہی ہوتی ہے۔ یہ ذکر بھی حب الوطنی کا عکاس

ہے۔

بانو قدسیہ نے اس ناول میں مشرق و مغرب کے تضاد کو کھول کے رکھ دیا ہے۔ نئی نسل تو مغرب کی چکا چوند سے مانوس ہے اور مغلوب ہے۔ مگر بزرگ لوگ جنہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ملک کو بنتے دیکھا ہے انہیں دھرتی ماں سے پیار ہے۔ بانو قدسیہ یوں رقم طراز ہیں:

''دادا زمین سے وابستہ کسان تھا۔ اسے دھرتی ماں سے بھی پیاری تھی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر آ تو گیا لیکن اپنی زمین کے بغیر زیادہ عرصے جی نہ سکا۔ اندر ہی اندر اسے گاؤں کے گھر، وٹ بنے، کنویں، شہتوت اور لوکاٹ کی جھنگی، پکی سڑک تک جانے والا کچا رستہ، کھلے میدان، ہرے بھرے کھیت، گلی ڈنڈا کھیلتے بچے، یکے پر آتی جاتی سواریاں، لسی کے ڈول، مکھن بھرے سلور کے کٹورے یاد آتے رہے..... دادا گلی میں چارپائی ڈال کر نہ جانے کس کس بات کو کن زاویوں سے یاد کرتا رہتا۔ اس گلی میں زیادہ تر سفید رو، کشمیری اور مغل پٹھان گھرانے آباد تھے۔ گلی میں آتے جاتے لوگ دادا کی عمر کا لحاظ تو کرتے اور سلام دعا کا سلسلہ بھی جاری رہتا..... لیکن ان کا بھی جی چاہتا کہ دادا اندر جا کر نہا لیں، خاص گرمیوں میں جب دادا پگڑی سے لے کر نری کی جوتی تک پسینے میں نہایا نظر آتا۔ لوگوں کی یہ خواہش شدید تر ہو جاتی۔ اس گلی کے سفید باسی دادا کے رنگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔''(۲۴)

شہری زندگی بالکل مختلف طرز زندگی ہے۔ شہری ترقی کا ایک گن یہ بھی ہے کہ اس میں عام شہری دیر یا بہت سوچ بچار کے بعد فیصلے نہیں کرتے۔ عام طور پر امریکی لوگ وقتی فیصلہ کرتے ہیں۔ جذبات کے چڑھاؤ کے بعد اس کے اتار کے متعلق ان کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ جب کہ اس کے برعکس دیہات کے رہنے والے لوگ اور انکا طرز فکر یکسر مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح دادا بھی اپنے گاؤں اور دھرتی کو کبھی نہ بھول پائے۔ انہیں جذباتی حد تک لگاؤ ہے اپنی زمین اپنی دھرتی سے۔ اسی لیے جب وہ دھرتی سے الگ ہوئے زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے۔ وہ سارا دن گلی میں چارپائی بچھائے نہ جانے کن سوچوں میں گم رہتے۔ محلے کے مغل، پٹھان اور دیگر لوگ آتے جاتے انہیں سلام کرتے مگر وہ نہ

جانے کن سوچوں میں کھوئے رہتے حتی کہ پگڑی جوتے پسینے میں بھیگ جاتے۔

قیصر اور جمشید رات کو لیٹے نانا سے پوچھتے ہیں کہ لاہور کیسا ہے۔جس پر نانا کہتے ہیں کہ لاہور کے تین حصے ہیں۔ایک نیا لاہور جو نہر کے بائیں طرف آباد ہے۔ایک حصہ دائیں طرف آباد ہے اور ایک پرانا لاہور ہے جہاں سب پرانی مغلیہ اور سکھوں کے دور کی داستانیں ملیں گی۔بانو قدسیہ یوں رقم طراز ہیں:

''تم لاہور آ کر دیکھو تو پتہ چلے ناں.....لاہور کے تین حصے ہیں۔ایک شہر نیا ہے جو نہر کے بائیں طرف آباد ہے گلبرگ، ڈیفنس، ماڈل ٹاؤن۔ یہاں پر امیر لوگوں کی بستیاں ہیں۔ پھر دائیں طرف وہ شہر آباد ہے جہاں سکول کالج، بازار اور سرکاری افسروں کی وزیروں کی اور متوسط لوگوں کی ملی جلی آبادیاں ہیں۔ مال روڈ ہے، باغ جناح ہے اور پھر کچہری اور گورنمنٹ کالج سے آگے پرانا شہر ہے..... مغلیہ دور کی نشانیاں، سکھوں کے عہد کی داستانیں یہاں ملتی ہیں تیسرے لاہور میں۔''(۲۵)

جمشید اور قیصر کے استفسار پر نانا بتاتے ہیں کہ لاہور کے تین حصے ہیں۔ نیا لاہور جس میں گلبرگ، ڈیفنس اور ماڈل ٹاؤن ہے۔جو امیر لوگوں کی بستیاں ہیں۔پھر بائیں جانب شہر کا وہ حصہ ہے جہاں اسکول، کالج، بازار، سرکاری افسر، وزیر اور متوسط طبقے کی ملی جلی آبادیاں ہیں ماڈل ٹاؤن کہلاتا ہے۔باغ جناح، کچہری اور گورنمنٹ کالج سے آگے پرانا لاہور ہے جہاں مغلیہ دور کی، سکھوں کے عہد کی داستانیں ملتی ہیں۔لاہور شہر کا ذکر بھی دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے کیونکہ انسان ہمیشہ جس چیز یا علاقے سے محبت کرتا ہے ہمیشہ اُسی کا ذکر کرتا ہے۔جمشید اور قیصر کا نانا سے لاہور کے بارے میں پوچھنا اور نانا کا بتانا حب الوطنی کے زمرے میں آتا ہے۔

مسلمان اپنے ملک سے باہر جا کر اپنے مذہب کا زیادہ پیروکار بن جاتا ہے۔بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''چاچا جی عجیب سی مشکل ہے.....لیکن آپ سے کیا پردہ..... جب ہم پاکستان میں تھے تو ہم دونوں کچھ ایسے پکے مسلمان نہیں تھے۔ میں نے کبھی سر پر دوپٹہ نہیں لیا تھا۔حسن صرف عیدوں پر نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے، لیکن یہاں آ کر ہم نے دیکھا کہ یہاں بہاؤ تیز ہے۔اگر ہم نے اپنی شناخت قائم نہ رکھی تو ہم بہہ جائیں گے۔اکثریت کے ساتھ۔ان کا

دم چھلا بن کر۔'' (۲۶)

کوئی بھی شخص اپنی تہذیب یا مذہب کے دھاگے کو کچا کرے گا تو وہ دوسری تہذیبوں کا دم چھلا بن جائے گا۔ اپنی شناخت کھودے گا۔ ایسا ہی ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو پاکستان سے باہر بیرون ملک میں ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی شناخت قائم رکھنے کے لیے تگ ودو کرنی پڑتی ہے ورنہ وہ کالے انگریز بن جاتے ہیں۔ دو تہذیبوں کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔ یعنی نام سے مذہب کوئی اور اعمال سے کوئی اور۔ امریکہ میں ویسے بھی تہذیبوں کا بہاؤ تیز ہے اگر کوئی بھی دوسرے مذہب کے ماننے والا، اگر مضبوطی سے اپنے مذہب کے دھاگے سے نہیں بندھے گا تو بے نام پھرتا رہے۔ مذہب سے رغبت بھی حب الوطنی ہے۔

بیرون ملک خاص طور پر مغربی ممالک میں مسلمانوں کے لیے زندگی مشکل ہے۔ وہ ہر وقت دو کشتیوں میں سوار رہتے ہیں کہ کس طرف جائیں۔ کون سی تہذیب کو اپنائیں وہ کش مکش میں ہی مبتلا رہتے ہیں۔ اسی کشمکش کی عکاسی بانو قدسیہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''پتہ ہے چاچا جی! ان دنوں ہم چوبر جی کے پچھواڑے رہتے تھے۔ تب وہاں زیادہ آبادی نہیں تھی۔ ایک دوپہر کو کالی آندھی آئی..... ہم گراؤنڈ میں کھیل رہے تھے میرا دوپٹہ ہوا میں اڑ گیا..... میں بیٹھی رہی بیٹھی رہی چاچا جی، لیکن مجھے ڈر نہیں آیا..... ایسا ڈر نہیں آیا جو اس ہوا سے آ رہا ہے.....

آندھی میں دوپٹہ گنوا بیٹھنے والی لڑکی کے خوف کو سمجھنے کی کوشش میں ہم دونوں دوسرے بلاک میں پہنچ گئے۔'' (۲۷)

دو تہذیبوں کے رکھوالوں کے ساتھ عجیب معاملہ رہتا ہے۔ یعنی مغربی تہذیب میں اپنی اقدار کا بقار چاہے بھی ہو اور اقلیت بھی نہ گردانا جائے۔ وہ بھی اسی الجھن میں ہے جب وہ چاچا جی کو اپنا دوپٹہ اڑنے کا واقعہ سناتی ہے۔ یہ صرف ناول نہیں ہے یہ حقیقتاً ان لوگوں کی الجھن ہے جو مغرب میں رہتے ہیں۔ اور ان کا ضمیر انہیں اپنی اقدار سے جڑے رہنے کو اکساتا ہے۔

انسان ہر حال میں ناشکرا رہنے والی مخلوق ہے۔ اس کا دل جلد چیزوں سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ جب غریب

ہوتا ہے تو اسے جسمانی دکھ چمٹے رہتے ہیں۔ ناداری کا حملہ جسم پر ہوتا ہے مگر دولت مند ہوتے ہی اس کی جسمانی ناداری ختم ہوجاتی ہے مگر روح انگڑائی لے کر بیدار ہوجاتی ہے اور مطالبات پیش کرتی ہے۔ اور پھر اب غیر مرئی ضرورتیں، نظریات، ذہنی ونفسیاتی الجھنیں، سوال اندر سوال، سوچ اندر سوچ کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ایسے وقت میں روح کی بیزاریاں بڑھنے لگتی ہیں۔ ناداری میں تو مسائل درپیش ہوتے ہیں وہ جیتے جاگتے مسائل ہوتے ہیں مگر آسودگی کے مسائل روح کو بیمار اور لاغر کر دیتے ہیں۔

ان الفاظ کو ناول نگار یوں قلم بند کرتی ہیں:

> ''جب قیام پاکستان کے بعد ہم لاہور پہنچے تو ہمارے جیتے جاگتے مسائل تھے۔ روٹی پانی رہائش کا جھگڑا تھا۔ بچوں کی تعلیم، شادی، روزمرہ کے اخراجات ہر کمرے میں مسئلے ڈگڈگی بجاتے پھرتے تھے..... لیکن اماں ابا، دادی دادا اندر سے شانت تھے۔ ان کے بہتر ٹھنڈے فوارے چلتے تھے..... وہ خوش تھے کہ انہوں نے پاکستان پالیا۔'' (۲۸)

یعنی جیتے جاگتے مسائل روٹی پانی، رہائش کا مسئلہ، تعلیم شادی، روزمرہ کے اخراجات وغیرہ۔ مگر ان مسائل کے ہوتے سب بزرگ مطمئن تھے کہ پاکستان میں آ گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب ہم لاہور آئے تو بڑے مسائل تھے لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا تھا۔ پاکستان حاصل کر لینے کی خوشی وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

اس ناول میں بانو قدسیہ اپنے ہجرت کے واقعات کے ساتھ اپنے وطن پاکستان میں بسنے کے بعد کے مصائب اور دکھوں کے ذکر کے ساتھ ملک سے دوری میں رہ کر ہر وقت اپنے دیس، مذہب اور اس کی عزت کے بارے میں سوچنا، انسان کا اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے جبر سے کام لینا اور ہر وہ کام کرنا جس سے ملکی وقار بلند ہو۔ اور ان کاموں سے اجتناب برتنا جو ملکی وقار کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں پاکستان سے محبت اور پالستانیت کی بہترین مثالیں ہیں۔

خس وخاشاک زمانے (۲۰۱۳ء)

مستنصر حسین تارڑ کا یہ ناول ۲۰۱۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس ناول میں وطن سے محبت کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔ انسان کی جائے پیدائش اس کے لیے بہت کشش کا باعث ہوتی ہے۔ انسان کہیں بھی چلا جائے اُسے اپنے آبائی گھر کی کشش ہمیشہ تنگ کرتی رہتی ہے۔ تارڑ نے ایسی ہی صورت حال بیان کی ہے:

> ''گاؤں کی یہی کھینچ یہی کشش اُسے اکثر دنیا پور لے آتی ہے۔۔۔ وہ اپنے آبائی گھر کے زنگ آلود قفل کھولتی، شیداں ماچھن اور نذر میراثی کی بیوی کی مدد سے جھاڑ پونچھ اور صفائی ستھرائی ایسے کرتی کہ اُس گھر کی وہی قدیمی شکل نکل آتی جس میں اُس کا باپ نمبردار، ماں بہشت بی بی اور بہن ماہلو چلتے پھرتے نظر آنے لگتے۔۔۔ دھریک کے سائے میں اُس کی بڑی بہن نور بیگم چرخہ کاتنے لگی۔'' (۲۹)

نور بیگم کی شادی لاہور شہر میں ہوئی تھی۔ لیکن اُس کا اپنے آبائی گاؤں دنیا پور سے مسلسل رابطہ تھا۔ وہ اکثر اوقات اپنے باپ کے گھر میں آتی اور گاؤں کے کمیوں کو ساتھ لگا کر گھر کی صفائی کراتی۔ یہی چیز اپنے گھر اور وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

ہر انسان اپنے علاقے، وطن اور گھر سے محبت کرتا ہے۔ خصوصاً وہ جہاں پیدا ہوتا ہے۔ ایسا ہی درج ذیل اقتباس تارڑ نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

> ''دنیا پور مڈھ قدیم سے جاٹ کاشتکاروں کی ایک بستی چلی آتی تھی اور یہ پنجاب کے بیشتر دیہات کی مانند ہندوستان کی دھڑکتی شہہ رگوں، سیاسی اُتار چڑھاؤ اور زمانے کی رفتار سے الگ تھلگ جنگلوں بیلوں ویرانوں اور دریا کناروں آباد ایسی بستی نہ تھی کہ دو چار سو برس ادھر یا اُدھر ہو جائیں تو بھی اُسے کچھ فرق نہ پڑے اور وہ ویسی کی ویسی ہی رہے جیسی کہ وہ کبھی تھی۔۔۔ دنیا پور ذرا جدا تھی۔۔۔ جی ٹی روڈ اُس کے کناروں سے الگ کر لاہور یا دلی کی جانب چلی جاتی تھی یا شائد وہاں سے چلی آتی تھی اور پشاور پہنچ جاتی تھی۔۔۔ اُس کے

پہلو بہ پہلو ریلوے کی پٹڑی بھی جاتی تھی اور آتی تھی۔'' (۳۰)

درج بالا اقتباس میں ناول نگار نے دنیا پور کے علاقے کا تعارف بیان کیا ہے۔ یہاں پر جاٹ رہتے تھے۔ ملک بھر میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے باوجود یہاں پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جی۔ٹی روڈ یہاں سے ہو کر لاہور یا دلی کی طرف چلی جاتی تھی۔ علاقے اور لوگوں کا تعارف وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ امیر بخش اور سوھن سنگھ کی گفتگو ہو رہی ہوتی ہے۔ امیر بخش لاہور جا رہا ہوتا ہے، سوھن سنگھ پوچھتا ہے کہ کہاں جا رہے ہو۔ امیر بخش بتاتا ہے کہ وہ لاہور جا رہا ہے۔ پھر وہ قائداعظمؒ کے بارے میں پوچھتا ہے تو امیر بخش یوں بتاتا ہے:

> ''یہ جو ہمارے حضرت قیدِ اعظمؒ ہیں ناں سوہنیا..... یہ ہم مسلمانوں کی آس امید ہیں..... جیسے تمہارے گورو گوبند سنگھ نے سکھوں کو ایک الگ شناخت دی تھی ایسے یہ بھی ہمارے گورو ہیں جو ہمیں ہماری پہچان دے رہے ہیں..... وہ ہمارے لیے ایک اپنا ملک پاکستان حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کر رہے ہیں، جہاں ہم مسلمان اپنی من پسند زندگی گزاریں گے.....'' سوہن سنگھ نے اپنے آس پاس، نسبت روڈ پر، ٹھنڈی سڑک پر اور یہاں محلّہ قادر بخش میں اس پاکستان کے نعرے تو سُنے تھے پر اُسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کسی الگ دھرتی کا نام ہے۔'' (۳۱)

امیر بخش بتاتا ہے کہ قائداعظم مسلمانوں کے عظیم رہنما ہیں۔ وہ پاکستان بنانے کے لیے دن رات محنت کر رہے ہیں۔ پاکستان الگ وطن ہوگا۔ جہاں مسلمان اپنی زندگیاں آزادی سے گزاریں گے۔ پاکستان ایسا ملک ہوگا جہاں مسلمان امن سے رہیں گے۔ امیر بخش کا قائداعظمؒ اور پاکستان کے بارے میں اظہار خیال وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

امیر بخش اپنے دوست سوھن سنگھ کے ساتھ شہر سے اپنے گاؤں کوٹ ستار جا رہا تھا۔ حالات بہت بگڑ چکے تھے۔ لیکن امیر بخش کو اپنے گھر جانے کی کشش کھینچ لائی تھی۔ راستے میں ان کے ساتھ ایک واقعہ بھی پیش آیا۔ تاہم وہ بچ بچا کر گھر پہنچ گئے۔ گھر کی صورت حال تارڑ نے کچھ اس طرح بیان کی ہے:

> ''امیر بخش اپنے بچپن کے صحن میں داخل ہوا تو چھت تک پہنچتی ماں کے ہاتھوں کی پوچی ہو

ئی سیڑھیاں اُس کے۔۔۔اُترتی گئیں اور اُس کی ماں کے لیپ کرتے ہاتھ اُس کے بدن کو یُوں تھپکنے لگے شکایت کرتے ہوں کہ بہت عرصے کے بعد گھر لوٹے ہو۔۔۔سب سے آخری سیڑھی پر دھوپ کا وہی دھیما سہانا پن ابھی ٹھہرا ہوا تھا۔۔۔اُس نے اپنے سفید ہاتھ پھیرتے ہوئے نظریں اُٹھا کر بیری کے جھاڑ دار اونچے ہوتے درخت کو دیکھا جو اس صحن کا گہنا تھا اور وہاں بھی اونچی شاخوں کے پتوں میں وہی بجھتی ہوئی دھوپ تھی اور وہ پتے کچے سونے سے تراشیدہ لگ رہے تھے۔'' (۳۲)

امیر بخش جب اپنے گھر میں داخل ہوا تو وہ بہت خوش تھا گھر کے در و دیوار اُس سے شکایت کر رہے تھے کہ بہت عرصے بعد واپس آئے ہو۔امیر بخش نے آنکھ اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا تو کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔امیر بخش کا گھر جانا اور گھر کے در و دیوار کا ذکر کرنا وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

پاکستان بن چکا تھا۔آل انڈیا ریڈیو کی جگہ ریڈیو پاکستان کی آواز بجنے لگی۔ایسی ہی صورت حال کو تارڑ نے یوں بیان کیا ہے:

''ایسا آیا جب آنکھیں دیکھنے لگیں تو کان بھی آواز سے آشنا ہونے لگے اور اُس کے کانوں میں ایک نامانوس صدا آئی دُھند میں تیرتی ایک اجنبی صدا آئی..... یہ ریڈیو پاکستان ہے.....

ریڈیو پاکستان.....

ایک صدا اپنا ملک کیسے بدل سکتی ہے.....

اُس کے کانوں کو، یہ آل انڈیا ریڈیو ہے سننے کی عادت تھی.....

پر اُسے یہ نامانوس صدا..... یہ ریڈیو پاکستان ہے.....اچھی لگی.....'' (۳۳)

امیر بخش قیام پاکستان سے پہلے ریڈیو پر صرف یہی آواز سنتا تھا'' آل انڈیا ریڈیو لاہور'' لیکن اب اُس کے کانوں میں نامانوس آواز آئی۔۔۔یہ ریڈیو پاکستان ہے'' بہت اچھی لگی۔یہ آواز اُس کے دل و دماغ پر اثر کر گئی۔ ریڈیو پر نامانوس آواز سننا'' یہ ریڈیو پاکستان ہے'' وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

امیر بخش بہت عرصے کے بعد اپنے گاؤں کوٹ ستار جا رہا تھا۔ اب پہلے کی طرح نقشہ اور راستے نہیں رہے تھے بل کہ اب تبدیل ہو چکے تھے۔ اس صورتحال کا نقشہ مستنصر حسین تارڑ نے بہت پر کشش انداز میں کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کوٹ ستارہ کے نقشے اور راستے بدل چکے تھے.....وہ دن گئے جب گجرات کے ریلوے سٹیشن سے پھالیہ کا ایک تانگہ چلتا تھا اور رات گئے کوٹ ستارہ کی تاریکی میں داخل ہوتا تھا اور کُل عالم کو خبر ہو جاتی تھی کہ کوئی مہمان آئے ہیں.....وہاں اب بسوں اور ویگنوں کا ایک اڈہ تھا..... جہاں سے پھالیہ شہر کے لیے ایک ویگن نکلتی تھی اور دن بھر میں چار پھیرے لگا لیتی تھی.....ایک پٹرول پمپ کُھل چکا تھا جہاں ٹریکٹروں کی قطاریں ڈیزل کے حصول کی منتظر رہتی تھیں۔''(۳۴)

جب امیر بخش گجرات پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ اب اُس گاؤں کے نقشے اور راستے تبدیل ہو چکے تھے۔ اب وہ دن نہیں رہے جب گجرات کے ریلوے اسٹیشن سے پھالیہ شہر تک ایک تانگہ چلتا تھا۔ جو رات کی تاریکی میں کوٹ ستارہ پہنچتا تھا۔ پورے گاؤں کو پتا چل جاتا تھا کہ کسی کے گھر میں کوئی مہمان آیا ہے۔ اب گجرات اڈے سے وہ تانگہ ختم ہو چکا تھا۔ جہاں سے ایک ویگن نکلتی تھی جو دن بھر چار پھیرے لگا لیتی تھی۔ گاڑیوں کے لیے پٹرول پمپ بھی کُھل چکا تھا۔ اس اقتباس میں گجرات ریلوے اسٹیشن اور پھر کوٹ ستارہ کا ذکر کرنا وطن سے محبت کا اظہار ہے کیوں کہ جب ایک انسان کسی جگہ یا چیز سے محبت کرتا ہے تو بغیر کسی ارادے کے اس کا ذکر کرتا چلا جاتا ہے اور یہ بات انسان کو خود محسوس نہیں ہوتی۔

اے غزالِ شب (۲۰۱۳ء)

انسان کو معاشرتی حیوان کہا جاتا ہے۔ یہ جہاں پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے اور پھر کاروبار یا ملازمت کرتا ہے۔ یعنی وہ جہاں جہاں بھی رہتا ہے اُسے اُس علاقے یا شہر یا ملک سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ محبت فطری چیز ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ایسی ہی صورت حال یوں بیان کرتے ہیں:

''اُنہی دنوں سے اپنا لکھنو اور کراچی شدت سے یاد آنے لگے تھے.....ابھی دو برس پیشتر

وہ اس جذباتی یادداشت سے مغلوب ہوکر چندروز کے لئے کراچی چلا گیا اور وہاں پہنچ کر اُسے احساس ہوا کہ صرف اُس پر ہی نہیں اُس سمندر شہر پر بھی زمانے گزر چکے ہیں.....وہاں اُس کی عمر کے بیشتر لوگ دم توڑ کر خاک ہو چکے تھے.....''(۳۵)

چوں کہ عارف نقوی کا بچپن اور جوانی لکھنو اور کراچی میں گزرے تھے۔اس لئے اُسے ان شہروں سے محبت پیدا ہوگئی تھی۔اور وہ دوسال پہلے اس محبت سے مغلوب ہوکر کراچی چلا گیا،اُس کا کراچی جانا بھی وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

یہ خاتون اپنے باپ کے گھر کو تلاش کر رہی تھی۔یہ وہ گھر تھا۔جسے اُس کے باپ نے بنایا تھا۔اب یہ خاتون گھر کی محبت سے مغلوب ہوکر اپنے باپ کے گھر کو تلاش کر رہی تھی۔مستنصر حسین تارڑ اس منظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

''آج شام.....جب کہ میں کوچہ و بازار میں چلتے پھرتے مجھ پر متجسس نظریں ڈالتے لوگوں سے آنکھیں چُراتی لاہور شہر کے اندرون میں،لوہاری دروازے کے اندر گلیوں میں بھٹک رہی تھی اور میرے ہاتھ میں میرے باپ کا لکھا ہوا ایک پتہ تھا جسے میں نے تلاش کرنا تھا کہ وہ انہی گلیوں میں پلا بڑھا تھا تو یک دم میں پھر سے اُس خواب میں داخل ہو گئی.....ایک تنگ گلی تھی جس کے گرد گھیرا ڈالے قدیم جھروکوں اور شکستہ بالکونیوں والے سحر انگیز مکان سانس لیتے تھے.....اور اُس گلی میں قریب سے ہوتا ایک گھر تھا جس میں کوئی بھی نہ رہتا تھا.....اور اُس گھر کے اندر ایک کمرہ.....اُس کی گلی کی جانب کھلتی کھڑکی کے شیشے رنگین تھے.....لیکن یہ خواب نہ تھا،حقیقت تھی.....

میرا باپ مصطفےٰ اسلام اسی گھر میں پیدا ہوا تھا.....

اس نے کہا تھا جینا.....اور یہ نام اُسی نے رکھا تھا۔''(۳۶)

جینا اسلام کے باپ کا بنایا ہوا گھر تھا۔وہ اس گھر کو دیکھنا چاہتی تھی۔وہ لوگوں سے نظریں چراتی ہوئی لاہور شہر کے اندرون لاہوری دروازے کے اندر بھٹکتی ہوئی اپنے باپ کے دیئے ہوئے ایڈریس کو ڈھونڈ رہی تھی۔آخر کار

اُس خاتون نے اپنے باپ کا بنوایا ہوا مکان تلاش کر لیا اس خاتون کا اپنے باپ کا مکان تلاش کر لینا وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ کیوں کہ بہت عرصہ پہلے اُس کا باپ یہ علاقہ چھوڑ چکا تھا۔

انسان اپنے آبائی علاقے سے چاہے جتنا عرصہ دور رہے اور کوئی دوسرا علاقہ یا ملک اُسے تمام آسائش اور سہولیات بھی دے تو پھر بھی وہ اپنے علاقے، اپنی ثقافت کو نہیں بھول سکتا۔ اور اپنے وطن سے محبت کرتا رہتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ایسی ہی صورت حال کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:

> ''اور انہی دنوں جب اپنی مٹی سے جدائی اُس کا کلیجہ کاٹتی رہتی وہ روزانہ اخباروں کے ورق کھنگالتا رہتا، سراغ لگاتا رہتا کسی ایسی خبر کا جس میں پاکستان کا کوئی واجبی سا حوالہ ہو۔۔ وہ اتنا عرصہ اپنے ہم وطنوں سے جدا رہا تھا کہ اپنے آپ کو ایک لسانی ثقافتی حوالے سے بھی جرمن سمجھنے لگا تھا اور اسے احساس ہوا تھا کہ کوئی بھی مٹی کسی غیر مٹی کے بیٹے کو گود نہیں لیتی، اگر حالات اُسے مجبور کر دیں تو وہ گود لے بھی لیتی ہے لیکن کبھی اُسے اپنی گود سے اُتار بھی دیتی ہے اور تب اُسے اپنی آبائی سرزمینوں کی پکار سنائی دینے لگتی ہے۔''(۳۷)

عارف نقوی پاکستانی تھا اور بہت عرصہ جرمنی میں رہا۔ لیکن اُسے اپنے وطن سے جدائی کا غم ہر وقت ستاتا رہتا۔ وہ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کرتا تاکہ کہیں سے پاکستان کی خبر مل سکے۔ اُس نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ کوئی بھی مٹی کسی غیر مٹی کے بیٹے کو قبول کر بھی لے لیکن کبھی نہ کبھی وہ اسے اپنی گود سے اٹھا کر پھینک بھی دیتی ہے۔ پھر اُسے اپنی آبائی زمینوں کی پکار سنائی دینے لگی۔ یہی وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

انسان روزگار کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں جاتا رہتا ہے۔ لیکن اُس کی آبائی علاقے سے محبت کم نہیں ہوتی۔ ایسی ہی صورت حال تارڑ نے اس طرح بیان کی ہے:

> ''میں اس روزگار کے دوران اپنے آبائی گاؤں میں چھٹی کے دو چار روز بسر کر کے سیالکوٹ واپس جا رہا تھا اور اس دن غضب کا حبس تھا، چڑیوں کے بھی یوں دم رُکتے تھے کہ وہ درختوں سے گرتی تھیں، میں بھی گرمی اور حبس کی شدت سے ہانپتا نڈھال ایک برگد کی چھاؤں میں گھڑی دو گھڑی ستانے کی خاطر بیٹھ گیا۔ ''(۳۸)

شوکی جھوٹا کا روزگار کے سلسلے میں سیالکوٹ رہنا اور کما کر اپنے والدین کی خدمت میں پیش کرنا، اور علاقے کے موسم اور ماحول کا حال بیان کرنا وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ انسان اپنی جائے پیدائش سے لے کر قرب و جوار میں ہر علاقے سے فطری طور پر محبت کرتا ہے۔

ہر انسان کو حصول معاش کے لیے اپنے ملک سے دوسرے مما لک میں جانا پڑتا ہے۔ دوسرے مما لک میں روزگار کے اچھے مواقع ہونے کے باوجود وہ اجنبی ہی رہتا ہے۔ ایسی صورت حال کو مستنصر حسین تارڑ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ایک انسان کسی مجبوری کے تحت یا خود مختاری سے اپنی آبائی سرزمین سے جدا ہو کر بے شک ایک پرائے دیس میں..... بے شک اُس دیس میں وہ اپنے وطن کی نسبت زندگی کا زیادہ حصہ گزارے۔۔شادی کر کے بچے پیدا کر لے، اپنے تئیں اُس معاشرے کا ایک جُز بن جائے اس کے باوجود جب وہ اس دیس کو چہ و بازار میں نکلتا ہے تو اُس کے آس پاس جتنے بھی چہرے حرکت کرتے ہیں، وہ اُس کی شکل اور مہاندرے کے نہیں ہوتے، ایک الگ نسل اور زبان کے ہوتے ہیں.....اُس کے کانوں میں راہ چلتے جتنی بھی آوازیں پڑتی ہیں، آپس میں گفتگو کرتے لوگوں، سکول جاتے بچوں کی، بوڑھی عورتوں اور محبت میں مبتلا جوڑوں کی.....وہ ایک اجنبی زبان میں ہوتی ہیں چاہے وہ خود اس زبان پر عبور حاصل کر چکا ہو اور یوں وہ ہمہ وقت ایک ذہنی کھنچاؤ میں مبتلا غیر محفوظ محسوس کرتے چلتا ہے.....وہ اجنبی رہتا ہے.....'' (۳۹)

انسان روزگار کی مجبوریوں کے تحت دیار غیر میں چلا جاتا ہے۔ تمام سہولیات کے باوجود وہ وہاں اجنبی ہی رہتا ہے حالاں کہ وہاں اُس نے شادی بھی کی ہوتی ہے۔ بچے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ماحول زبان اور تہذیب و تمدن کا فرق اُسے کبھی چین حاصل نہیں ہونے دیتا۔ دیار غیر میں انسان ہمیشہ اجنبی رہتا ہے۔ یہ ساری چیزیں وطن سے محبت کا اظہار ہیں۔

وطن کیا ہے؟ وطن وہ علاقہ ہے جہاں آپ کی ضرورت ہو۔ جہاں کی تہذیب و ثقافت کے آپ عادی ہوں۔

وطن کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ یوں بیاں کرتے ہیں:

''وطن دراصل وہ ہے جہاں۔۔آپ کے وجود کی ضرورت ہو۔۔۔آپ کو چاہنے والی کچھ ایسی روحیں موجود ہوں جن کا گزارہ آپ کے بغیر نہ ہو سکے۔جس کی خوراک، آب و ہوا اور ثقافت کے آپ عادی ہو جائیں۔۔جیسے محبت کو بے شک آپ ایک رومانوی الوہی مدغم پن کہہ لیں.....لاکھ تو جیہیں گھڑ لیں،لیکن محبت صرف ایک چہرے کی مسلسل رفاقت اور اُس کی عادت ہو جانا ہے.....میں تقریباً ہر شام یہاں سے نکل کر راوی کے کناروں پر جا بیٹھتا ہوں اور اپنے آپ کو ایک تاریخی اور رومانوی فریب دیتا ہوں کہ یہ میرے پانی ہیں، میرے آباؤ اجداد صدیوں سے ان کے کناروں پر پیدا ہوتے مرتے چلے آئے ہیں لیکن.....کامریڈ.....یہ پانی اب مجھے پہچاننے سے انکاری ہوتے ہیں،ان پر میرے لئے ایک لاتعلق غیرت اور اجنبیت بہتی چلی جاتی ہے.....جب کہ ڈینوب کے پانی''(۴۰)

انسان کی پیدائش سے لے کر جوانی تک کا وقت جہاں گزرتا ہے اصل وطن وہ ہے۔کیوں کہ جوان ہونے تک وہ اپنے علاقے کی ثقافت سے آگاہ ہو چکا ہوتا ہے۔اور وہ نسل در نسل اُس علاقے میں رہتا چلا آرہا ہوتا ہے۔ اصل وطن وہی ہوتا ہے۔اور وہ اُسی علاقے سے محبت کرتا ہے۔اور یہی حُب الوطنی ہے۔

وطن سے محبت کے کئی رنگ اور جہات ہیں۔انسان کبھی اپنے علاقے کے سکول کا ذکر کر کے،کبھی موسم اور کبھی کارخانوں کا ذکر کر کے محبت کا اظہار کرتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ ایسی ہی صورت حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

''وہ بورے والا نارمل سکول سے چھٹی ہونے پر سیدھا گھر نہ جاتا تھا۔۔۔وہاں جہاں دھان چھڑنے کے کارخانے تھے۔۔۔دھوپ میں سُوت کی رنگی ہوئی سرخ، نیلی پیلی جامنی اٹلیاں سوکھتی تھیں ریلوے لائن کے پار۔۔۔ایک وسیع ویرانہ تھا جس میں آک کے بوٹوں کے سوا ہر بوٹا ہر پتہ دھوپ میں مردہ ہو جاتا تھا۔۔۔چند گرگٹ تھے جو اپنی بلوں میں سے گردنیں لامبی کر کے سونگھتے باہر آتے تھے اور وہ بھی آتش برساتی دوپہر کی تاب نہ لا کر فوراً کسی اور گرگٹ کی بل میں پناہ لے لیتے تھے۔''(۴۱)

ظہیرالدین بورے والاسکول میں پڑھتا تھا۔ یہاں پر بورے والاشہر کا ذکر ہے۔ وہ سکول سے چھٹی کے بعد سیدھا گھر نہ جاتا بل کہ دھان چھڑنے کے کارخانوں میں چلا جاتا پھر ریلوے لائن کا ذکر ملتا ہے۔ اور گرمی کے موسم کی شدت کا ذکر ہے۔ درج بالا تمام باتیں ماضی کی ہیں۔ اور وہ ماضی کو یاد کر کے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اپنے علاقے یا وطن کی کسی بھی چیز مثلاً موسم صنعت، تجارت، تعلیم ماحول زبان اور ثقافت کا ذکر کرنا بھی وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

اس دور میں (۲۰۰۱ تا ۲۰۱۵) تک کے جن ناولوں کا احاطہ کیا گیا۔ ان ناولوں میں اپنے وطن سے محبت کے عناصر بھی مختلف جہات میں نظر آتے ہیں۔ اپنے ملک پاکستان کا ذکر، اپنے گھر، شہر، محلے، پڑوس میں رہنے والوں، اپنی زمینوں اور کھیتوں کا ذکر۔ یہ تمام جہات دراصل اپنے وطن سے محبت کا اظہار ہیں۔

حاصل گھاٹ بانو قدسیہ نے لکھا تھا اس ناول میں وطن سے محبت کا اظہار درج ذیل جہات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ کیوں کہ انسان اگر حصول معاش کی خاطر ایک جگہ یا ایک ملک سے دوسری جگہ یا ملک میں ہجرت کر کے جاتا ہے۔ تو چاہے جتنا زیادہ وقت بھی گذر جائے اُسے اپنے ملک، شہر، گاؤں اور محلے کی ایک ایک چیز یاد رہتی ہے اور جب یہ ذکر ہوتا ہے تو یہ دراصل وطن سے محبت کا اظہار ہے۔

خس وخاشاک زمانے، مستنصر حسین تارڑ کا بہت ہی دلچسپ ناول ہے۔ اسے جب قاری پڑھنا شروع کرتا ہے تو وہ پڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور یہ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو نشستوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں دلچسپی کا سب سے بڑا عنصر دیہات اور شہروں کا ذکر ہے تارڑ اس ناول میں اپنے آبائی علاقوں پھالیہ اور گجرات کا کافی جگہ پر ذکر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا پور اور لاہور کا ذکر بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ اس ناول میں وطن سے محبت کی مختلف جہات نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ پر دنیا پور کے جاٹوں اور اُن کی زمینوں کا ذکر ہے اور ایک جگہ پر قیام پاکستان اور قائداعظم محمد علی جناح کا ذکر نظر آتا ہے اور پاکستان بن جانے کے بعد پھر جب آل انڈیا ریڈیو سے ایک نئی اور مانوس آواز کا ذکر آتا ہے۔ یعنی ''یہ آل انڈیا ریڈیو لاہور ہے'' کی جگہ پر ''یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے'' اور پھر ایک جگہ تارڑ کے آبائی علاقے کوٹ ستارہ، گجرات اور پھالیہ کا ذکر سامنے آتا ہے۔ دراصل یہ تمام جہات وطن سے محبت کا اظہار ہیں کیوں کہ اگر اپنے گاؤں، دیہات یا ملک کی بات کی جائے تو یہ وطن سے محبت کا ہی اظہار ہے کیوں کہ انسان فطری

طور پر صرف اسی چیز کو یاد کرتا ہے جس سے اُسے محبت ہوتی ہے۔

جب ہندوستان کے لوگ ''آل انڈیا ریڈیو لاہور'' سنتے تھے اُن کے کان یہ آواز سننے کے عادی تھے لیکن جب پاکستان بن جاتا ہے تو ریڈیو سے یہ آواز آتی ''یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے'' سن کر بہت متحیر اور خوش ہوتا ہے اور لوگوں کا یہ آواز سن کر خوش ہونا بھی وطن پاکستان سے محبت کا اظہار ہے۔

''اے غزال شب'' بھی تارڑ کا ناول ہے اس ناول میں بھی وطن سے محبت کی مختلف جہات نظر آتی ہیں اُن میں لکھنو اور کراچی کا ذکر ہے ایک کردار عارف نقوی کا بچپن اور جوانی کراچی اور لکھنو میں گذرے تھے اور پھر وہ دیار غیر چلا گیا تھا لیکن یہ شہر ہمیشہ اُسے یاد آتے رہتے ایک دن وہ محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر کراچی چلا گیا۔ دراصل ان شہروں سے محبت کا اظہار اپنے وطن سے محبت کا اظہار ہے اس کے علاوہ اس ناول میں ایک خاتون جو بیرون ملک میں رہتی ہے اور اپنے باپ کے گھر کو تلاش کرنے کے لیے لاہور کے کسی محلے میں گھومتی نظر آتی ہے۔ اُس خاتون کا اپنے باپ کا گھر تلاش کرنا بھی جب وطن کا مظہر ہے۔ اس ناول میں اپنے آبائی گاؤں سے محبت بھی نظر آتی ہے۔ حصول معاش کے لیے انسان کو اپنا گاؤں اور شہر چھوڑنے پڑتے ہیں لیکن وطن سے محبت کم نہیں ہوتی۔

انسان حصول معاش کے لیے کہیں بھی چلا جائے اور بہت خوش و مطمئن بھی ہو لیکن پھر بھی اُسے ہر وقت اپنے وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ یہ کردار دیار غیر میں معاشی طور پر بہت مستحکم ہوتے ہیں۔ لیکن وطن سے دوری کا احساس ان کے اندر ہر وقت موجود رہتا ہے اور اُنہیں اپنے آبائی وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ اس ناول میں تارڑ نے وطن کی بھی تعریف کی ہے کہ وطن دراصل وہ علاقہ ہے جہاں آپ پیدا ہوئے ہیں۔ جہاں پر آپ کے باپ دادا رہتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں ایک دوسر کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور آپ اُس علاقے کی خوراک اور آب و ہوا کے عادی ہو جائیں اور دیار غیر میں آپ جتنا عرصہ رہیں آپ اجنبی ہی تصور ہوں گے۔ اس کا ایک اور کردار ظہیر الدین کا ہے ظہیر الدین بورے والا کے سکول کا ذکر کرتا ہوا نظر آتا ہے جہاں پر اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ یعنی اس ناول میں بھی گھر، شہر، ملک اور اپنے ملک کے موسموں کا ذکر ملتا ہے۔ جو وطن سے محبت کی علامتیں ہیں۔

مرزا اطہر بیگ کا ناول ''صفر سے ایک'' ۲۰۰۹ میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول بھی مقبولیت کے اعتبار سے بہت

اہم ہے۔اس میں وطن سے محبت کا اظہار مختلف جہات میں نظر آتا ہے۔کہیں لاہور شہر کا ذکر ہے تو کہیں گھر اور مکان کا ذکر نظر آتا ہے جب لاہور کا ذکر ملتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ لاہور کا صرف لاہور سے ہی مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔لاہور بہت بے مثال شہر ہے اور گاؤں بھالیکی کا ذکر بھی ملتا ہے۔یہ انسان کی پیدائش کا علاقہ رہائش کا علاقہ اور اپنے شہر اور ملک کا علاقوں سے انسان کی محبت ایک فطری چیز ہے اور یہ تمام جہات اس ناول میں موجود ہیں یہ ناول اگر چہ بہت ضخیم ناول ہے لیکن اختصار کے باعث اس ناول سے چند اقتباسات ہی وطن سے محبت کے اظہار کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بیگ، مرزا اطہر، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلی کیشنز، مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۔۸۱

۲۔ ایضاً، ص۔۸۲

۳۔ ایضاً، ص۔۲۱۶

۴۔ ایضاً، ص۔۲۱۹

۵۔ ایضاً، ص۔۲۲۸

۶۔ ایضاً، ص۔۳۶۳

۷۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص۱۸

۸۔ ایضاً، ص۴۳

۹۔ ایضاً، ص۴۴

۱۰۔ ایضاً، ص۴۹

۱۱۔ ایضاً، ص۵۰

۱۲۔ ایضاً، ص۷۶

۱۳۔ ایضاً، ص۸۹

۱۴۔ ایضاً، ص۱۰۰تا۱۰۱

۱۵۔ ایضاً، ص۱۰۲تا۱۰۳

۱۶۔ ایضاً، ص۱۱۹

۱۷۔ ایضاً، ص۱۶۷تا۱۶۸

۱۸۔ شاہدنواز، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ، شعبہ اردو سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا، ۲۰۱۸ء، ص ۱۶۷

۱۹۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۔ ۵

۲۰۔ ایضاً، ص۔ ۱۹

۲۱۔ ایضاً، ص۔ ۳۳

۲۲۔ ایضاً، ص۔ ۳۵

۲۳۔ ایضاً، ص۔ ۴۲

۲۴۔ ایضاً، ص۔ ۶۰

۲۵۔ ایضاً، ص۔ ۸۸

۲۶۔ ایضاً، ص۔ ۱۷۵

۲۷۔ ایضاً، ص۔ ۱۸۰

۲۸۔ ایضاً، ص۔ ۲۱۸

۲۹۔ تارڑ، مستنصر حسین خش وخاشاک زمانے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۲۱

۳۰۔ ایضاً، ص۔ ۵۶

۳۱۔ ایضاً، ص۔ ۲۶۷

۳۲۔ ایضاً، ص۔ ۳۰۳

۳۳۔ ایضاً، ص۔ ۳۳۲

۳۴۔ ایضاً، ص۔ ۳۸۹

۳۵۔ تارڑ، مستنصر حسین، اے غزال شب، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۲۱

۳۶۔ ایضاً، ص۔ ۳۰ تا ۳۱

۳۷۔ ایضاً، ص۔ ۹۱

۳۸۔ ایضاً، ص۔ ۱۴۸

۳۹۔ ایضاً،ص۔۱۶۲

۴۰۔ ایضاً،ص۔۲۲۱

۴۱۔ ایضاً،ص۔۲۸۱

باب پنجم

ماحصل

الف۔مجموعی جائزہ:

انسان جہاں پیدا اور جوان ہوتا ہے اس گھر، علاقے، گاؤں،شہر، اور ملک سے اُس کی محبت فطری ہوتی ہے۔ یہ محبت انسان کی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔انسان فطری طور پر اپنے گھر، ماں باپ، بیوی بچوں اور رشتے داروں ،گھر، گلیوں، محلے شہر ،بازاروں ، زمینوں کھیتوں ، کھلیانوں ،درختوں ،باغات ،موسموں ،ندی نالوں ،نہروں،جھیلوں،دریاؤں، پہاڑوں،قدرتی مناظر،علاقے کی مٹی سے بھی محبت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ علاقہ کے رسم ورواج ،تہذیب وثقافت،علاقائی زبان اس کی پہچان ہوتی ہے۔حصول معاش اور پرسکون زندگی کی خاطر انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ عارضی یا مستقل ہجرت بھی کرتا ہے لیکن اپنے گھر،علاقہ شہر،گاؤں اور ملک کو کبھی بھی نہیں بھولتا ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہے۔ برصغیر پاک وہند کے لوگ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں بھی حصول معاش اور روزگار کے سلسلے میں یورپی ممالک خصوصاً برطانیہ،امریکہ،کینیڈا،اٹلی،یونان، جاپان اور سپین وغیرہ میں مقیم ہیں لیکن وہ ہمیشہ اپنے وطن کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

ہمارا مذہب اسلام بھی ہمیں وطن سے محبت کا سبق سکھاتا ہے۔ نبی پاک ﷺ نے جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپ کو بہت دُکھ اور تکلیف ہوئی تھی۔آپ ﷺ نے شہر مکہ کو مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ اے شہر مکہ مجھے تو بہت زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے باشندے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔

اس مقالے بعنوان ''پاکستانی اردو ناول میں حُب الوطنی کے عناصر (تجزیاتی مطالعہ)'' کے پہلے باب میں حُب الوطنی کے بنیادی مباحث کے ساتھ ساتھ مختلف لغات سے حُب الوطنی کے لغوی اور اصطلاحی معنی اور تعریفیں شامل کر کے حُب الوطنی کی وضاحت کی گئی ہے۔اس کے بعد ناول اور حب الوطنی کے عناصر اور اُردو ناول کی روایت کا تفصیلاً بیان ہے۔

جب پاکستان بنا تو ملک کے حالات بہت ابتر تھے۔وسائل کم اور مسائل زیادہ تھے۔مہاجرین کے لُٹے پٹے قافلے پاکستان میں آرہے تھے۔اُن کی آبادکاری بہت بڑا مسئلہ تھا۔افراتفری کا عالم تھا۔ان حالات میں لالچی اور

حریص لوگ اپنی جائیدادیں بنانے کے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ ناانصافی اور قانونی ابتری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اس کے علاوہ ۱۹۴۸ میں کشمیر میں آزادی کی جنگ بھی شروع ہو چکی تھی۔ ان حالات میں ادیبوں نے جو ادب تخلیق کیا اُس کے زیادہ تر موضوعات ہجرت اور فسادات تھے۔

نسیم حجازی کے ناول، خاک اور خون میں تحریک آزادی کشمیر کے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحریک پاکستان میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ موجود ہے۔ ہندوؤں کی ذہنیت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ وہ آزادی کے بعد اکھنڈ بھارت بنانا چاہتے تھے۔ وہ قیام پاکستان کے خلاف تھے۔ وہ مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح نے دوقومی نظریہ کے بارے میں وضاحتیں کی کہ برصغیر میں دو بڑی قومیں آباد ہیں یعنی ہندو اور مسلمان۔ تحریک پاکستان کے واقعات، ہندو مذہب کا تعصب اور قیام پاکستان کے واقعات وطن سے محبت کے اظہار کے غماز ہیں۔

خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' اردو ادب میں لازوال حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول میں ہجرت اور تحریک پاکستان کے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ممتاز مفتی کے ناول ''علی پور کا ایلی'' بہت ضخیم ناول ہے۔ اس ناول میں اپنے علاقے شہر، گلیوں اور بازاروں کا ذکر وطن سے گہری محبت کا اظہار ہے۔

رضیہ فصیح احمد نے اپنے ناول ''آبلہ پا'' میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ اور تحریک پاکستان کے واقعات تحریر کیے ہیں جو وطن سے محبت کا اظہار ہیں شوکت صدیقی کا مشہور ناول ''خدا کی بستی'' بہت مشہور ناول ہے۔ یہ ناول پی ٹی وی پر ڈرامائی انداز میں پیش ہوتا رہا۔ اس ناول میں قیام پاکستان کے حالات و واقعات مہاجرین کی کسمپرسی اور برصغیر کی سیاسی و معاشرتی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایم اسلم کے ناول ''خون مسلم'' میں ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی سے لے کر ۱۹۴۷ تک کے واقعات پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایم اسلم نے اپنے دوسرے ناول رقصِ ابلیس میں قیام پاکستان کے وقت ہندوؤں اور سکھوں کے مسلمانوں پر مظالم کی داستان رقم کی ہے۔ اور مسلمانوں کا پاکستان کی محبت میں تمام مظالم کا مردانہ وار مقابلہ حب الوطنی کی مثال ہے۔

خدیجہ مستور کا ایک اہم ناول ''زمین'' بھی ہے۔ اس ناول میں تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے بعد کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' میں اپنے علاقے، گاؤں، شہر اور ملک سے محبت کے

جذبات نظر آتے ہیں۔ رحیم گل کے ناول ''جنت کی تلاش میں مظفر آباد، مانسہرہ اور ایبٹ آباد کا ذکر وطن سے محبت کے اظہار کی علامت ہے۔ الطاف فاطمہ کا ناول ''چلتا مسافر'' سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اسی ناول میں سانحہ مشرقی پاکستان کے واقعات اور مشرقی پاکستان کے لوگوں کی مغربی پاکستان سے محبت کے جذبات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شوکت صدیقی کے ناول ''جانگلوس'' بھی حب الوطنی کی بہترین مثالیں ہیں۔

'نادار لوگ'' بھی عبداللہ حسین کا نمایاں ناول ہے۔ اس میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے لوگوں کی یادوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ناول ''صدیوں کی زنجیر'' میں قیام پاکستان کے بعد کے حالات و واقعات اور قائداعظم کی وفات کے بارے لکھا گیا ہے۔ طارق اسماعیل ساگر کے ناول ''وادی لہورنگ'' میں آزادی کشمیر کی جنگ کے واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح مجاہدین کشمیر نے آزادی کی جنگ لڑی اور کچھ علاقہ آزاد کرایا۔ اگر کشمیری مجاہدین اس وقت ہمت نہ کرتے تو آج پورا کشمیر انڈیا کے قبضے میں ہوتا۔ صدیق سالک کے ناول ''پریشر ککر''، میں مہاجرین کی آبادکاری اور پھر استحکام پاکستان میں فطرت کے کردار پر بحث کی گئی ہے۔ فطرت نے قائداعظم محمد علی جناح کا پورٹریٹ بھی بنایا تھا۔ یہ تمام واقعات وطن سے محبت کا اظہار ہیں۔

منتخب ناولوں میں وطن سے محبت کے اظہار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس دور کا پہلا اہم ناول بانو قدسیہ کا ''حاصل گھاٹ'' ہے۔ اس ناول میں بھی آزادی کے بعد کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس ناول کا انتساب بھی مہاجرین کے نام ہے۔ ناول میں مہاجرین کے اپنے پرانے گھروں کی یاد نئے گھروں کے مسائل، زمینوں اور جائیداد کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حصول معاش کے لیے دیار غیر میں جانا اور پھر اپنے لاہور کے گھروں کو یاد کرنا شامل ہے۔ مجموعی طور پر اس ناول میں مہاجرین کا ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنا اور پھر پاکستان سے یورپی ممالک میں جانا اور ہندوستان سے پاکستان آنے کے مسائل اور پھر پاکستان سے بہتر حصول معاش کے لیے یورپی ممالک میں جانا اور وہاں کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اپنا وطن، اپنا ہی ہوتا ہے۔ دیار غیر میں انسان چاہے کتنا ہی خوشحال ہو اُسے اپنے وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا اہم ناول ''صفر سے ایک تک'' ہے۔ اس ناول میں بھی اپنے ملک پاکستان اور پھر پاکستان کے دل لاہور کا ذکر نظر آتا ہے۔ لاہور شہر کی خوبصورتی اور رنگارنگی کو بیان کیا گیا ہے اس کے علاوہ اس ناول میں گاؤں

کا ذکر بھی ملتا ہے۔ لاہور شہر کا ذکر اور گاؤں کا ذکر وطن پاکستان سے محبت کا اظہار ہے۔

تحریک پاکستان کی منظر نگاری کے سلسلے میں مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''خس و خاشاک زمانے'' بڑا ہی اہم ناول ہے۔ اس ناول میں میں تحریک پاکستان کے آخری واقعات اور پھر دیہات اور زمینوں کا ذکر نظر آتا ہے۔ دیہات اور زمینوں کا ذکر وطن سے محبت کی جہات ہیں۔ ''اے غزال شب'' بھی تارڑ کا لکھا ہوا ناول ہے۔ اس ناول میں بھی شہروں اور دیہات سے محبت کے واقعات سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ناول میں تارڑ نے وطن کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ آپ کا اصل وطن وہ ہے جہاں آپ کے باپ دادا رہتے تھے اور لوگ آپ کو پہچانتے ہوں اور آپ آب و ہوا اور ثقافت کے عادی ہو جائیں انسان جتنا عرصہ بھی دیار غیر میں رہے وہ وہاں اجنبی ہی رہتا ہے اور اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے۔ اپنے دیہات، شہروں، موسموں اور رسم و رواج کا ذکر حب الوطنی کے زمرے میں آتا ہے۔

مجموعی طور پر پاکستانی اُردو ناولوں میں ہجرت کے واقعات، مہاجرین کے معاشرتی و معاشی اور سماجی مسائل پر بحث کے علاوہ، اپنے گھر، زمینوں، گلیوں، محلوں، گاؤں، شہر، موسموں، فصلوں، زبان، تہذیب و تمدن، ثقافت، محلّہ داروں، عزیز، دوست، رشتہ داروں، رسم و رواج، بیاہ شادی، میلے ٹھیلے، کھیتوں، کھلیانوں، مکانوں، سڑکوں، سکولوں، کالجوں، ہسپتالوں، ذرائع آمد و رفت، مال مویشی، ملکی اور مذہبی اقدار یہ تمام جہات حب الوطنی کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان جہات کی روشنی میں پاکستانی اردو ناول میں حب الوطنی کے عناصر کا مجموعی تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستانی اُردو ناول حب الوطنی کا خزینہ سمیٹے ہوئے ہیں جو جغرافیائی، مذہبی، تہذیبی، ثقافتی اور علاقائی رنگوں سے مزین ہے۔ اس سے وطن کی ترجیحات مختلف ہوتی جاتی ہیں۔ ایک تھا جب برصغیر پاک و ہند سب ہندوستان والوں کا مشترک وطن تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد، ہندوستانی، پاکستانی، کشمیری اور بنگالی کا اپنا اپنا وطن بن جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مجموعی وطن کی تقسیم یا تحدید ہو جاتی ہے۔ پاکستانی اردو ناولوں میں دیگر سرزمینوں اور اوطان کے تذکرے بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر ایک بات واضح ہے کہ پاکستانی اردو ناول میں حُب الوطنی کے عناصر کی اس متغیر موسم میں بھی واضح شناخت دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان سے محبت کا اظہار، پاکستان کی املاک، افواج، سرحدوں کی حفاظت اور پاکستانی قوانیں کے پاسداری کا نام ہے۔ اس کے علاوہ

پاکستان کے عوام، گھر، گلی محلوں، شہروں، موسموں، رسم ورواج، تہذب وثقافت، کو پروان چڑھنا، اور غیر ملک میں رہتے ہوئے ان سب کی پاسداری کرنا حب الوطنی کے عناصر میں آتا ہے۔اس مقالہ میں شامل تمام ناولوں میں پاکستان سے محبت کے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں۔

ب۔تحقیقی نتائج:

پاکستانی اردو ناول میں حُب الوطنی کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ متعدد نتائج کا حامل ہے۔

۱۔ پاکستانی اردو ناولوں میں حب الوطنی کا اظہار کرداروں، مکالموں، رویوں اور حالات وواقعات سے کیا گیا ہے۔

۲۔ اپنے گھر، زمنیوں، گلیوں، محلوں، گاؤں، شہر، موسموں، فصلوں، زبان، تہذیب وتمدن، ثقافت، محلّہ داروں، عزیز، دوست، رشتہ داروں، رسم و رواج، بیاہ شادی، میلے ٹھیلے، کھیتوں، کھلیانوں، مکانوں، سڑکوں، سکولوں، کالجوں، ہسپتالوں، ذرائع آمدورفت، مال مویشی، ملکی اور مذہبی اقدار یہ تمام جہات حب الوطنی کے زمرے میں آتے ہیں۔

۳۔ تمام دنیا میں حب الوطنی اور علاقائیت ارتقاء پذیر ہے اور مسلسل رابطہ کاری کے باعث اس میں تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں اور دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ان تبدیلیوں کا اثر ناول پر بھی نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود بھی حب الوطنی مفقود نہیں ہوئی۔

ج۔سفارشات:

اس تحقیق کے نتیجے میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ حب الوطنی کے عناصر کے تجزیے کے لیے مختلف زبانوں اور علاقوں کی اصناف ادب کے تراجم کے مشاہدات پر مبنی تحقیقات کی ضرورت ہے۔

۲۔ حب الوطنی کے تشکیلی عناصر مذہب، ثقافت، تہذیب اور معاشرت کا الگ الگ تحقیقی جائزہ لینے اور قومی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانے کی سفارش کی جاتی ہے۔

۳۔ افسانوی ادب سے حب الوطنی کے عناصر پر تحقیقی کام کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

کتابیات

الف۔ بنیادی مآخذ:

الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، جمہوری پبلی کیشنز ایوان تجارت روڈ لاہور، ۲۰۱۶ء

ایم اسلم، خون مسلم، دارالبلاغ، لاہور، ۱۹۶۹ء

ایم، اسلم، رقص ابلیس، القمر انٹر پرائزز، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور، س ن

بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء

بستی، انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۹ء

بیگ، مرزا اطہر، صفر سے ایک تک، سانجھ پبلی کیشنز، مزنگ روڈ لاہور ۲۰۱۶ء

پریم چند، گئو دان، دہلی مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۲ء۔

پریم چند، میدانِ عمل، دہلی مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۲ء۔

تارڑ، مستنصر حسین، اے غزال شب، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء

تارڑ، مستنصر حسین، خس وخاشاک زمانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

جمیلہ ہاشمی، تلاشِ بہاراں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۳ء

خدیجہ مستور، آنگن، سنگ پبلی میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۲ء

خدیجہ مستور، زمین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴

رحیم گل، جنت کی تلاش، رابعہ بک ہاؤس، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء

رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۵ء

رضیہ فصیح احمد، آبلہ پا، مقبول اکیڈمی، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی لاہور۔ ۱۹۶۴ء

ساگر، طارق اسماعیل، وادی لہورنگ، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ ۴۰ اردو بازار لاہور، ۱۹۸۴ء

شوکت صدیقی، جانگلوس، رکتاب پبلی کیشنز گلستان جوہر، کراچی، جولائی ۲۰۱۳ء

شوکت صدیقی، خدا کی بستی، رکتاب پبلی کیشنز ۴۸، جبل رحمت ٹاور گلستان جوہر، کراچی، ۲۰۱۴ء
صدیق سالک، پریشر کُکر، الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۳ء
عبداللہ حسین، باگھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء
عبداللہ حسین، نادار لوگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
ممتاز مفتی، علی پور کا ایلی، لاہور، الفیصل ناشران، ۲۰۱۰ء۔
ممتاز مفتی، علی پور کا ایلی، الفیصل ناشران وتاجران کتب، غزنوی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۶۱ء
نسیم حجازی، خاک اور خون، جہانگیر بکس، لاہور، ۲۰۱۶ء

ب۔ ثانوی مآخذ:

i۔ کتب

آئین ٹالبوٹ، مترجم طاہر منصور فاروقی، تخلیقات علی پلازہ، ۳ مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء
اسلم آزاد، ڈاکٹر، فقیر حسین، ڈاکٹر، اردو ناول کا ارتقا، بک ٹاک، سیال چیمبرز، ۳ ٹیپمل روڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء
انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶ء
تبسم کاشمیری (مرتبہ) اقبال تصور قومیت اور پاکستان مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء
جاوید اختر، ڈاکٹر، اُردو کی ناول نگار خواتین، لاہور، سنگِ پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔
حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر، اُردو ادب بیسویں صدی میں، کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ ۱۹۸۸ء۔
خورشید انور، قراۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور، نئی دہلی انجمن ترقی اُردو ہند، ۱۹۹۳ء۔
سٹالن قوم اور قومیت، مکتبہ فکر و دانش، رائل پارک لاہور، ناشر محمد الیاس، س ن
عزیز احمد، ترقی پسند ادب، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء۔
عقیل احمد، اُردو ناول اور تقسیم، دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۷ء۔
فاروق عثمان، ڈاکٹر، اُردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۳ء۔
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۲ء۔

قرآن مجید، سورہ، المائدہ۔
محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء
محمد اکرم چغتائی، مضامین سرسید، سنگ میل پبلی کیشن لاہور، ۲۰۰۸
محمد علی، چودھری، مترجم، بشیر احمد ارشد، ظہور پاکستان مکتبہ کارواں، کچہری روڈ، لاہور، س ن
محمد عارف، پروفیسر ڈاکٹر، اُردو ناول اور آزادی کے تصورات، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۱ء
محمد ذاکر، ڈاکٹر، آزادی کے بعد ہندوستان کا ادب، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۱ء۔
مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول ہیئت، اسالیت اور رجحانات، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۷ء۔
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے چند اہم زاویے، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۳ء۔
نیلم فرزانہ، اُردو ادب کی خواتین ناول نگار، لاہور فکشن ہاؤس، ۱۹۹۲ء
وقار اعظیم، پروفیسر، داستان سے افسانے تک، اُردو مرکز، لاہور۔ س ن

ii۔فرہنگ/لغات

آکسفورڈ اُردو انگریزی لغت آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳
احمد شوقی، مشمولہ، حدیقۃ الادب، الجزالثانی، انٹرمیڈیٹ پنجاب ٹیکسٹ بک روڈ، لاہور، ۲۰۱۴ء
ارشاد احمد، اردو پنجابی لغت، مرکزی اردو بورڈ، گلبرک، لاہور، ۱۹۷۴ء
الحاج مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات اردو جامع، فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، راولپنڈی، کراچی، ۱۹۹۴ء
سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد دوم، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ اردو بازار، لاہور، س ن
عبدالحمید نظامی، لغاتِ نظامی، گلوب پبلشرز اُردو بازار لاہور، س ن
عصمت ابوسلیم، عربی لغت، مترجم المنجد، مکتبہ دانیال، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، س ن
کاشانی حداد، شرارہ عشق، مکتبہ الذاکرین اہل بیت شابک (ع) ۱۳۷۷ء
مولوی نورالحسن نیر، نوراللغات، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹ سرکلر روڈ، لاہور، س ن

iii۔رسائل وجرائد:

آغا سہیل ڈاکٹر، پاکستانی ادب اور قومی تشخص، مشمولہ سرسیدین، پاکستانی ادب وتنقید، راولپنڈی، مجلّہ فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، ۱۹۹۲ء

iv۔انگریزی کتب:

English to English and urdu Dictionary , Feraz Sons PVT Ltd Lahore P. 629

The Americian Heritage Disctionary of English Langvage Fifth Edition , Harcount Publishing Company

JM and Mojokohen , the Penguin Dictionary of Quotations Penguin group 27 wrights lane W8 Stz 1960

v۔ویب گاہیں (انٹرنیٹ ذرائع):

https://www.merriam-webster.com/dictionary/nation

https://www.merriam-webster.com/dictionary/national۔

https://en.wikipedia.org